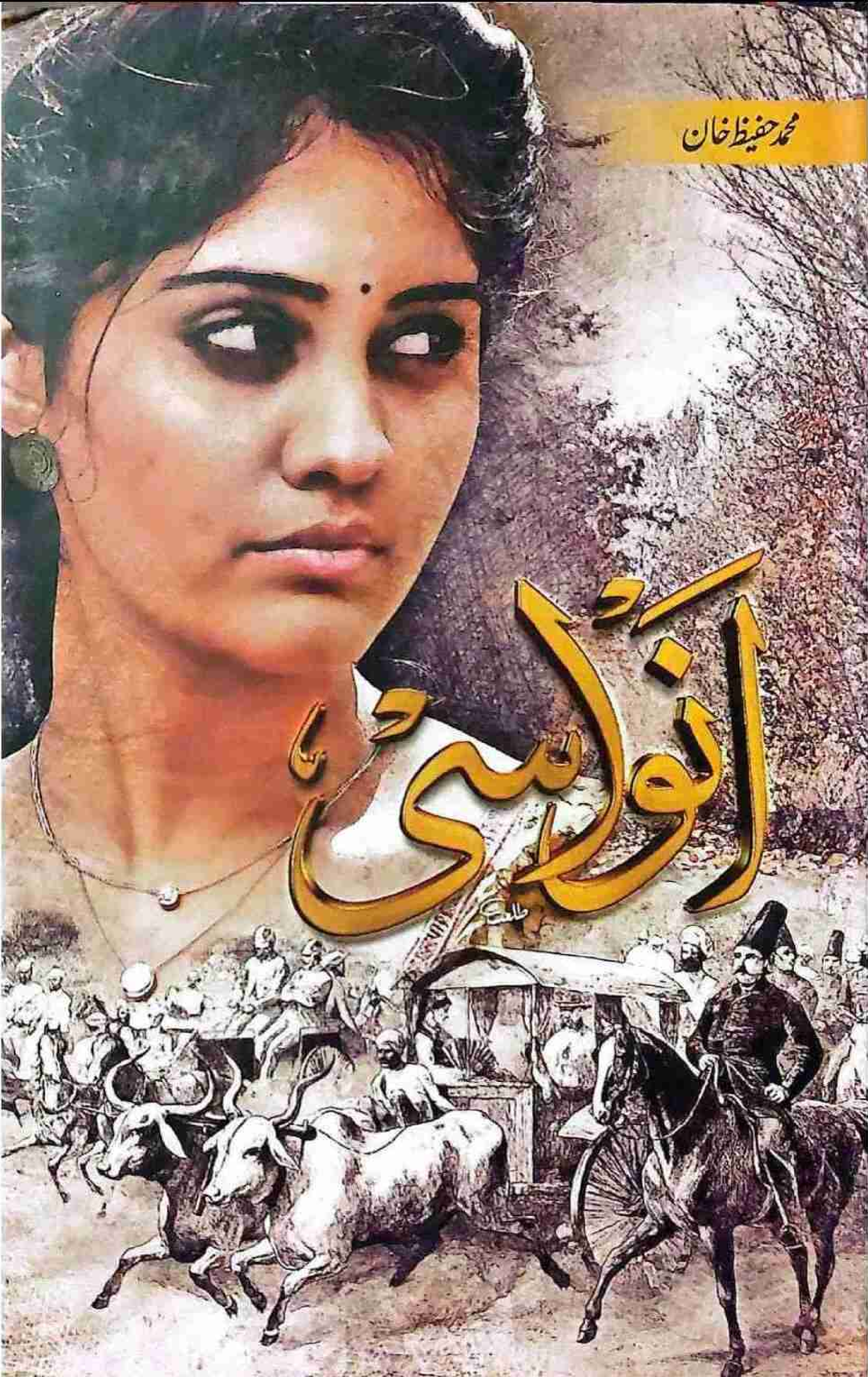
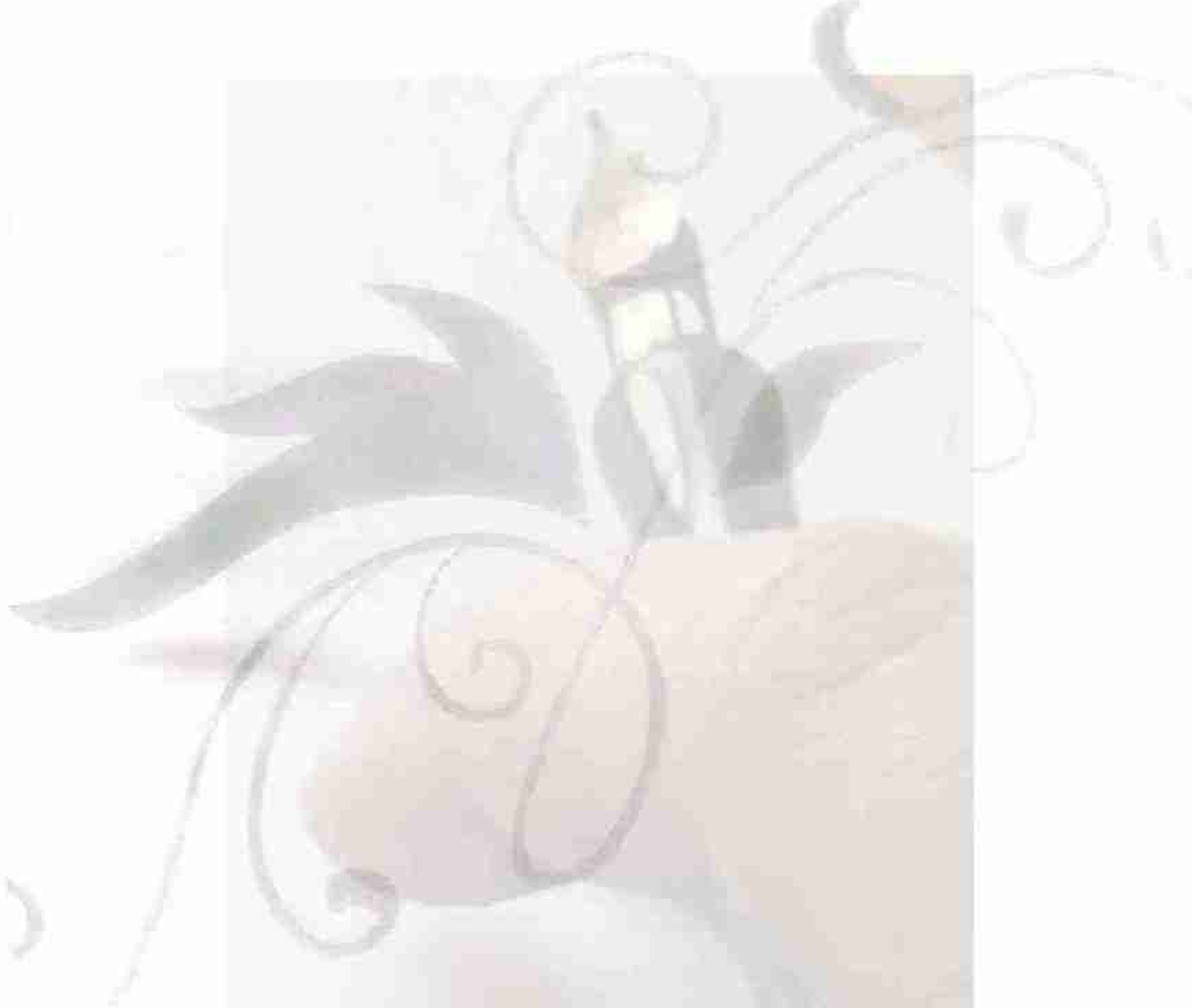

محمد حفیظ خان
انواسی



# اَنُواسی





اُنواسی پڑھ لیا
اب میں کیا کروں بھائی ؟
کیا مطالعہ کروں
کوئی کتاب من کو ہی نہیں لگ رہی

محمد حامد سراج

# انواسی



ناول

محمد حفیظ خان

بک کارنر
جہلم۔ پاکستان

Anwasi
by Muhammad Hafeez Khan
Jhelum: Book Corner, 2019
360p.
1. Novel - Urdu Literature
ISBN: 978-969-662-221-5



ناشر گگن شاہد • امر شاہد

اشاعتِ اوّل: جون ۲۰۱۹ء

اشاعتِ دوم: دسمبر ۲۰۱۹ء

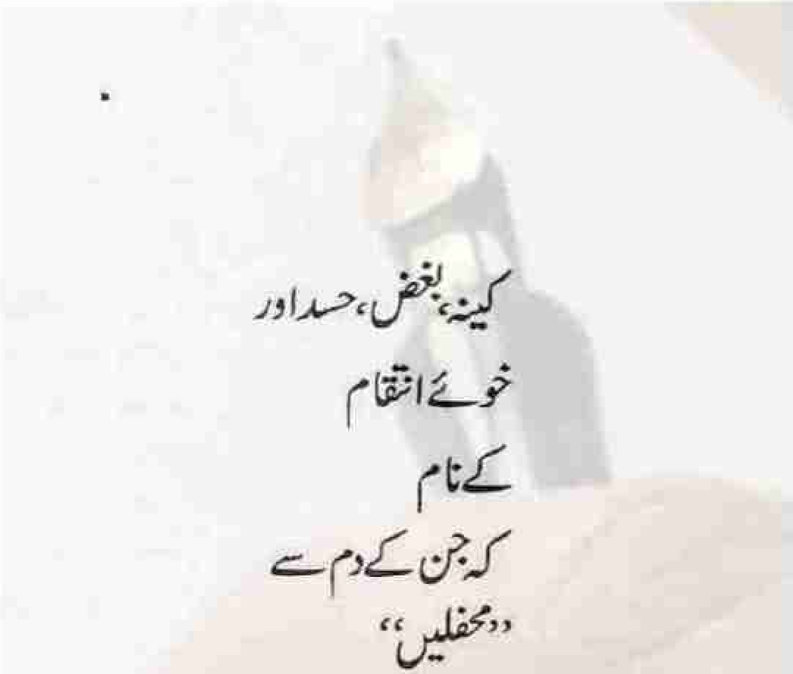
ناول: اَنواسی

ناول نگار: محمد حفیظ خان (تمغۂ امتیاز)

سرورق: محمد شکیل طلعت

مطبع: فائن پرنٹرز، لاہور

Sale Center:
Book Corner Showroom
Opposite Iqbal Library, Book Street, Jhelum, Pakistan
00 92 544 278051 00 92 314 4440882
bookcornershowroom bookcornerjhelum
info@bookcorner.com.pk www.bookcorner.com.pk



کینہ، بغض، حسد اور

خوئے انتقام

کے نام

کہ جن کے دم سے

"محفلیں"

رو بہ ہنگام ہیں

*Hafeez Khan's novel " Anwasi" is an important milestone in the history of Urdu novel writing. South Punjab is the locale of this novel and the time frame is from 1872 to 1875. The novel is captivating and records the history of very important time when the British raj was at its pinnacle and the railway track was being laid in a small Saraiki village at the bank of river Satluj. The novel is thought provoking and addresses many delicate issues if our culture and psyche.*

*(Dr. Waheed Ahmed)*

قد آدم کھڑکی ہے میرے کتابوں کے کمرے کی جس میں سے ہوا، زندگی، روشنی، سبزہ، سُرخ پھولوں والا گھنا درخت اور پرندوں کی آوازیں ساتھ ہیں۔ میلہ لگا ہے۔ دو تکیے صوفے پر ڈال لیے ہیں۔ مکمل سکون ہے اور محمد حفیظ خان کا ناول ''اَنواسی'' ہے....

انواسی کون ہے؟ انواسی ایک ایسی عورت ہے جو وقت کے ہاتھوں کچلے جانے کے باوجود اپنی بقا کی جنگ اپنے کسے ہوئے کمان بدن، منتشم دل و دماغ اور رُوح کی سفاکانہ چالوں سے لڑتی رہی۔ یہ ایک ناول نہیں ہے یہ ایک غیر معمولی ناول جو ہر عہد میں اپنا قاری تلاش کر لے گا۔ سنگری نام ہے مرکزی کردار کا اور یہی انواسی ہے۔ وقت کا جبر ہے۔ لگتا تھا سیدا اپنا کردار ادا کرے گا لیکن وہ محب وطن انگریز سرکار سے برسرپیکار رہا۔ اسی بھگدڑ اور بے چین الجھی پھنسی زندگی میں ایک رات اس نے سنگری کا بدن تار و تار کر دیا اس میں بھی قصور سنگری کی ہٹ دھرم اور ضدی مزاج کے نام جاتا ہے۔ ایک کردار منگر کا ہے، لگتا ہے وہ زمانے کا ٹھکرایا ہوا ہے اور سنگری نے بھی اسے جوتی کی نوک پر رکھا اور اسی سنگری نے ایک بااثر ڈیل ڈول موٹی توند والے امام مسجد مولوی پر اپنے کمان بدن سے ایسا تیر مارا کہ وہ مرغِ بسمل کی طرح اس کی رانوں کے درمیان پھڑکنے لگا اور چوبیس گھنٹے میں اس سے شادی رچائی کیونکہ سیدے کے بیج نے اس کی کوکھ ہری کر دی جسے ہر حال میں چھپانا تھا....

یہ اس دَور کی کتھا ہے جب برصغیر میں انگریز نے زمین پر لوہا بچھانا شروع کیا جس پر کالے سٹیم انجن نے پورے خطے میں لوہے کے ڈبے کھینچ کر اسلحہ بارود اور سامان جلد سے جلد یہاں سے وہاں پہنچانا تھا.... توہمات کا عہد تھا....
جان برنٹن ایک چیف انجینئر ہے اس نے ریلوے لائین جہاں سے گزارنا تھی راستے میں ایک قدیمی قبرستان تھا جہاں سے ریلوے لائن گزرنا تھا۔ بستی والے دیوار بن گئے کہ ہم اپنے پرکھوں کی قبروں کا دفاع کریں گے۔ ناول نگار نے اس اکھڑ پیچ جنگ کو اس طرح پینٹ کیا ہے گویا کیمرے سے عکس لیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز افسران کی باہمی مناقشت ایک دوسرے کو کچل کر اگلی سیڑھی چڑھنے میں زور آزمائی زوروں پر ہے۔ جان برنٹن کا سوتیلا بیٹا اعلیٰ افسر سے مل کر اس کے خلاف چالیں چلتا رہا۔ اس مسابقت کی دوڑ میں جونیر سٹاف سے ایک خوبصورت عورت کا جال جان برنٹن پر پھینکا گیا جس نے اپنے ریشم ایسے بدن میں جان برنٹن کو لپیٹ کر بے بس کر دیا۔ وہ ریشم کی دلدل میں اترتا چلا گیا.... الزامات کئی نوعیت کے گھڑ لیے گئے اور اسے نوکری سے برخواست کر دیا گیا.... انگریزوں نے مقامی لوگوں اور علمائے سو سے مل کر قبرستان برابر کر دیا اور ریلوے لائن گزار دی....

ابھی کہانی ندی کی طرح بہہ رہی ہے۔ مولوی کے گھرانے پر کیا گزری؟ سنگری کہاں گئی....؟ منگر کہاں گیا؟ یہ سربستہ راز ہیں جن کی کھوج میں آپ کو ''اَنواسی'' پڑھنا ہے اور اُردو ادب کے عظیم ناول سے لطف اندوز ہونا ہے۔ محمد حفیظ خان نے ''اَنواسی'' ایسا شاندار ناول لکھا ہے جو کسی ایک صدی میں قید نہیں آنے والے وقتوں میں بھی اس کی گونج سنائی دیتی رہے گی۔ آپ نے یہ عظیم الشان ناول نہیں پڑھا تو کیا پڑھا.... کتاب انسان کے لیے ایک روشن زندگی ہے۔ کتاب سے پیار کیا کیجئے۔ کتابیں بے وفا نہیں ہوتیں.... انواسی بہ خیر!

محمد حامد سراج

(چشمہ بیراج ضلع میانوالی)

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، ستلج کو ایسا ہی دیکھا۔ کسی ودھوا کی سیندور سے عاری اجڑی مانگ سا۔ کسی حق بخشوائی گئی ان چھوئی عورت کے دل کی طرح ویران جھلستا کلستا زندگی کے لمس سے قطعی نا آشنا۔ دامن میں حدِ نگاہ تک پھیلی بوند بوند کو ترستی ریت سمیٹے۔ میں آج تک ستلج کی اس ویرانی کو سندھ طاس معاہدے کا شاخسانہ ہی سمجھتی آئی۔ جس نے اس بدقسمت دریا کے حسن و شباب، سندرتا، کوملتا کو خوب رگیدا اور اسے اس کے باکرہ پن سے محروم کر کے "اَنواسی ستلج" بنا دیا۔ لیکن بھلا ہو حفیظ خان کا، جنھوں نے "اَنواسی" جیسا باکمال ناول لکھ کر یہ گرہ کشائی کی۔ "اَنواسی" داستان ہے اسی ستلج کی ریتلی دبیز تہوں میں گم ہوئے نوآبادیاتی جبر اور استحصال کے مدفن کی کھدائی کی۔ انیسویں صدی کے آخری نصف کی جب انگریز اپنا ریلوے نظام لے کر برصغیر پہنچے اور کراچی سے لاہور تک ریلوے ٹریک بچھاتے ہوئے بہاول پور کے دریائے ستلج پر ایمپریس پل بنانے کے لیے اس دریا کی باکرہ کوکھ چیر کر لوہے کے ستون گاڑنے اور برطانوی استعمار کے ہاتھوں مقامیت برباد ہونے کا آغاز ہوا۔ ناول کی مرکزی کردار سنگری اور دریائے ستلج، دونوں کے اَنواسی پن اور ویرانی کا آغاز بھی اسی وقت ہوا جب اس کے کنارے آباد مقامی آبادی کے قدیم قبرستان کو مسمار کر کے مدت مدید سے وہاں مدفون بزرگوں اور شہدا کی گلی چکی ہڈیوں کو نکالا گیا۔ درویشوں نے اجتماعی گریہ زاری کی اور آسمان کی جانب شہادت کی انگلی اٹھا کر بددعا دی:

> "برباد ہووے ستلج کہ جس پر لوہا ڈالنے کے لیے شہدا کا مدفن اجاڑا گیا۔ برباد ہووے ستلج کہ تیرے سبب بے گناہوں کا خون تیری گزرگاہ میں بہا۔ برباد ہووے ستلج اس طرح کہ تو خلقت کے واسطے عذاب ثابت ہو۔ رفتہ رفتہ تیری رگوں میں بھی موت اترے، تو بھی بے آب وگیاہ ہو، تجھ میں کبھی ماس مچھی پیدا نہ ہو، تجھ پر کبھی پرندے نہ اتریں اور تو ہمیشہ زندگی کے لمس کو بھی ترسے۔"

حفیظ خان، فطرت و نفسیات اور بالخصوص نسوانی نفسیات کے گوڑھے رمز شناس۔ جوان پہلوؤں کا بھی درک رکھتے ہیں جہاں تک شاید اس کے اپنے شعور کی رسائی بھی نہ ہو۔ "ادھ ادھورے لوگ" کی تلسی، رادھی، سلمٰی اور اب انواسی کی سنگری اس کا بین ثبوت ہیں۔

"اَنواسی"، سیدا، سنگری، منگر، ایما اور جان برنٹن جیسے خوب صورت فرضی کرداروں کے ذریعے حقیقی تاریخی تناظر میں لکھے اس ناول کو روانی بیان عمدہ اسلوب اور دل چسپ کہانی کے باعث میں نے حسب عادت ایک نشست میں ہی پڑھا۔ اس دل انگیز تحریر کے متعلق اگرچہ بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جاتا رہے گا لیکن میری محدود فکر اس ریاست، اس کے عوام اور اس کے دریا کی ویرانی دیکھ کر مصنف کے کیے ہوئے اسی سوال پر آ کر رک گئی ہے کہ کیا واقعی اس دریا، اس کی گزرگاہ اور اس علاقے کو ہمیشہ سے مظالم اور بددعاؤں کا سامنا ہے؟

ڈاکٹر عصمت درّانی

(شعبہ فارسی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور)

دو تین دن پہلے کی بات ہے کہ فیس بک دیکھا، ایک پوسٹ نظر سے گزری:

تہلکہ مچا دینے والا اُردو ناول، اب محدود تعداد میں

ANWASI by Hafeez Khan. This week's bestseller.

اسی پوسٹ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جون ۲۰۱۹ء میں منظرِ عام پر آنے والے اس نئے ناول نے اس قدر شہرت حاصل کر لی ہے کہ ایک ہی ہفتے کے مختصر سے عرصے میں اس کی پہلی اشاعت کی ۹۰ فی صد سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ یہ پڑھ کر مزید حیرت ہوئی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں مصنف کو نہیں جانتی تھی۔ مصنف سے میرا تعارف ان کے ایک اور ناول ''ادھ ادھورے لوگ'' سے ہو چکا تھا اور میں ان کی ادبی حیثیت اور اُس ناول کی پذیرائی سے بھی واقف تھی۔ پھر بھی سوچنے لگی، ''صرف ایک ہفتہ اور اشاعتِ اوّل تقریباً ختم؟؟ ایسا کیسے اور کیوں کر ہوا؟''

اسی تجسس کے ہاتھوں مزید پوسٹیں دیکھیں تو ایک اور پوسٹ پر نظر پڑی، جو غالباً مصنف یا پبلشر کی طرف سے تحریر کردہ ناول کا تعارف تھا اور کچھ یوں تھا:

> ''انیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں انگریز اپنا ریلوے کا نظام لے کر برصغیر پہنچے اور کراچی سے لاہور تک ریلوے ٹریک بچھاتے ہوئے جب بہاول پور کے نزدیک دریائے ستلج پر ایمپریس برج بنانے لگے تو اس کہانی کا آغاز ہوا۔ برطانوی استعمار نے جب مقامیت کو برباد کیا تو اس کے پردے سے سنگری جیسے کئی کردار معصوم عورت سے ''اَنواسی'' ہو گئے۔''
>
> ناول پڑھنے کا اشتیاق اور بڑھ گیا اور جب پڑھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ ایسا کیسے اور کیوں کر ہوا؟

''اَنواسی'' درحقیقت محمد حفیظ خان کا ایک نوتصنیف ناول ہے۔ اگرچہ ناول نگار نے یہ ناول پانچ سے چھے ماہ کی انتہائی کم مدت میں تحریر کیا ہے۔ لیکن اس کے ذریعے انہوں نے تاریخ کے جس اہم باب تک رسائی دی ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔ انہوں نے فرضی کرداروں کی معاونت سے ۱۸۷۲ء اور مابعد کے حقیقی منظرنامے سے وہ دبیز تہیں ہٹانے کی سعی کی ہے، جس کے نیچے پوشیدہ واقعات سے یقیناً بہت کم لوگ واقف ہوں گے کیوں کہ تاریخ ایسے سینکڑوں واقعات کو نوآبادیاتی جبر تلے دفن کر چکی ہے۔ لیکن مصنف نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اس حقیقی تناظر کے بیان پر قلم اٹھایا ہے بل کہ اسے کہانی کے تانے بانے کے ساتھ اس طرح ملا جلا کر پیش کیا ہے کہ کہانی کی سحرانگیزی سے سچائی کی تلخی اور تاریخ کی خشکی اگر پوری طرح ختم نہیں تو کسی قدر کم ضرور ہو گئی ہے۔

حقیقت کے بیان کے علاوہ بھی اس ناول میں کئی ایسے موضوعات ہیں، جو لائقِ توجہ ہیں، مثلاً طاقتوں اور مناصب کا بے جا استعمال، مذہبی منافرت، مشرق اور مغرب یا ان کے نمائندوں میں یکسانیت کے پہلو، مقاصد کی تکمیل کی خواہشات اور ان خواہشات کی حسرت میں تبدیلی، عروج سے زوال اور زوال سے عروج تک کا سفر، سیاست اور بغاوت، محبت اور نفرت، توہم پرستی، انسانی نفسیات کی لحہ بہ لحہ بدلتی نئی تعبیریں، کینہ، بغض، عداوت، انتقام اور اس کے علاوہ بھی اور

بہت کچھ۔ لیکن ان تمام موضوعات کے بیان میں جو امر سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ مصنف کا قدرے غیر متعصبانہ رویہ ہے۔ چوں کہ مصنف بہ اعتبارِ پیشہ منصف ہیں اس لیے اپنی تحریروں میں بھی وہ اسی کے قائل دکھائی دیتے ہیں کہ ان کا قلم اگر ایک طرف محکوم قوم کے افراد کے پردے میں اپنے لوگوں کی خامیوں، کوتاہیوں اور کمیوں پر شاکی ہے تو دوسری طرف غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے حاکمِ وقت (انگریزوں) کی فہم و فراست اور یا مختلف معاملات میں ان کے مہذب ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے بخل سے کام نہیں لیتا اور یہ یقیناً بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اکثر ایسے حالات میں 'اپنوں' کا دفاع کر کے تمام تر ذمے داری دوسرے فریق پر ڈال دی جاتی ہے۔

جہاں تک کرداروں کا سوال ہے تو محمد حفیظ خان کا ایک مرد لکھاری ہونے کے باوصف سنگری کی صورت میں ایک مرکزی نسوانی کردار کو ناول کے باقی تمام کرداروں پر حاوی و غالب دکھانا، اگرچہ ایک نیا یا اچھوتا تو نہیں لیکن ایک جرأت مندانہ فعل ہونے کے ساتھ ساتھ اس لیے بھی لائقِ توجہ ہے کہ یہ کردار اپنے مکالموں اور طور طریقوں کے ذریعے عورت کی نفسیات کے جن مختلف پہلوؤں کو بیان کرتا چلا جاتا ہے، ان سے ناول کے واقعات و حالات کی بہتر تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ جب کہ مردانہ کرداروں میں سیدے جیسے مضبوط اور روایتی کردار کے ساتھ ساتھ انجینئر جان برنٹن کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جو نہ صرف ایک حقیقی تاریخی کردار ہے بل کہ ناول میں ''قوتِ ارادی'' اور اس کی کرشمہ سازیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کردار کے ذریعے ایک شکست خوردہ آدمی کے ناساعد حالات سے مقابلے اور اپنے (انسانی) حقوق کے حصول کے لیے لامتناہی جدوجہد کا درس بھی دیا گیا ہے۔ مغربی کرداروں کے حالات و واقعات سے مشرقی کرداروں کی مماثلت بھی ناول میں دل چسپی اور ربط پیدا کرنے کا سبب بننے کے علاوہ دونوں معاشروں میں پائی جانے والی 'اعلیٰ انسانی قدروں' کی موجودگی کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ ناول میں قدم قدم پر ایک ہی ہیروئن کے مقابل اس کے 'ہیرو' کی مسلسل تبدیلی اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایک مردانہ کردار کو منظر سے یک سر غائب کر کے دوسرے مردانہ کردار کو پہلے کردار سے زیادہ نمایاں اور موثر بنا کر پیش کرنا بھی دل چسپی کا حامل ہونے کے علاوہ قدرے مشکل امر ہے، جسے ممکن بنانے میں ناول کے مکالموں کی برجستہ اور برمحل زبان کے علاوہ مقامی اور سرائیکی الفاظ کے قابلِ فہم استعمال نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ مزید برآں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ ناول کے تخلیقی تقاضوں کے پیشِ نظر اس میں فرضی کرداروں کی تعداد زیادہ ہے اور ناول نگار نے بھی کتاب کے آغاز ہی میں اسے فرضی کرداروں کے ذریعے حقیقی تناظر میں لکھا گیا ناول قرار دیا ہے، لیکن اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو تمام فرضی کردار ایک سچے منظر نامے کے ساتھ اس قدر گتھم گتھا ہو چکے ہیں کہ اپنے تعامل سے حقیقی کرداروں سے کہیں زیادہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ محمد حفیظ خان کا یہ ناول برصغیر کی تاریخ کے ایک انتہائی اہم، لیکن نظروں سے اوجھل باب کی روداد ہے۔ ایسے افراد، جو ادب کو محض وقت گزاری یا تفریح کے حصول کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے اپنی تاریخ، ماحول، انسانی رویوں اور نفسیات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے کسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو انہیں یقیناً یہ ناول مایوس نہیں کرے گا کیوں کہ اس میں موجود تقریباً ہر واقعہ یہ گواہی دیتا محسوس ہوتا ہے کہ 'ہاں! ایسا ہو سکتا ہے، ایسا ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوا ہوگا۔'

**ڈاکٹر بی بی امینہ**

(شعبہ اُردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد)

پہلے مجھے اعتراف کرنے دیں کہ ناول پڑھنے تک میرا قیاس تھا کہ ''اَنواسی'' کا مطلب ہے غیر مقامی، مگر جب اس کی ہیروئن سنگری کو اس کا نیم شوہر سیدا پامال کرتا ہے اور ستلج پر ریلوے پل بنا کر وہاں سے انگریز ٹرین گزارنے کا منصوبہ بناتا ہے اور ستلج واسی اپنے دریا کی بے آبروئی پر بددعائیں کرتا ہے تو میں نے لغت کی جگہ مصنف سے رابطہ کیا تب انہوں نے بتایا کہ جنسی اعتبار سے کھنگالی ہوئی انواسی ہوتی ہے۔ حفیظ خان بہاولپور کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، ریڈیو پروڈیوسر رہے، سیشن جج رہے، خوبصورت اور سمارٹ انسان ہیں اس لیے خواتین کے بارے میں اتنے تیقن سے بات کرتے ہیں جو بہت بڑے ناول نگاروں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ سرائیکی اور اُردو ناول، افسانہ اور ڈرامہ تواتر سے لکھا تاریخ اور تہذیب سے بھی دلچسپی ہے اس لیے ان کے اس ناول کے کئی اجزا حیرت انگیز ہیں۔ خاص طور پر آخری دو ابواب، سنگری غیر معمولی کردار ہو سکتا تھا مگر وہ بوجوہ کھنگالی گئی عورت کو لارنس آف تھلیبیا تک کی ہیروئن نہیں بننے دینا چاہتے۔ تاہم ناول کے بیان میں ڈرامائیت اور سسپنس عروج پر ہے۔ مذہبی ٹھیکیداروں سے تعاون ہی نہیں سجدہ طلبی میں انگریز حاکم کی مہارت کی نقشہ کشی قابل تعریف ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد

ایک تاریخ ساز ناول جس میں خطے کی تاریخ اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو کمال ہنر وری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

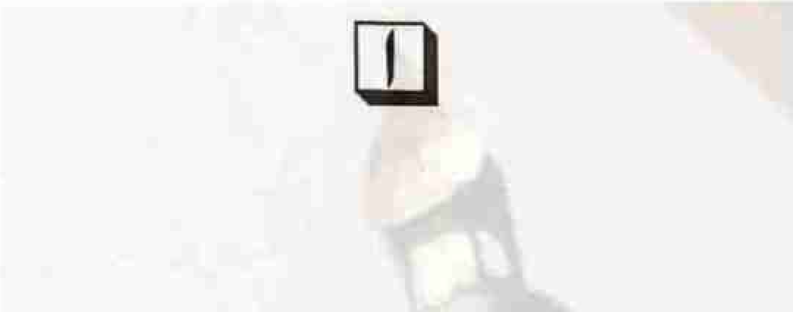
(خالد فتح محمد)

انو اسی کی 'سنگری' برصغیر میں صدیوں سے موجود عورت کے اس مثالی کردار میں جو رتی اور سیتا سے تشکیل ہوتا ہے ایک اہم تغیر ہے۔ عورت کے تاریخی ارتقا کو سمجھنے کے لیے سنگری ایک اہم حوالہ ہے۔ اُردو ادب میں یہ اپنی نوعیت کا اکلوتا کردار ہے۔

(منیر فیاض)

اس ناول میں تاریخ اور کہانی شیر و شکر ہیں۔ لیکن نہ تو کہانی روایتی انداز میں بیان کی گئی ہے اور نہ تاریخ۔ کردار زمینی اور حقائق ایک محقق کی جستجو کا ثمر ہیں۔ ایک اور خوبصورت تخلیق پر حفیظ خان آپ کو اور معیاری ادب کے متلاشیوں کو مبارک باد!

(ڈاکٹر ارم سلطانہ)



# ۱

بارہ جنوری 1872ء۔ لودھراں اور بہاول پور کے درمیان بہنے والے دریائے ستلج کے شمالی جانب آباد بستی آدم واہن میں اُس روز ایک حشر سا بپا تھا کہ جس میں خوف، دہشت اور غصہ ایک ساتھ یہاں کے مکینوں کے ذہنوں میں اُنڈیل دیے گئے تھے۔ غصے سے بھرے ہوئے جوان بستی کے باہر جمع تھے جب کہ بوڑھے اپنی شکن آلود پیشانیوں کے ساتھ بستی کے وسطی چوک میں بڑے بڑے ماچے بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں کام کاج چھوڑ کر گھروں سے باہر جھانکتی ہوئیں اور بچے اِس ساری صورتِ حال کا ادراک کیے بغیر کبھی خاموش مگر فکر مند بوڑھوں کے گرد جمع ہو جاتے اور کبھی منہ اُٹھا اُٹھا کر بستی کے باہر موجود غصے سے کھولتے ہوئے نوجوانوں کی جوشیلی باتیں سننے پہنچ جاتے۔ اُن کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ وہ نوجوانوں کے ساتھ ہی بستی کے باہر رہیں مگر اُن کی خوف زدہ ماؤں کی دہشت زدہ آوازیں انہیں پھر سے اندر کھینچ لاتیں۔

نوجوانوں کا خیال تھا کہ گورے صاحب کے اِس حکم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے جس کی رو سے وہ اُن کی بستی کے قبرستان کو برباد کر کے وہاں سے جنات کی فولادی بگھی گزارنا چاہتا ہے۔ اب بھلا کہاں لے جائیں گے وہ اپنی پیڑھی کے وڈکوں کی قبریں۔ کیا اُن کے ہوتے ہوئے بھی اُن کی اجداد کی لاشیں اور ہڈیاں چیلوں اور کتوں کے کھانے کے لیے قبروں سے نکال باہر پھینکی جائیں گی؟ وہ مر جائیں گے مگر اپنے جیتے جی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ معاملہ صرف اِس حد تک

بھی نہیں تھا، وہ تو اُن کے پتن کو اجاڑ کر، اُن کی کشتیوں کو بے کار کر کے اُن کے دریا پر لوہا ڈال کر اسے سکھانا چاہتا ہے۔ جب دریا میں پانی رہا نہ مچھی تو کھا جا کیا خاک ہو گا؟ اِس سے پہلے بھوک اور پیاس سے مریں، کیوں نہ سب کو مار کر مریں۔

بڑی عمر کے لوگ نوجوانوں کی اِس سوچ کی تائید کرنے میں ہچکچا رہے تھے۔ اُن کے نزدیک ایسا کرنا سیدھی سادی خودکشی تھی۔ گورا صاحب نے اُن کے اجداد کی قبروں پر لوہا بچھانا ہی بچھانا تھا۔ اُن کی ہڈیاں چاہے کتے کھائیں، کوے یا چیلیں، ہونی کو ٹالنا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح ستلج کے آدم واہن گھاٹ پر کشتیاں بند ہوتی ہیں تو گورے صاحب کو کیا؟ ہمارے بچوں کے کھانے کو ماس مچھی نہیں رہے گا تو صاحب لوگوں کو کیا پروا؟ اُنہیں تو ٹٹی آئے گی نا!

اَسی نوے کے پیٹے میں سانس لینے والے جھریوں بھرے نَبلو سانسی اور مِٹھل ماچھی نے اپنی لرزتی ہوئی آواز میں سمجھانے کی کوشش کی کہ گوروں سے متھا مت لگایا جائے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ پچاس پچپن سال پہلے ملتان فتح کرنے کے بعد جب سکھوں نے ریاست بہاول پور پر چڑھ ماری کی کوشش کی تو اُن کی یہ یلغار انہی گوروں کی وجہ سے ناکام ہوئی تھی۔ نَبلو سانسی کی سانس بے شک پھول چکی تھی مگر اُس نے ٹوٹتے ہوئے لفظوں میں کانپتے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا کہ گوروں کی حکم عدولی نہیں، بہت ہی بُھیڑے لوگ ہیں، جو سوچ لیں اُس سے ٹلتے نہیں۔ مِٹھل ماچھی نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ ہم اپنے اپنے وَڈکوں کی ہڈیاں نکال کر کہیں اور قبریں بنالیں۔ مگر مِٹھل ماچھی کے مشورے پر مولوی جارُاللہ نے یہ کہہ کر رَند ا پھیر دیا کہ ایسا کرنا میت کی توہین، صریحاً کفر اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اب مولوی کے فتوے کے بعد کس کی مجال کہ کوئی اختلاف کرے لہٰذا وہاں بیٹھے ہوئے سب نے چُپ سادھ لی۔

مِٹھل ماچھی کا قبرستان سے وڈکوں کی ہڈیاں نکال کر کہیں اور دفنانے کا مشورہ بستی کے باہر کھڑے بپھرے نوجوانوں تک پہنچا تو وہ مزید بپھر گئے۔

''آخر کو ہے نا حرامی یہ وَڈکوکڑا..... قبر میں لاتیں ہیں اور چلا ہے اپنے وڈکوں کی قبریں اُکھاڑنے۔'' سیدے کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ''میں ابھی جا کر اُتارتا ہوں اِسے قبر

میں۔'' اُس نے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور بستی کی طرف لپکا۔ سیدے کو بستی کی طرف لپکتا دیکھ کر اُس کا دوست سکندر ابھی تین چار جوانوں کے ساتھ بستی کی طرف بڑھا کہ اُس کا ساتھ دے سکے مگر پیرو درکھان کا کڑیل بیٹا منگر اپنے دس بارہ ساتھیوں سمیت اُن کی راہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

''حرامی نہیں ہے پاگل ہے وہ...... ہمیشہ ٹھیک بات غلط وقت پر کرتا ہے۔ میری دادی کہتی تھی کہ بھلے مٹھل کی ماں کو اُس کا باپ شجاع آباد سے بھگا کر لایا تھا مگر بعد میں نکاح بھی تو پڑھوالیا تھا۔'' منگر نے اپنے تئیں سیدے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ اور بھڑک اُٹھا۔

''تو اُس کی طرف داری نہ کر منگر.... تو کون ہوتا ہے کسی حرامی کو حلالی بنانے والا۔'' سیدے نے ساتھیوں سمیت بستی کی جانب پیش قدمی کی کوشش کی تو منگر اور اُس کے ساتھیوں نے انہیں لاٹھیوں پر روک لیا۔

''اگر میں نہیں ہوتا کسی حرامی کو حلالی بنانے والا تو تو کون ہوتا ہے ایک اَسی سال کے بوڑھے کو حرامی کہنے والا۔ اگر مٹھل ماچھی حرامی تھا تو تیری نانی کی بہن کی شادی اُس سے کیوں ہوئی...... اور بات سُن! تجھے کیا لینا دینا کسی تین نسل پہلے کے حرامی حلالی سے.... جو بوڑھا خود مرنے کو تیار بیٹھا ہے تو اُسے دو چار دن پہلے مار کر کیا اُکھیڑ لے گا! ہائیں!''۔ لگ رہا تھا کہ منگر کے اِس آخری جملے نے سیدے کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تبھی اُس کا بھراؤ قدرے نیچے آتا ہوا محسوس ہوا۔ منگر نے لاٹھی ایک طرف پھینکی اور آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ سیدے کے کندھے پر رکھ دیے۔ منگر اب اُس کی آنکھوں میں جھانک کر اُس کی سوچ کے بدلاؤ کا اندازہ لگا رہا تھا۔ سیدے نے اُس کی نیت بھانپ کر آنکھیں ایک طرف پھیر لیں۔ منگر نے جان لیا کہ وہ جان بوجھ کر آنکھیں نہیں ملانا چاہتا۔

''بابے مٹھل کی جد کو چھوڑو..... اُس کے حرامی حلالی ہونے کو چھوڑو...... اِس بات پر سوچو کہ وہ کہہ کیا رہا ہے..... اِس سے پہلے کہ گورے تمہارے وَڈکوں کی ہڈیاں اُن کی قبروں سے نکال کر باہر پھینکیں، کیوں نہ ہم اسے اپنی تقدیر مان کر خود ہی نکالیں اور خود ہی کسی اور جگہ عزت

احترام سے دفنا دیں۔"

"اس سے بہتر ہے کہ ہم خود نہ مر جائیں۔" سیدے کی آواز میں اب بھراؤ نہیں رہا تھا۔

"تو کیا ہو جائے گا؟" منگر نے اُسے ڈھیلا پڑتے دیکھ کر بازو سے پکڑا اور ساتھ پڑے پرانی ٹالہی کے بڑے سے مُنڈھ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ سیدا مسلسل نگاہیں جھکائے خشک مٹی کو گھورے جا رہا تھا جس میں کبھی ہریالی رہ چکے گھاس کے خشک پتے اپنی فنا کی جانب اچھا خاصا سفر طے کر چکے تھے۔

"میں اگر تمہاری بات مان بھی لوں تو مولوی جار اللہ کے فتوے کا کیا ہوگا؟" سیدے کا لہجہ ہی نہیں آواز بھی گھٹی گھٹی سی تھی جیسے اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہا ہو۔

"ہم کوشش کریں گے کہ مولوی اپنا فتویٰ بدل دے۔" منگر نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ مگر اس کا کوئی مثبت جواب دینے کے بجائے سیدے نے اپنا لہجہ ہی اچانک بدل لیا۔

"مولوی اپنا فتویٰ بدلے یا نہ بدلے مگر میں اپنا ارادہ نہیں بدلنے والا۔" سیدے کی آنکھوں کے رنگ میں بھی پھر سے سُرخی شام ہونے لگی تھی مگر وہ مُنڈھ سے اُٹھا نہیں۔ "تمہیں پتا ہے نا منگر کہ اِس بستی سے اُٹھ جانے والے کیسے کیسے لوگ اِس قبرستان کی مٹی میں ملے ہوئے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ ہم اُن کی ہڈیاں نکال کر کسی دوسری جگہ دفن کر دیں مگر اُن کے ماس کا کیا کرو گے جو پانی بن کر اِس مٹی میں جذب ہو چکا ہے۔ کیا صرف ہڈیاں ہی انسان کی اَخیر ہوتی ہیں؟ وہ ماس جس سے ہم پیار کرتے ہیں، جو ہماری صورتیں بناتا ہے، ہمارے وَنکوَ نک نقوش کو ترتیب دے کر ہمیں ایک دوسرے سے الگ بناتا ہے، کیا وہ ہمارا اَخیر نہیں ہوتا؟ اُس کا کیا کرو گے؟ کہاں لے جاؤ گے یہ مٹی جو میرے پیاروں کے ماس میں گندھی ہے؟ خوشبو ہے اُن کی اِس مٹی میں۔" سیدے کی گردن کی رگیں پھول کر باہر کو نکل آئیں۔

منگر کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے۔ سیدے جیسی سوچ رکھنے والے نوجوانوں کے جذبات اتنے بھڑکے ہوئے تھے کہ وہ اپنی سوچ کے برعکس کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔

''تمہیں یاد ہے نا منگر میری ماں... جس کا تم نے بھی دودھ پیا ہوا ہے، کیا کہا کرتی تھی اپنے بارے میں؟'' منگر نے بدستور اُلجھے ہوئے تاثرات کے ساتھ سیدے کو دیکھا مگر سیدا اُسے مخاطب کرنے کے باوجود کہیں ماضی میں جھانک رہا تھا۔

''وہ کہا کرتی تھی نا کہ مرنے کے بعد مجھے اپنے باپ کے قدموں میں دفنانا!..... اور ابھی دو سال پہلے وہ وہیں اپنے سئیں کے قدموں میں دفن ہوئی تھی..... تو کیا کروں؟ اُن کی میتیں نکال کر کہاں لے جاؤں؟ کیا کوئی اپنی ماں کے ادھ گلے وجود کو دیکھ سکتا ہے؟ کیسے اکٹھے کرتا پھروں اُن کے وجود کے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے محض اِس لیے کہ گورا صاحب نے اُن کی قبروں میں سے لوہے کے شہتیر گزارنے ہیں۔ کیسا حاکم ہے یہ کہ اپنی رعایا کو مرنے کے بعد بھی عزت آبرو کے ساتھ مٹی ہونے کا حق تک دینے کا روادار نہیں۔'' سیدے کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔

''مجھے سب یاد ہے سیدے..... مگر ہو کیا سکتا ہے؟ ہم گورا سرکار سے لڑ کر یا آخیر مر کر بھی اپنی بات نہیں منوا سکتے۔ سرکار نے تو جو کرنا ہے ہو کر رہے گا..... ہمارے تمہارے وَڈکوں کی ہڈیوں کو تو اب دھرتی بھی زیادہ دیر پناہ نہیں دے سکے گی۔ جو تم چاہتے ہو اُس میں بس اتنا مختلف ہوگا کہ خون خرابہ ہوگا اور ہر چیز مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائے گی۔'' منگر افسردہ سا مُنڈھ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سیدا عقل کے استعمال کے سارے دروازے بند کرتا چلا جا رہا تھا۔

''منگر ہو جانے دے مٹی کے ساتھ مٹی اور خون خرابہ بھی۔ کم از کم یہ تو ہوگا نا کہ ہم اپنی آنکھوں سے اپنے وَڈکوں کی بُھرتی ہوئی ہڈیاں اور گلا سڑا ماس تو نہیں دیکھ سکیں گے نا!.... اور سنو! میں آج قسم لینے جا رہا ہوں بستی کے سارے نوجوانوں سے کہ آخر دم تک کوئی بھی گوروں کو بستی میں گھسنے نہیں دے گا.... اور ہاں.... اگر تم بھی ہمارا ساتھ دینا چاہو تو دیگر ویلے جڑھدے والی ڈھنڈ کے پاس قسم دینے آ جانا۔''

منگر جو پہلے ہی سیدے اور اُس کے ساتھیوں کو متوشش نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور بھی فکر مند ہو گیا۔ جو بھی تھا بہت برا ہونے کو جا رہا تھا مگر وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کیا کر لیتا کہ

جب جوانوں کی اکثریت سیدے کی ہم خیال تھی۔ اُسے لگ رہا تھا کہ معاملہ اب گاؤں کے بڑے بوڑھوں کے ہاتھ سے بھی نکل چکا ہے، تبھی تو سیدے کو یوں علی الاعلان جرات ہوئی تھی کہ وہ اُسی سالہ مِٹھل ماچھی کو حرامی قرار دے کر یوں قتل کرنے پر تُل جائے۔

اتنے میں سیدا جاتے جاتے واپس پلٹا، منگر کے قریب آیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہولے سے بولا۔

''اور ہاں! مِٹھل ماچھی کا قتل ابھی نہیں.... اُدھار ہے مجھ پر..... اگر وہ اپنے حرامی پن سے باز نہ آیا تو یاد رکھنا..... سیدا اپنا اُدھار چکاتے ہوئے دیر نہیں کرتا۔''

# ۲

سِنڈی ریلوے کمپنی کا سابق چیف ریذیڈنٹ انجینئر جان برٹن، انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے میں شمولیت کے بعد اپنے بیٹے اور معاون ولیم آرتھر برٹن کے ہمراہ بہاول پور میں کمپنی کے ریسٹ ہاؤس میں کئی دنوں سے پہنچا ہوا تھا لیکن ہمت نہیں ہو پا رہی تھی کہ اِس چھوٹی سی بستی کے ساکنان کا سامنا کر سکے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ چند درجن نفوس اتنی ہمت نہیں رکھتے تھے کہ کارِ سرکار میں مزاحم ہو سکیں مگر پھر بھی نہ جانے کیوں وہ اِن دہشت زدہ لوگوں کی آنکھوں میں جھانکنے سے گریزاں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اِن لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے بغیر کسی نہ کسی طور اپنا مقصد حاصل کر لے لیکن اُس کی ٹیم ابھی تک کوئی ایسا حل نکالنے میں ناکام چلی آ رہی تھی۔

جان برٹن یہ بھی جانتا تھا کہ مسئلہ معاشی یا انتظامی سے زیادہ لوگوں کی جذباتی وابستگی کا تھا جس میں اب مذہبی اقدار بھی شامل ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ویسے بھی جان برٹن تو محض انجینئر تھا جسے انتظامیہ کی جانب سے کیے جانے والے اقدامات کی پروا نہیں ہونی چاہیے تھی مگر ریلوے لائن بچھانے اور دریائے ستلج پر پل بنانے کے لیے موزوں سروے کرنے کے بعد اسے عملی شکل دینا تو اُسی کی ذمے داری تھی۔ اُس کے بیٹے ولیم نے اُسے کئی متبادل ڈرائنگز بنا کر دیں مگر اِن سے نہ صرف کمپنی کا خرچہ کئی گنا بڑھ جاتا تھا بلکہ دریا کے گھیر کو پُل کی محدود طوالت کے اندر رکھنے کے لیے دونوں کناروں پر بنائے جانے والے پشتے بھی اُس مضبوطی سے کافی حد تک محروم ہوتے دکھائی

دے رہے تھے جو اُنہیں چاہیے تھی۔ اِس طرح ہر طرف سے لے دے کر موزوں ترین ایک ہی سائٹ تھی کہ جہاں پر بستی کا کئی سو سالہ قدیمی قبرستان واقع تھا۔ اِس جگہ سے ریلوے لائن گزارنے کے واسطے کم وبیش پورا قبرستان ہی اُکھاڑ پچھاڑ کی زد میں آتا تھا جب کہ دریا کے شمالی جانب ریلوے پُل کا پشتہ بنانے کے لیے نہ صرف کشتیوں کا پتن ختم کرنا پڑتا تھا بلکہ بستی کا آدھے سے زیادہ جنوبی حصہ بھی لپیٹ میں آتا تھا۔

اِس چھوٹی سی بستی کے لگ بھگ تین سو لوگوں کے مشتعل جذبات سے قطع نظر انگریز سرکار کو برطانوی ہند میں بہر صورت ایک ایسا نظام نقل وحمل چاہیے تھا جو نہ صرف سستا، جدید اور کثیر المقاصد ہو بلکہ محفوظ اور تیز رفتار بھی ہو۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں دخانی انجن کی ایجاد نے پہلے ہی یورپ میں انقلاب برپا کر رکھا تھا لہٰذا کیسے ممکن تھا کہ اسے برطانیہ کے زیرِ نگیں نو آبادیاتی خطوں تک توسیع نہ دی جاتی۔ سو پورے ہندوستان میں کئی ریل کمپنیوں کا قیام عمل میں لاتے ہوئے اپنے اپنے ریجن کی سطح پر ریلوے ٹریک بچھانے کے کام کا آغاز ہو چکا تھا۔

انجینئر جان برنٹن اِس سے پہلے جس کمپنی کے لیے کام کر رہا تھا وہ 1855ء سے سندھ میں کام کرنے والی کئی ریلوے کمپنیوں کی نہ صرف سرخیل تھی بلکہ اُس کا نام بھی ''سندھ'' کے بگڑے ہوئے برطانوی تلفظ ''سنڈی'' پر رکھا گیا جو اس سے بھی قبل ''سنڈی ڈاک'' کے حوالے کچھ اتنا بھی اجنبی نہیں رہا تھا۔ یہ کمپنی دراصل اُس بڑے پراجیکٹ کا ایک جزو تھی جس کے تحت لاہور جیسے معاشی مرکز کو کراچی کی بندرگاہ سے اِس طرح جوڑنا تھا جیسے اِس سے قبل افغانستان سے آنے والے حملہ آوروں نے اسے غزنی اور غور کی شمالی گزرگاہوں سے جوڑ رکھا تھا۔ اِس مقصد کے لیے ایک طرف سنڈی ریلوے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی سنڈی کمپنی کو 108 میل طویل کراچی تا کوٹری ریلوے ٹریک بچھانے کا فریضہ سونپا گیا جو اِس نے مئی 1861ء تک مکمل کر لیا جب کہ دوسری جانب پنجاب ریلوے کمپنی نے لاہور کو ملتان سے جوڑنے کا منصوبہ بھی 1865ء کے خاتمے تک تکمیل کو پہنچا دیا۔ اب معاملہ ملتان کو کوٹری سے ملانے کا تھا، اِس کے واسطے جہاں 1871ء میں ''انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے'' کا قیام عمل میں لایا گیا وہاں ملتان کو روہڑی، روہڑی کو سکھر اور

سکھر کو کوٹری سے ملانے کے لیے ریلوے کے تین ڈویژن بنائے گئے اور ان تینوں ڈویژنز میں بیک وقت تعمیراتی کام شروع کر دیا گیا۔

خشکی پر ریلوے ٹریک کا بچھا لیا جانا تو کچھ مشکل نہیں تھا۔ اصل مسئلہ کوٹری اور ملتان کے درمیان سندھ اور ستلج جیسے دریاؤں پر ریلوے پل بنانے کا تھا۔ اِس ٹریک کے راستے میں دریائے سندھ سکھر اور روہڑی کے درمیان بہتا چلا آ رہا تھا جب کہ بہاول پور اور آدم واہن کے درمیان دریائے ستلج۔ گو کہ اُس وقت تک سنڈی ریلوے کمپنی دریائے سندھ میں نقل وحمل کے واسطے ''انڈس سٹیم فلوٹیلا'' چلا چکی تھی مگر یہ ریلوے پل کا نعم البدل نہیں تھا جس پر سے سینکڑوں ٹن وزنی بوگیاں بہ آسانی گزاری جا سکتی تھیں۔ اب اِن دو دریاؤں پر پل کیسے بنیں اور کس مقام پر بنیں، اِس کے لیے سروے کا کیا جانا انجینئر جان برنٹن کی ذمے داری ٹھہری۔ جان برنٹن کی سابقہ کمپنی اگر چہ 1870ء میں ''پنجاب ریلوے'' اور ''دہلی ریلوے'' کا حصہ بن چکی تھی مگر کوٹری کو بذریعہ ریل ملتان اور لاہور تک توسیع دینے کے لیے اُس جیسے انجینئر کی خدمات کی ضرورت اب بھی تھی سو اُسے کوٹری سے ملتان تک کے ریلوے ٹریک کے سروے اور آدم واہن کے نزدیک دریائے ستلج پر ریلوے پل کی تعمیر کا کام سونپ دیا گیا۔

ملتان سے لودھراں اور بہاول پور سے روہڑی تک ریلوے ٹریک بچھاتے ہوئے نہ تو کہیں جان برنٹن کو کسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور نہ ہی ''انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے'' کو تخمینہ شدہ اخراجات سے زائد کا اندیشہ محسوس ہوا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ یہاں کی رعیت نما مخلوق مسلسل حیرت میں تھی کہ اس قدر لوہا زمین پر کس واسطے بچھایا جا رہا ہے اور یہ اتنے بڑے بڑے کوٹھے کس جناتی طاقت سے زمین پر دوڑیں گے۔ کوئی اسے نصرانیوں کی پھیلائی ہوئی نحوست قرار دے رہا تھا اور کوئی ایسا شیطانی عمل جو دھرتی کو بنجر اور دریاؤں کو خشک کر دے گا۔ سنڈی ریلوے کمپنی کا چیف ریذیڈنٹ انجینئر مقرر ہونے سے پہلے جان برنٹن کو ہندوستانیوں کی بود وباش، تہذیبی، مذہبی، ثقافتی اور لسانی تنوع کے ساتھ ساتھ یہاں کی تاریخ، جغرافیے اور جغرافیائی تبدیلیوں تک سے آگاہ کیا گیا تھا۔ اُسے جذباتیت سے باز رہنے اور نفاق کو اپنا رہنما بنائے رہنے کا درس الگ سے تھا۔

جان برنٹن کے تجربے اور پیشہ ورانہ مہارت پر تو کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی تھی البتہ اُس کے کبھی کبھار کے انسان دوست انتظامی فیصلوں کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھا گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اِس پراجیکٹ میں اُس کے سخت گیر بیٹے ولیم آرتھر برنٹن کو بطور اسسٹنٹ اُس کے تمام فیصلوں میں عملی طور پر شریک رہنے کی تنبیہ کی جا چکی تھی۔ اِسی پس منظر میں جان برنٹن نے جب آدم واہن کے نزدیک دریائے ستلج کے شمالی کنارے پر پھیلے ہوئے کافی قدیم اور وسیع قبرستان کو دیکھا تو اُس کی چھٹی حس مضطرب ہونے لگی کہ یہاں کی مسلمان آبادی آسانی سے اُس کے پراجیکٹ کو آگے نہیں بڑھنے دے گی کیونکہ وہ زندہ اجداد کی قدر کریں نہ کریں مگر مرے ہوؤں کی قبروں کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرتے ہیں۔

جان برنٹن کو یہاں کی ہندو آبادی اپنی عادات واطوار اور رویوں کے سبب بہت اچھی لگتی تھی کیونکہ وہ تو کبھی اُس کی ریلوے کمپنی کے تعمیراتی پراجیکٹس میں دخیل ہی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اپنی قیمتی زمینوں کو کبھی قبرستان بنانے پر ضائع کیا۔ وہ مرنے کے بعد پانی کے بہاؤ کے ساتھ رواں رہنے کے قائل جب کہ مسلمان تو ہر قیمتی جگہ کو گھیر گھار کر قبرستان بنانے کے بعد مردوں کو مقید کر لیتے تھے۔ جان کے خیال میں قبرستان بنانا مقبوضہ قوموں کا نہیں حاکم قوموں کا حق تھا کہ وہ اپنے عالی دماغ لوگوں کی تعظیم میں مرنے کے بعد بھی کمی نہ آنے دیں۔

اب تک جو ہو چکا تھا وہ جان برنٹن کے اندیشوں کے عین مطابق تھا مگر وہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے طریقے جاننے کے باوجود اپنی طبع کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہوئے اُنہیں یہاں آزمانا نہیں چاہتا تھا۔ گو کہ یہاں کے لوگ کمتر انسانی سطح پر جی رہے تھے اور اُس کے تجزیے کے مطابق انسان کہلانے کے لائق بھی نہیں تھے مگر پھر بھی انسانوں جیسی شکلیں اور انہی جیسے جذبات تو تھے، اس لیے ہر روز بستی پر عسکری آپریشن کے جواز اور نیت کے باوجود انسانی ہمدردی اُس کے فیصلوں پر غالب آ رہی تھی۔ جان برنٹن جانتا تھا کہ اُس کی ہچکچاہٹ کچھ اور دن باقی رہی تو یقیناً اُسے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ جائیں گے مگر وہ پھر بھی اپنے بیٹے ولیم کو ہر روز کسی نئے خیال اور کسی نئی تجویز کے ساتھ سائٹ پر روانہ کر دیتا تا کہ اُس کی عملیت کا جواز رہے۔ لیکن شام ڈھلے

ولیم کی ناکام واپسی اُسے اپنی ذات کے خلاف جنگ میں شدید الجھاؤ کے کچھ اور بھی قریب کر دیتی۔ اب وہ فیصلہ کن مرحلہ آن پہنچا جب اُسے کمپنی کی ملازمت اور کچھ کمتر انسانی سطح پر سانس لینے والی انسان نما مخلوق میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اُس کے تذبذب کے لمحات میں اُس کا بیٹا ولیم اُسے کئی بار کہہ چکا تھا کہ فیصلہ کر لیجئے وگرنہ ہوسکتا ہے یہ فیصلہ کرنے کی ذمے داری جلد مجھے سونپ دی جائے کیونکہ حکم تو ریلوے کمپنی ہی کا چلنا ہے۔ ایسے میں جان اپنے بیٹے ولیم کی آنکھوں میں جھانکتا مگر وہاں اُسے باپ کی تکریم کی بجائے اُس کی جگہ لینے کے لیے مہم جوئی کا سانپ پھن پھیلائے دکھائی دیتا۔

اِن حالات میں جان برنٹن کو آخر کار اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے ناپسندیدہ فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ اگر چہ اس فیصلے کو فائلوں سے باہر نہیں آنے دیا گیا تھا مگر پھر بھی اس کی خبر دریا کے جنوبی کنارے پر موجود کمپنی کے ملازمین کی غیر معمولی نقل و حرکت کی صورت شمالی کنارے پر واقع بستی آدم واہن کے مکینوں تک خوف، دہشت اور غصے سے در آنے والے کھنچاؤ کی صورت پہنچ چکی تھی۔



# ۳

کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ لودھراں سے بہاول پور جاتے ہوئے دریائے ستلج کے کنارے واقع قصبہ آدم واہن کا نام ''آدم واہن'' کیسے پڑا؟ تیقن اِس پر بھی نہیں کہ یہ کب اور کس نے آباد کیا؟ ویسے سننے کو داستانیں بہت اور دہرائے جانے کو روایات کی بھی کمی نہیں تھی۔ دریائے ستلج کے شمالی کنارے آباد اِس بستی کے جنوب میں دریا کے پار 1802ء میں آباد ہونے والا ریاست بہاول پور کا دارالحکومت بہاول پور اور اِس کے شمال میں صوبہ ملتان تھا جہاں بائیس برس پہلے 1849ء میں سکھا سرکار کے آخری گورنر دیوان مولراج کو شکست دینے کے بعد گورے اپنا اقتدار مستحکم کر چکے تھے۔ اِس طرح بستی آدم واہن صوبہ ملتان اور ریاست بہاولپور کی سرحدوں پر واقع ہونے کے سبب ایک دور افتادہ اور محرومیوں کی شکار بستی تھی جہاں تک آتے آتے دونوں طرف کے حاکموں کو خود اپنی خبر بھی نہیں آتی تھی۔ چونکہ ملتان تو ویسے بھی گوروں کے زیرِ نگیں اور ریاست بہاول پور اُن کے اثر و نفوذ تلے تھی؟ تو ایسے میں دریا کے دونوں کناروں پر پلنے والے انسان نما کیڑے مکوڑوں کی خبر کون لیتا کہ جن کے لیے زندگی کی سب سے بڑی مہم جوئی پیٹ کے لیے شروع ہوتی اور پیٹ ہی پر ختم ہو جاتی۔ اس درمیانی دورانیے میں باقی جو کچھ بھی تھا یا ہوتا رہتا وہ محض سانسوں کا آنا جانا ہی گردانا جاتا۔

دریاؤں کے کنارے آباد بستیوں میں دو طرح کے جرائم اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ

اپنی حساسیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اُن کی بہتات کے سبب سماجی معمولات کا جزو سمجھ لیے جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ان میں سرفہرست رسہ گیری یعنی مال مویشی کی چوری اور بازو نکالنا یعنی جوان عورتوں کا اکثر بالرضا اور کبھی کبھار جبراً بھگالیا جانا۔ مال مویشی چونکہ دریائی بستیوں کی معیشت کی بنیادی اکائی سمجھے جاتے ہیں اس لیے معاشرتی اِکائی یعنی بازو کا اغوا ہو جانا اتنا کاری وار نہیں گردانا جاتا جتنا کہ گائے بھینس کا چوری ہو جانا۔ دیگر دریائی بستیوں کے ساکنان کی طرح آدم واہن کے باسیوں کو یقین تھا کہ جس طرح بڑے بڑے زرخیز تھنوں اور لانبی سیاہ آنکھوں والی چٹی گوری لڑکیاں اغوا ہو کر ہی رہتی ہیں اُسی طرح لشکارے مارتی سیاہ بھینسیں اور دودھ سے بھرے تھنوں والی گائیں بھی پرایا دھن ہی ہوتی ہیں۔

ایسا معاشرہ جو اپنے ہاں جوان لڑکی کو اغوا کے خلاف تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے تو وہاں سیاہ آنکھوں والی چٹی گوریوں لڑکیوں کا پیدا ہوتے ہی کسی مرد کے ساتھ ناواں، منگنی یا نکاح اِس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اُن کی عزت اور عصمت کی حفاظت کی ذمے داری ہر ممکن جلدی میں کسی تنومند مرد کو سونپ دی جائے۔ اِس قسم کے سماج میں جہاں شادی کے لیے لڑکی کا حصول ''نکے'' یا ''وٹے'' کے بغیر ممکن نہ ہو تو وہاں اُسے ''دھن'' کا درجہ مقامی رواجی قانون کے تحت دیا جاتا ہے یعنی ایسی متوازی دولت جس کے بدلے یا جس کے بل بوتے پر خریداری یا بارٹر ڈیل ممکن ہو سکے۔ لہٰذا اپنے دھن کی حفاظت کرنے میں امکانی طور پر ناکام والدین اُسے پرایا دھن قرار دے کر جلد از جلد وہاں سونپنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جہاں سے اُس کے بدلے میں اُن کی من چاہی حاجت پوری ہو سکے۔ اِس کے برعکس مدرسری نظام کی باقیات معاشروں میں دھن کا درجہ لڑکے کو حاصل ہے مگر نومولود نہیں، تگڑا اور جوان لڑکا۔

بستی میں کئی دنوں سے کسی چھت کی طرح آسمان پر تنے ہوئے تناؤ، دہشت، غصے، وسوسوں اور بے یقینی سے اگر کسی نے بال برابر بھی اثر نہیں لیا تھا تو وہ سیدے کی منکوحہ سنگری تھی۔ سیدا پانچ برس کا رہا ہوگا کہ جب اُس کی خالہ زاد سنگری اُس کے ناویں میں آئی۔ یہ ناواں شاید ناواں ہی رہتا کہ اگر سیدے کے چچا کے گھر بھی بیٹی نہ پیدا ہو جاتی۔ صرف اِسی پر بس نہیں بلکہ کھنڈ

کے چٹے لچھے جیسی اِس بچی سنگری کا رشتہ چھ برس کے منگر کے لیے بھی آ گیا جو اُس کے چھوٹے چچا کا بیٹا تھا۔ اِن حالات میں کسی اور کی دال کیا گلتی، سنگری کی ماں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جھٹ سے مولوی کو بُلا کر سنگری کا نکاح اپنی منہ بولی بہن کے بیٹے سیدے سے پڑھوا دیا۔ سنگری جوان تو ہوتی گئی مگر یہ احساس کیے بغیر کہ وہ بستی کے کسی ایسے اکھڑ نوجوان کے نکاح میں ہے کہ جو ستلج کے پانی کو بھی اپنی مرضی سے بہانا چاہتا ہے۔ سردیوں کی لُوری کو حکم دیتا ہے کہ اُس کی منشا سے چلے اور تپتے ہاڑ کی لُکھ بھی اُس کی رضا کے سامنے سَر نہ اُٹھائے۔

سولہ سترہ برس کی عمر میں بھی سَنگری نے عجیب ناک نقشہ نکالا اِس طرح کہ اُس کے جسم کا ایک ایک انگ باغیانہ روش اپنائے ہوا تھا۔ سینہ سرکشی کے لیے اُتاولا تھا تو سُرین تیز چلنے میں اپنی اپنی وسعت کشائی کے لیے ایک دوسرے میں چٹ بَٹ اور دست وگریباں اور اگر یہی چال آہستہ اور مست خرام ہوتی تو جیسے کشتی کے چپوار برابر برابر وقفوں سے کبھی کشتی کے قریب اور کبھی دور جا رہے ہوتے ہیں۔ لانبا قد، گول چہرہ اور اُس پر چھوٹی سی مگر کسی کے نخرے کی طرح کھڑی ناک، کاغذی بادام کی سی ہیئت لیے کالی آنکھیں اور مالٹے کی قاش جیسے ہونٹ جن سے رس ٹپکنے کے لیے بے چین۔ عجیب سی بے اعتنائی تھی اُس کے مجموعی مزاج میں۔ اپنے آپ، اپنے اطراف اور اپنے رشتے ناتوں سے بھی بے پروا۔ اُس کی ماں اُسے بہت سمجھاتی کہ وہ پُٹھی کھوپڑے والے بندے کے حق میں ہے، ذرا سنبھل کر رہا کر۔ مگر وہ کہاں کسی کی بات ماننے والی تھی۔ جدھر کو جی چاہا اُدھر کو چل پڑی۔ دریا کنارے سورج کا غروب ہونا اُسے بہت بھلا لگتا کہ جب پتن پر آخری پھیرے کے ساتھ دریا پار سے آنے والے مسافر سامان کے تھیلے لٹکائے، اِس پار آ کر اُترتے۔ بستی کے یہ لوگ عموماً ریاست کے نواحی شہروں اور قصبات سے اپنی دکانوں کے لیے خریداری کر کے آ رہے ہوتے۔ سَنگری حیران ہوتی کہ اِن مسافروں کے گھبرو تک بھی نہ صرف اُس سے بلکہ اُس کی سہیلیوں سے نگاہیں بچا کر گزر جاتے۔ ایسے میں اُسے ماں کی بات بہت یاد آتی کہ اگر تو سیدے کے حق میں نہ ہوتی تو جوان ہونے سے پہلے ہی اغوا ہو چکی ہوتی۔

سیدا اُسے ویسے تو اچھا لگتا تھا مگر اُس کے حق میں ہونا بالکل بھی اچھا نہیں۔ اُس کا جی

چاہتا کہ بستی کی باقی جوان لڑکیوں کی طرح اُسے بھی بستی کے گھبرو چھیڑیں، اُس کا راستہ روک کر آہیں بھریں، آتے جاتے مونڈھا مار کر سینے پر چٹکی کاٹیں یا چوتڑوں پر چپت مار دیا کریں کہ جو ہر دم تھل تھل لگائے رہتے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ اُس کے ساتھ نہیں ہو رہا تھا تو اِس کی وجہ محض اُس کا سیدے کے نکاح میں ہونا تھا۔ جب سنگری کی سہیلیاں اکیلے آتے جاتے واپسی پر اُسے تازہ ترین چھیڑ خوانی کی باتیں مرچ مسالے لگا کر سناتیں تو اُسے اپنے اور سیدے کے رشتے پر شدید جھنجلاہٹ ہوتی جس کا غصہ وہ اپنی ماں پر نکالتی۔

''اماں! مجھے اغوا ہونا ہے...... کیوں نہیں کرتا کوئی مجھے اغواء۔'' سنگری منہ بسور کر ماں کے گوڈے سے لگ جاتی۔ اُس کی ماں ناراض ہونے کے بجائے اُسے پیار سے اپنے پاس بٹھا کر بتانا شروع کرتی کہ اُس کی سینگیوں میں سے اب تک کون کون سی لڑکیاں اغوا ہو چکی ہیں جن کی کسی کو خبر بھی نہیں کہ اُن کے ساتھ ہوا کیا۔ کوئی کسی نزدیکی جاگیردار کے ہاتھ لگی اور کسی کو اُن کے مقامی کارندوں نے اُٹھا لیا۔ کسی کو ستلج پار کے بردہ فروشوں نے مالِ غنیمت جانا اور کوئی ملتان کے ٹھگوں کے ہتھے چڑھ گئی۔

''اور تمہیں پتا ہے کہ اغوا ہونے والی لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے؟''.....

''شادی ہو جاتی ہے اور کیا ہوتا ہے۔''

''شادی تو نصیب والیوں کی ہوتی ہے میری دھی..... نکالی ہوئی لڑکیاں ڈیرے پر رہیں تو رکھیل اور چکلے کو بیچ دی جائیں تو رنڈی۔ ساری زندگی جوتے کھاتے گزرتی ہے اور مر جائیں تو کفن بھی نصیب نہیں ہوتا۔'' ایسے موقع پر سنگری کی ماں اُسے کچھ اور بھی سینے میں دبکا لیتی۔

''مگر اماں! گھدی بھی تو نکال کے لایا تھا ماچھیوں کی چھوہر..... اُس نے تو نہیں بنایا رنڈی یا رکھیل بلکہ حق کر رکھا ہے۔'' سنگری پھدک کر ماں کے سامنے ہو بیٹھی۔

''نکالا نہیں چری گھدی نے اُسے بلکہ نس کے آئی ہے اِسی لیے تو کھانا ٹکا نا ملا ہوا ہے ورنہ اب تک نجانے کہاں کہاں بِک چکی ہوتی۔'' ماں کے ماتھے پر اب کے بَل پڑ گئے۔

''اماں! میں بھی نس جاؤں کسی کے ساتھ؟ بہت دل چاہتا ہے۔'' سنگری نے ماں سے

کہہ تو دیا مگر اُس کے ردعمل کے خوف سے کھلکھلاتی ہوئی اُٹھ کر اُس کی پہنچ سے دور جا کھڑی ہوئی۔

خلاف توقع ماں نہ تو کچھ بولی اور نہ ہی پھٹکارا بلکہ اُسے حیرت سے دیکھتے ہوئے اپنے آپ میں سُن ہو کر رہ گئی۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ لڑکی کہہ کیا رہی ہے۔ عجیب سے وسوسے، ہول بن کر اُس کے دل میں اُٹھنے لگے۔ ماں کا یوں ٹکٹکی باندھ کر اُسے متوحش نگاہوں سے دیکھنا سنگری کی ہنسی اُڑا کر لے گیا۔ سنگری کا دل چاہا کہ ماں سے پوچھے کہ ایسا کیا کہہ دیا ہے جو یوں عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھے جارہی ہے مگر اُس کی ہمت نہ پڑی اور وہ آنکھ بچا کر چلتی ہوئی گندم کے پڑولے کے پاس جا بیٹھی لیکن اُس کی ماں وہیں کی وہیں ششدر ہوئی بیٹھی رہی۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ لڑکی کس قسم کی خواہشات دل میں پالے پھر رہی ہے۔ اُسے سنگری کے مقدر کے لکھے سے خوف آنے لگا تھا۔ اِس سے پہلے کہ یہ لڑکی کچھ ایسا ویسا کر بیٹھے کیوں ناں اُسے مُکلا دینا چاہیے۔ لیکن کیا آج کل کے حالات میں سیدا اپنی کُنوار مُکلانے پر تیار بھی ہو جائے گا یا نہیں؟ یہ سوال بار بار سنگری کی ماں کے ذہن میں بچھو کے مارے چلا جارہا تھا مگر وہ سوائے اِس کی ٹیسیں برداشت کرنے کے اور کچھ نہیں کر پارہی تھی۔

# ۴

دریائے ستلج کے آدم واہن پتن کے جنوبی کنارے پر شام ہوتے ہی اِنڈس ویلی ریلوے کمپنی کے عملے کے کیمپوں میں مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ روشن ہو چکے تھے۔ نباتاتی تیل یا حیوانی چربی سے جلنے والے چراغوں کی روشنی اِن کے مقابل ادنیٰ ہونے کے سبب محض ٹمٹماتی یا تھرتھراتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ پیرافین یا کیروسین لیمپ کہلائے جانے والے یہ روشنی کے ہنڈے ریلوے کمپنی میں کام کرنے والے مقامی لوگوں کے لیے حیرت کا جہان تھے۔ اُن کے تئیں رات کو دن بنا دینے والے شیشے کے گھڑونچے جادوئی چراغ تھے جن سے وابستہ ہو چکی مفروضہ داستانیں اب اتنی بھی حیران کن نہیں رہی تھیں۔ پوہ کی سردیوں کے سبب صاحب بہادروں کے خیموں کے اطراف میں جنگلات سے کاٹی گئی لکڑیاں رات بھر جلائی جاتی رہتیں۔ آگ کے تسلسل کو باقی رکھنے اور اِس کی تپش پر اردگرد سے اکٹھے ہو جانے والے جانوروں کو بھگانے کے واسطے پہرے داروں کی نگرانی کا لمحہ بھر کے لیے بھی موقوف کیا جانا کمپنی انتظامیہ کے نزدیک قابلِ تعزیر فعل تھا۔ سو اُس شام بھی سورج غروب ہوتے ہی خیموں کے اطراف میں آگ جلانے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

کئی دنوں کے معمول سے ہٹ کر آج بڑے صاحب کا بیٹا ولیم آرتھر برنٹن بھی نہ صرف صبح سے یہیں موجود تھا بلکہ اب بھی انچارج سائٹ انجینئر کے خیمے کے باہر لگی چھتری کے نیچے

بھاری اوورکوٹ اور لانگ چرمی بوٹ پہنے آرام کرسی پر اس طرح نیم دراز تھا کہ جیسے کسی اگلے حکم کا منتظر ہو۔ جب کہ انچارج سائٹ انجینئر جم اُس کے سامنے نسبتاً مؤدب بیٹھا ہوا لکڑی کی فولڈنگ میز پر شام کے لوازمات لگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ویٹر نے سب سے آخر میں برانڈی کی بوتل رکھی تو ولیم کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ خود بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جم نے ایک انداز ے کے ساتھ شیشے کے دو پیگز میں برابر برابر برانڈی اُنڈیلی اور ولیم کو دعوت دینے والے انداز میں ایک اُس کے سامنے احتیاط سے رکھ دیا۔

ولیم نے پیگ اُٹھایا، اُس کی طرف عاشقانہ انداز میں دیکھا اور منہ سے کچھ بولے بنا جم کے سامنے چیئرز کے سے انداز میں لہرایا اور حریصانہ وار چڑھا گیا۔ جم نے ولیم کی طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے برانڈی کو ہلکا سا سپ کیا اور اِس طرح منہ بنایا کہ جیسے برانڈی کی تلخی اِس کی وجہ رہی ہو۔ ولیم نے جم کا منہ بگاڑنا جان لیا مگر منہ سے کچھ بولا نہیں۔ اِس وقت اُسے ایسا کرنے سے کچھ تعلق بھی نہیں تھا سو دوسرا پیگ بنانے کے لیے اُس نے خود ہی بوتل اُٹھالی۔ اُسے ہر قیمت پر اپنے اندر کے کھولاؤ کو ہزیمت کے دائرے سے نکال کر برداشت کی حدود میں لانا تھا۔ اُس کے بوتل خود اُٹھا لینے پر جم نے محض تصنع آمیز مسکراہٹ پر اکتفا کیا اور بدستور ہلکے ہلکے سپ لیتا رہا۔ وہ ولیم آرتھر کی اندرونی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

آج دن بھر کی معلق ذہنی کیفیت نے دونوں کو از حد تھکا دیا تھا۔ جان برنٹن کا گزشتہ کل کا فیصلہ ابھی تک موقع پر نافذ نہیں کا جا سکا تھا جس کی رو سے ستلج کے شمالی کنارے پر ریلوے لائن کو فورس کی مدد سے بستی کے قبرستان سے بہر صورت گزار کر دریا کے پتن پر واقع اُس مقام تک لایا جانا تھا جہاں سے ڈیزائن شدہ پُل کا بنایا جانا مقصود تھا۔ اگر چہ جان برنٹن کے فیصلے کی توثیق کمپنی میں اعلیٰ سطح پر ہو چکی تھی مگر بہاول پور کے ریذیڈنٹ مجسٹریٹ اور ملتان کے کمشنر بہادر نے اِس آپریشن کی حمایت کرنے اور فورس مہیا کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا ایسا کرنے سے نہ صرف مقامی آبادی اور حکمران کمپنی میں کدورتیں بڑھیں گی بلکہ یہ چھوٹا سا معاملہ ملک گیر سطح پر مسلمانوں کے جذبات مشتعل کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ اِس کے برعکس اِنڈس ریلوے کمپنی

کا چیف ریذیڈنٹ انجینئر ہونے کے ناتے جان برنٹن ریلوے لائن بچھانے کے اِس پراجیکٹ کو بہرصورت مقررہ مدت میں پورا کرنا چاہتا تھا کیونکہ اِس کی تکمیل کے ساتھ نہ صرف اُس کی برطانیہ واپسی مشروط تھی بلکہ کمپنی بھی اپنی موجودہ ہیئت میں ختم ہونے جارہی تھی۔

جان برنٹن اور ستلج کے دونوں کناروں کی مقامی انتظامیہ میں اختلافات تلخی کی حد سے گزرنے لگے تو معاملہ اوپر رپورٹ کر دیا گیا۔ دن بھر مزید احکامات کے لیے مسلسل انتظار کا سندیسہ جان برنٹن اور اُس کی ٹیم کے لیے جہاں سوہانِ روح تھا وہاں ہزیمت اور مایوسی کا باعث بھی سمجھا جارہا تھا۔ انڈس ریلوے کمپنی کی انتظامیہ کا خیال تھا کہ اگر نوآبادیاتی علاقوں میں اِس قدر اور اِس انداز میں نرمی برتی جاتی رہی تو سلطنتِ برطانیہ کے لیے حکومت چلانا مشکل ہو جائے گا۔ جان برنٹن خود بھی سارا دن تمام وسوسوں اور اندیشوں کے ساتھ یہ سوچ کر سائٹ آفس میں رہا کہ جوں ہی کسی قسم کا حکم موصول ہوگا، وہ اُسی وقت اُس پر عمل درآمد کو یقینی بنالے گا بہ صورتِ دیگر ممکن نہیں رہے گا کہ کوئی ایسا حکم نافذ کیا جاسکے جو مقامی آبادی کے لیے ناپسندیدہ ہو۔

گزرنے والا ہر لمحہ جان برنٹن کے لیے اپنی ٹیم کے ارکان کے ساتھ آنکھیں ملانا مشکل کیے جارہا تھا۔ جس اعتماد سے اُس نے گذشتہ روز طاقت کے استعمال کا فیصلہ کیا تھا وہی اعتماد ہی اصل میں اُس کی ٹیم کے ارکان کے لیے اخلاقی ڈھارس اور قوتِ نافذہ کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ معاملہ خاص طور پر اِس لیے بھی اہم تھا کہ اُس کی ٹیم کے جونیئر ارکان اور اُجرتی مزدور مقامی لوگوں میں سے تھے جو صرف انگریز سرکار کے دبدبے کے سبب کام کرنے کو تیار ہوئے تھے۔ اور اگر یہ دبدبہ ہی باقی نہیں رہتا تو اُسے اپنے کام کی تکمیل کے واسطے دستیاب انسانی وسائل کہاں سے مہیا ہوسکیں گے۔ اِس گنجلک ہو چکی صورتِ حال نے جان برنٹن کو اتنا مایوس کیا کہ وہ دن ڈھلنے سے پہلے ہی سائٹ آفس سے کمپنی کے ریسٹ ہاؤس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اُس نے اپنے بیٹے ولیم کو سمجھا دیا تھا کہ کس قسم کا حکم آئے تو کس طرح کا ردِعمل ظاہر کرنا ہے۔

جم نے پہلا پیگ ختم کیا تو ولیم آرتھر چوتھا پیگ حلق میں اُنڈیل چکا تھا۔ اب تک اُن کے مابین کسی ایک جملے کا تبادلہ بھی نہیں ہوا تھا لیکن جس طریقے سے وہ ایک دوسرے کی موجودگی کو

نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہے تھے اُس سے لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی ذہنی کیفیت سے بخوبی آگاہ ہیں مگر اُس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن اِس کے باوجود دونوں اپنی اپنی جگہ کسی ہونی انہونی کے مضمرات سے چپکے ہوئے تھے اور تمام تر سعی کے باوصف اِس ذہنی کیفیت سے نکل نہیں پا رہے تھے۔ برانڈی کے گھونٹ لینے کے بعد بھی سردی کی شدت کم نہ ہوئی تو جم نے ویٹر کو دریائی مچھلی کے آگ پر سینکے ہوئے قتلے لانے کو کہا۔ بے دھیانی سے آگ کے شعلوں کی لپک کو دیکھتے ہوئے ولیم نے چونک کر اِس طرح تحسین آمیز نگاہوں سے جم کی طرف دیکھا جیسے اُس نے اُس کی دلی کیفیت جان لی ہو۔

مچھلی کھاتے ہوئے بھی اُن کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی حتیٰ کہ رات کا پہلا پہر گزر گیا۔ خیموں کے گرد گھومتی ہوئی بیدار آگ کے درمیان اب اُنہیں وہیں بیٹھے بیٹھے اونگھ آنے لگی تھی۔ دونوں کے بٹلرز نے قریب جا کر اُنہیں سہارا دیتے ہوئے اپنے اپنے خیموں میں لے جانے کی کوشش کی مگر دونوں نے اسے نظر انداز کر کے بدستور وہیں بیٹھنے کو ترجیح دی مگر اپنے تئیں محتاط بٹلرز نے بہتر جانا کہ بھیڑ کی اُون کے بنے ہوئے ہلکے کمبل اُن کے زیریں بدن پر پھیلا دیے جائیں۔ رات کے آخری پہر کہیں جا کر اُن دونوں نے خیموں میں جانا مناسب سمجھا تو ڈیوٹی پر مامور بٹلرز، ویٹرز اور دیگر ملازمین کو بھی آنکھ لگانے کا موقع ملا۔ ایک عرصے کے بعد اِنڈس ریلوے کمپنی کے کسی سائٹ آفس میں رات یوں گزاری گئی کہ نہ تو کسی طرف چین تھا اور نہ ہی کسی کے واسطے قرار۔

صبح ہوئی تو ایک ایسی خبر نے ناشتے کی میز پر ولیم کا استقبال کیا جس کی نہ تو توقع کی جا رہی تھی اور نہ ہی انتظار۔ توقع تو یہ کی جا رہی تھی کہ ریلوے لائن بچھانے کے کام میں پیش رفت بارے میں کوئی اچھی خبر ملے گی مگر جو خبر ملی وہ یہ تھی کہ رات کے کسی پہر مایوس ہو چکے مقامی مزدور سائٹ آفس چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ بظاہر اُن کی نگاہ میں انگریز سرکار کا کروفر اور دبدبہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس غیر متوقع صورتِ حال میں ولیم اور جم پہلے تو اتنے ہراساں ہوئے کہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اُنہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ محض ایک چھوٹے سے فیصلے میں کی گئی تاخیر حکومت کی انتظامی

رٹ کو اِس بری طرح متاثر بھی کر سکتی ہے۔افسوس اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں دونوں نے اِدھر اُدھر دیکھا، شاید وہ کسی تاخیر سے قبل جان برنٹن کو خبر پہنچانے کی فکر میں تھے۔اگرچہ مزدوروں سمیت دیگر عملے کو سائٹ پر موجود رکھنے کی ذمے داری بنیادی طور پر سائٹ انجینئر جم کی تھی مگر ایسے میں جب کہ کسی بھی وقت سائٹ پر کام شروع کرنے کی کوئی بھی خبر آسکتی تھی، مزدوروں کا اجتماعی طور پر فرار ہو جانا سنڈی ریلوے کمپنی اور اُس کے باقی افسروں کے مقدر کو گہنا بھی سکتا تھا۔

مزدوروں کے فرار کی خبر ملتے ہی جان برنٹن بھی سائٹ پر پہنچ گیا۔اگرچہ ولیم اور جم اُسے کیمپ کے باہر ہی مل گئے مگر وہ تینوں آپس میں کچھ نہیں بولے۔جان کی آنکھوں میں سوال ضرور تھا مگر ولیم اور جم اپنی جھکی ہوئی آنکھوں اور خاموش لبوں کے سبب کوئی بھی جواب دینے سے قاصر تھے۔جان برنٹن تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سیدھا اپنے کیمپ میں گیا اور لکڑی کی بھاری بھر کم میز پر نصب شدہ مورس ٹیلی گراف مشین کو غور سے دیکھنے لگا جہاں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔اُس نے مایوس انداز میں کرسی گھسیٹی اور مشین کے سامنے اِس توقع کے ساتھ بیٹھ گیا کہ جیسے یہ ابھی ٹِک ٹِک کرنے لگے گی۔

اتنے میں اُس کا بیٹا ولیم بھی خیمے میں داخل ہوا اور ایک جانب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔جان برنٹن نے اُس کی آمد کا نوٹس لیے بغیر اپنی کرسی کو آگے گھسیٹا اور ٹیلی گراف مشین کے مختلف بٹنوں کو جنبش دے کر اُس کی کی (key) پر بار بار مختلف انداز میں دائیں ہاتھ کی انگلی سے کبھی ہلکی اور کبھی زوردار ضربات لگانے لگا۔اب کے وہ کسی اہم شخصیت کو واقعہ رپورٹ کرنے لگا تھا۔ پیغام ٹیلی گراف کرنے کے بعد جان برنٹن نے لمبی سانس لی اور سر کو کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔پھر نجانے کیا خیال آیا کہ پتلون کی جیب سے چھوٹی سی ہپ فلاسک نکالی اور شراب کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر اُسے میز پر پھینک دیا۔شاید وہ خالی ہو چکی تھی۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ٹیلی گراف مشین سے ٹِک ٹِک کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔جان برنٹن نے ہڑبڑا کر اپنی کہنیاں میز پر ٹکا دیں اور غور سے مشین سے آنے والی آوازوں کو سن کر کچھ لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ولیم بھی مشین سے نکلنے والی آوازوں کو سننے اور سمجھنے

کی پوری کوشش کررہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب مشین سے آوازیں آنا بند ہوئیں تو دونوں باپ بیٹے کے چہروں پر جھنجلاہٹ تھی۔ جان برنٹن نے نوٹس لینے والا کاغذ فرش پر پھینک دیا جسے ولیم نے لپک کر اُٹھالیا۔ بہت اہم شخصیت کے دفتر سے بھی اُسے اگلے احکامات کا انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔



# ۵



دریائے ستلج کے شمالی کنارے پر سیدے اور اُس کے اُسی بیاسی ساتھی گذشتہ تین راتوں سے مسلسل جگراتے میں تھے۔ کئی دنوں سے اُنہیں گورا حکومت کی جانب سے کسی اچانک حملے کا اندیشہ تھا مگر پوری تیاری کے باوجود جنوبی کنارے سے کوئی کارروائی ابھی تک سامنے نہیں آسکی تھی۔ دن ڈھلے وہ کبھی باری باری اونگھ لیتے مگر دن ڈھلتے ہی چوکس ہو جاتے۔ لیکن اِس کے باوجود تھکن اُن کے اعصاب کو مندھوڑے جا رہی تھی۔ سیدے نے اپنے لٹھ بردار ساتھی احتیاطاً بستی کے قدیمی قبرستان کی اُن تمام سمتوں میں پھیلا رکھے تھے جہاں جہاں سے ریلوے لائن گزرنے کے امکانات ہو سکتے تھے مگر تین دن گزرنے کے باوجود نہ تو کوئی کارروائی ہوئی اور نہ ہی لائن بچھانے کے کام کا آغاز۔ جنوبی کنارے پر ریلوے لائن بہاول پور پہنچ چکی تھی اور شمال میں ملتان سے آدم واہن ریلوے اسٹیشن تک بچھائی جا چکی تھی۔ اِن کے درمیان کے ٹکڑے میں کیا ہونا تھا اِس کا اندازہ لگانا کچھ اتنا بھی مشکل نہیں تھا مگر سیدے کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ گورے لاٹ صاحب کی حکومت اُس کے ارادوں سے خوف زدہ ہو چکی ہے مگر یہ خیال یقین میں منقلب نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایک دھڑکا سا تھا کہ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اُس کی جان بھی جا سکتی ہے۔

تیسری شام گہری ہونے کو آئی تو جنوبی کنارے پر لگائے گئے خیموں کے اطراف میں

لگی آگ دیکھ کر اُس کے ساتھیوں نے بھی دن بھر پھاوڑے سے پھاڑی گئی لکڑی کی تنومند چڑائھوں کو آگ دکھادی۔ خشک لکڑی جلی تو سردی ہوا ہوگئی۔ ایسے میں دریا کنارے کے باسیوں کے لیے مچھلی کے سوا کیا غذا ہوسکتی تھی مگر اُن کے لیے باجری کے ڈھوڈے اور سرسوں کا ساگ تڑکا کرلایا گیا تھا۔ سیدے نے اپنا کھانا ایک طرف رکھ دیا۔ اچانک ہی اُس کا دل ہول گیا۔ مرجانے کے خوف سے نہیں بلکہ ایک دم درآنے والے اندیشے سے کہ اُس کے مرنے کے بعد سنگری کا کیا ہوگا؟

''وہی ہوگا جو تمام جواں مرگ شوہروں کی بیواؤں کا ہوتا آیا ہے۔'' یہ خیال شاید اُس کے دل میں آیا تھا۔ ''میرا تو اُس سے مکلاوا ابھی نہیں ہوا۔ کنواری کی کنواری ہے وہ۔ کوئی اور اُس کے ملکوڑے وجود کو چھوئے گا، ورتے گا، چُس لے گا اُس کی اِسی بستی میں رہ کر اور وہ خود محض اِس بستی کے قبرستان کے لیے جان دینے جارہا تھا، چند وڈکوں کی قبروں کے لیے، اپنی جیتی جاگتی سوہنی سوڈھی منکوحہ کو چھوڑ کر۔'' سیدے کی آنکھوں میں آنسو ہی نہیں آئے بلکہ دل بھی مٹھی میں آگیا۔ اُس کا دل چاہا کہ لاٹ صاحب کو سات سلام کرے اور اُسے قبرستان سے ریلوے لائن گزارنے دے۔ وڈکوں کی بوسیدہ ہڈیوں کا کیا ہے، وہ تو یہاں سے نکال کر کہیں اور بھی مٹی میں دفن کی جاسکتی ہیں مگر سنگری تو کہیں اور نہیں ہوسکتی۔ ''کیا وہ اُسے کسی اور کی جسمانی چُس کے لیے چھوڑ دے گا؟ کیا کوئی اور اُسے اپنے ساتھ سُلائے گا، لپٹائے گا، چومے گا، چوسے گا، اُس کے چیکی مٹی جیسے وجود کی لذت اپنے اندر انڈیلتا رہے گا، اُس کے چسولے ماس کے بگوٹے لیتا رہے گا؟''

''تو کیا ہوگیا؟ یہ تو ہوتا آیا ہے، جو وجود ابھی تک اُس کا ہوا نہیں، اُس کے ساتھ مُکلایا نہیں، وہ کسی ایک کا کیا، لکھ ہزار کا ہوجائے تو اُسے کیا۔ وہ جو ان قبروں میں لیٹے ہیں، وہ تو اُس کے ماضی کا وجود ہیں، اُن کے ماس سے تو وہ کشید ہوا ہے، وہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ ہوتا۔ وہ اُن کے وجود کا رکھوالا ہے، اُن کی مٹی کا راکھا ہے، وہ مٹی جو اُس کی اپنی ہے، وہ مٹی جو اُس کے وجود کا تسلسل ہے، نہ کہ وہ جسم جو ابھی اُس کا ہونا ہے۔''

سیدے نے باجری کا ڈھوڈا اور ساگ اُٹھا کر ایک طرف رکھا ہی تھا کہ اُسے یوں لگا کہ جیسے سامنے سے سنگری آرہی ہو۔ اُس نے آنکھوں کو مچیڑ کر کئی بار سر جھٹکا۔ وہ سنگری ہی تھی۔ اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ پوہ کی گہری ہوتی ہوئی شام میں سرسوں کی پھندنی جیسی پیلی چولی اور سُرخ رنگ کی گھاگھری پہنے ہوئے۔ اُس کا چہرہ آزردہ اور آنکھوں کا کاجل آنسوؤں میں بھیگا ہوا۔ وہ سیدے کے انتہائی قریب آ گئی اتنی کہ اُس کے بدن سے اُٹھتی ہوئی جوانی کی مہک اُس کے نتھنوں میں بپھرے ہوئے بیل جیسی وحشت جگانے لگی۔ سیدے کو اپنی آنکھوں اور حواس پر یقین نہیں آرہا تھا کہ اُس کے حق میں ہونے کے باوجود کبھی اُس کی خبر نہ لینے والی سنگری آج کیسے اُس کے اتنے قریب چلی آئی۔

''سنا ہے تو مرنا چاہتا ہے گوروں کے ہاتھوں۔'' سنگری اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ سیدے نے اُس کے لہجے کی کڑواہٹ محسوس تو کی مگر اُس پر سنگری کے بدن کی خوشبو نے چڑھاوا چڑھا دیا۔ ایک لمبا سانس لیتے ہوئے سیدے نے سر اوپر کو اُٹھا کر آنکھیں موند لیں۔ اُس کا سینہ سانس اندر روکنے سے اور بھی کشادہ ہو چکا تھا مگر دل کے آس پاس کھد بد مچائے ایک عجیب سی گدگدی نے اُس کے ہونٹوں پر اِس طرح تبسم بکھیرا کہ وہ سانس باہر نکالنا بھلا بیٹھا۔

''تو کیا چاہتی ہے؟''

''مر جا.....'' سنگری ابھی تک پلکیں جھپکائے بغیر اُس کی طرف تکے جا رہی تھی۔

سیدے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا مگر منہ سے بولا کچھ نہیں۔

''تو نے مرنا ہی تھا تو مجھے حق میں کیوں لیا؟''

''میں نے کب لیا؟..... نہ تو نے مجھے حق میں لیا اور نہ میں نے تمہیں..... یہ تو اُن سے پوچھ جنہوں نے حق حقوق کا یہ کھیل کھیلا۔'' سیدے کی آنکھوں میں بے رحمانہ شرارت تھی۔ سنگری نے آنکھوں کی پُتلیاں سکیڑ کر سیدے کی آنکھوں کی گہرائی کو ماپا اور پھر ایک دم واپس جانے کے لیے مُڑی مگر سیدے نے لپک کر اُس کے بائیں بازو کو کلائی سے گرفت میں لے لیا۔ خلافِ توقع نہ تو سنگری کسمسائی اور نہ ہی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ سیدے کو یوں لگا جیسے وہ چاہ رہی ہو کہ

اُسے روک لیا جائے۔

''ایسے نہیں جانے دوں گا''...... سنگری کی پشت ابھی تک سیدے کی طرف تھی۔اُس نے دایاں بازو پکڑ کر سنگری کا چہرہ اپنی طرف گھما لیا جس پر یہ سوال پہلے سے لکھا تھا کہ کیوں نہیں جانے دو گے؟

''..... وہ اِس لیے کہ میں نے آج کا سچ دیکھنا ہے اور آج کا سچ یہ ہے کہ تو میرے حق میں ہے۔''

''تیرے حق میں ہوں تو مُکلا تا کیوں نہیں؟ کیا کسی اور کے لیے رکھا ہوا ہے مجھے؟''

اب کے سنگری اتنا اونچا بولی کہ اچھے بھلے فاصلے پر کھڑے ہوئے اُس کی ساتھی بھی مڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔خود سیدے کے گلے میں بھی جیسے کسی نے کوئی ہوئی سرخ مرچوں کا کٹورا اُنڈیل دیا تھا۔سنگری کے جملے کا دوسرا حصہ بھالا بن کر سیدھا اُس کے سینے میں جا گھسا تھا۔اُسے کچھ سمجھ نہ آئی تو اُلٹا ہاتھ سنگری کے منہ پر جڑ دیا۔ہاتھ اتنے زور سے پڑا کہ نہ صرف سنگری کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا بلکہ توازن بگڑنے کے سبب وہ نیچے جھاڑیوں میں جا گری۔

اِس اچانک پیدا ہو جانے والی صورتِ حال کے لیے وہ دونوں تیار نہیں تھے۔سنگری کو یوں پھٹے ہونٹ کے ساتھ جھاڑیوں میں گرا دیکھ کر سیدا بھی گھبرا گیا اور اُسے نیچے سے اُٹھانے کے لیے اُس کی طرف لپکا مگر اِس صدمے کے بعد در آنے والے طیش نے سنگری کے بدن میں کچھ اتنی قوت بھر دی کہ وہ خود ہی اُچھل کر کھڑی ہوئی؛ متذبذب، متلاشی اور بے یقینی کے سے انداز میں سیدے کو دیکھا اور تیزی سے بستی کو جانے والی پگڈنڈی پر پھیلے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔اندھیرے میں اندھیرا ہو جانے سے پہلے اُس کے چہرے سے صاف دِکھ رہا تھا کہ وہ رو تو نہیں رہی تھی مگر اِس کے باوجود دونوں آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے۔جاتے ہوئے اُس نے کچھ کہا تو نہیں تھا مگر یوں لگا کہ جیسے کہہ گئی ہو''سیدے اب تو بے شک مر جا۔''

سیدا کچھ دور تک تو سنگری کے پیچھے پیچھے بھاگا مگر جب وہ دکھائی دینی بند ہو گئی تو مضمحل اور پژمردہ سا واپس آ کر پرانی لکڑی کی مُنڈھی پر بیٹھ گیا۔اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ آج تک کسی

عورت کی طرف اُنگلی بھی نہ کھڑی کرنے والا سیدا کس طرح اپنی منکوحہ پر ہاتھ اُٹھا کر کیا کر بیٹھا ہے۔ گورا سرکار سے متھا لگا کر اُسے شاید یقین ہو چلا تھا کہ اب وہ کچھ دَم کا مہمان ہے، گورے اُسے چھوڑیں گے نہیں۔ تو کیا یقینی موت کے خوف نے اُسے اِس طرح اندر سے توڑ ڈالا تھا کہ وہ اپنی رِیتی کیتی سب کچھ بھلا کر عورت پر ہاتھ اُٹھا بیٹھا تھا؟ اور اگر یہ سب کچھ یوں نہیں تھا تو پھر کچھ اور کیا تھا؟

سیدے نے یہ سب سوچتے ہوئے سر کو اس انداز میں جھٹکا کہ جیسے پہلی بات کا منکر ہو رہا ہو؛ موت کے خوف والی بات کا۔ تو پھر یہ سب کیا تھا۔ شاید موت کی صورت سنگری سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کا خوف۔ اور اگر یہ بھی نہیں تو کیا کوئی ہزیمت یا شرمندگی کہ بچپن سے اُس کے نکاح میں رہنے والی یہ چھوہر سنگری، اُس کے مرنے کے بعد کسی اور کی رانوں کے نیچے ہوگی۔ شاید یہی شرمندگی خوف بن کر اندر و اندری اُس کے اعصاب کو رگیدے جا رہی تھی۔ نجانے کس مرحلے پر یہ خیال کیسے اُس کے ذہن میں گھر کر کے بیٹھ گیا کہ لوگ تو اپنی منگیتروں کو نہیں چھوڑتے اِس لیے کہ بعد میں وہ جب جب جس کسی کے ساتھ سوئیں گی تو اصل میں رسوائی تو پہلے منگیتر کی ہوگی۔ لیکن یہاں تو وہ خود اپنے شریک دشمنوں کو موقع دے رہا تھا کہ اُس کے بعد وہ آئیں اور اُس کی ایسی منکوحہ کے جسم کی چُس لیں جس پر پورا حق ہوتے ہوئے بھی اُس نے اُسے چھوا تک نہیں تھا۔ تو کیا کرے وہ؟ گوروں کے راستے سے ہٹ جانا بھی تو نہ صرف بزدلی تھی بلکہ اپنے وَڈکوں سے بے وفائی تھی، غداری تھی۔

تو پھر کیا ہو؟

سیدے نے سر اُٹھا کر دریا کے پار نظر دوڑائی۔ دوسری طرف جنوبی کنارے پر گوروں کے خیموں کے باہر نصب تیز چمکیلی روشنیاں روشن ہو چکی تھیں۔ اِن روشنیوں کے اطراف میں آگ کے جلتے ہوئے الاؤ اِس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ گورا فورس یہیں کہیں آس پاس موجود ہے۔ اُس کا دل بیٹھ گیا۔ یوں لگا کہ اب یہ لائن اُس کے آبائی قبرستان یا اُس کے وَڈکوں کی ہڈیوں پر سے نہیں بلکہ اُس کی لاش پر سے گزرنے والی تھی۔ سیدے نے سخت سردی کے باوجود

اپنے ماتھے پر نمودار ہونے والے پسینے کے قطرے اپنی قمیص کی آستین سے پونچھ لیے۔ دریا کے اُس پار روشن ہو چکی آگ کہیں اُس کے اندر جل اُٹھی تھی اور تیز چمکدار روشنیاں فاصلے کے ہوتے ہوئے بھی اُسے پسینو پسینے کیے جا رہی تھیں۔

اُس نے اپنے جسم پر نگاہ ڈالی۔ گھور اندھیرے میں وہ اُسے کسی ٹھنڈی لاش کی طرح محسوس ہوا۔ ماتھے سے اُبھرنے والے پسینے کے قطرے بھی یخ بستہ ہونے لگے تھے۔ لاش ہو جانے کے تصور ہی سے سیدے نے جھرجھری لی۔ ایک خیال کوندے کی طرح اُس کے ذہن میں لپکا۔

''کیوں ناں گوروں کے حملے سے پہلے ہی سنگری کو مُکلا کر گھر والی بنالیا جائے؟''

اُس نے تصور ہی تصور میں خود کو دولہا بنا محسوس کیا۔ چاروں طرف بکھرے ہوئے سُرخ پھولوں کے درمیان سنگری کے ساتھ چہلیں کرتا ہوا۔ مگر یہ کیا کہ معاً اُسے پھولوں کے درمیان سُرخ رنگ کا گاڑھا محلول بہتا ہوا دکھائی دیا۔ سیدے نے گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھ بدن پر پھیرے تو وہ دونوں خون میں لتھڑے ہوئے محسوس ہوئے۔ اُس کے جسم میں جگہ جگہ سوراخ ہو چکے تھے جن سے خون فوارے کی مانند اُچھل اُچھل کر دھاروں کی صورت باہر زمین پر گر رہا تھا۔ سیدے کو چکر سے آ گئے مگر وہ پورے بدن کا زور لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ٹانگوں میں جان عنقا ہوئی تو خود کو سنبھالنے کی نیت سے وہ پھر سے لکڑی کی مُنڈھی پر بیٹھ گیا۔ بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر اُس نے اپنے اطراف کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سُرخ پھول اور نہ ہی اُن کے درمیان بہتا ہوا اُس کا خون۔ اُس نے پھر سے گھبراہٹ میں بدن پر ہاتھ پھیرا۔ اب کے وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ نہ وہ دولہا بنا ہوا تھا نہ ہی سنگری دلہن اور نہ ہی اُس کے جسم میں ہو چکے سوراخوں سے خون بہہ رہا تھا۔ سیدے کو لگا کہ اُسے کوئی سایہ ہو گیا ہے۔ سائے کے تصور ہی سے اُس کا جسم پسینہ اُگلنے لگا۔ دور دور تک تاریکی میں کہیں کہیں مشعلیں اُٹھائے اُس کے ساتھی بار بار اُس کے قریب آنے کی کوشش میں تھے مگر پھر بھی قریب آ کوئی نہیں رہا تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بدستور سکوت طاری تھا لیکن خیموں کے اطراف میں لگائی گئی آگ کے شعلے بار بار نئی لکڑیاں ڈالنے کے

سب بجھنے سے پہلے پھر جل اُٹھتے تھے۔ سیدے نے اپنے سَر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر پھر سے سکون کرنے کی کوشش میں آنکھیں موندلیں اور مُنڈھی پر نیم دراز ہو گیا لیکن اُس کے اندر کوئی پوری شدت سے چیخے چلا جا رہا تھا۔

''بس بہت ہو چکا..... آخر کو یہ گورا لاٹ صاحب اُس پر حملہ کیوں نہیں کرتا.... کیوں نہیں مار دیا جاتا اُسے ...... آخر کیوں؟ کب تک یوں ہی لٹکائے رکھنا ہے، کب تک؟''



# ۶

ریلوے لائن بچھانے کا کام دس دن سے معلق تھا۔ چھوٹے عملے سے لے کر چیف ریذیڈنٹ انجینئر جان برنٹن تک سبھی شدید بددِلی کا شکار ہو چکے تھے جس کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب کام بند ہونے کے تیسرے روز مقامی مزدوروں نے راہِ فرار اختیار کی۔ معاملہ اوپر رپورٹ ہونے کے بعد مجموعی تاثر یہی تھا کہ حکومت اپنی رِٹ منوانے کے لیے اُنہیں مثالی سزا دے گی مگر اتنا بڑا واقعہ ہو جانے کے باوجود مقامی انتظامیہ کی خاموشی یہی امکان ظاہر کیے جا رہی تھی کہ شاید حکومتی صفوں میں موجود کوئی طاقت ور افسروں کا گروپ نہیں چاہتا کہ انڈس ویلی ریلوے کمپنی کوٹری اور ملتان کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کا کام کامیابی سے سرانجام دے سکے۔ وگرنہ کیسے ممکن تھا کہ انتظامی لحاظ سے انتہائی حساس مقامات سے ریلوے لائن گزار کر بہاول پور تک پہنچ جانے والی کمپنی بستی آدم واہن کے مٹھی بھر شرپسندوں کے سامنے یوں ہتھیار پھینک کر بیٹھ جائے۔ یہ خیال بھی جان برنٹن کا تھا کہ ریاست بہاول پور کی حدود ختم ہو جانے کے فوری بعد دریائے ستلج کے شمالی کنارے سے اِس قسم کی مزاحمت کا اچانک سامنے آ جانا مقامی روٴسا کی سازش بھی ہو سکتی تھی کہ جنہوں نے انگریز انتظامیہ کو کسی بدانتظامی کے خوف میں مبتلا کر رکھا ہو۔

کام معطل ہونے کے ابتدائی دنوں میں تو جان برنٹن نے خاموشی اختیار کیے رکھی مگر روزانہ صبح معمولاً منعقد ہونے والی میٹنگز میں اب وہ بڑبڑانے سے بولنے پر آ گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی

ایسی سازش ہے۔ جس کے تحت کچھ بااثر لوگ نہیں چاہتے کہ کراچی کی بندرگاہ کو لاہور کی منڈیوں تک ٹرین جیسی جدید اور تیز رفتار بار برداری کے ذریعے کی رسائی دی جائے۔ ایک خیال یہ بھی زیر بحث رہتا تھا کہ مقامی انتظامیہ میں کچھ لوگ ضرور ایسے ہیں جو نہیں چاہتے کہ یہ کام اِنڈس ویلی ریلوے مکمل کرے۔ اِس کے پس منظر میں اِنڈس ویلی کی کسی مخالف ریلوے کمپنی کا ہاتھ بھی ہو سکتا تھا۔ بہر حال یہ سازش تھی یا کاروباری مخالفت، امر واقعہ یہ تھا کہ ریلوے ٹریک بچھائے جانے کا کام ٹھپ پڑا تھا۔ روزانہ یادداشت کے لیے دی جانے والی ٹیلی گرافک استدعا پر روزانہ وہی ایک سا جواب کہ اگلے حکم کا انتظار کریں۔ غالباً ہفتہ گزر جانے کے بعد تو جان برنٹن کو اِس بات سے بھی منع کر دیا گیا کہ روزانہ محض یادداشت کے لیے دیے جانے والے ٹیلی گراف سے بھی احتراض کیا جائے۔

اِس ساری مایوس کن صورتِ حال کے باوجود ولیم اور جم دونوں پر امید تھے۔ وہ جان برنٹن کے اِن خدشات کے بھی مخالف تھے کہ ریلوے ٹریک بچھائے جانے کا کام کسی سازش یا کاروباری رقابت کے تحت معطل رکھا جا رہا ہے۔ اِس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُن کا کوئی اپنا مخبری کا ذریعہ تھا بلکہ بات اتنی سی تھی کہ جم گذشتہ بیس برسوں سے انڈیا آیا ہوا تھا۔ اُس نے یہاں کا کلچر، خاص طور پر مذہبی کلچر، تاریخ اور رسوم و رواج کے بارے میں تفصیل سے نہ صرف پڑھ رکھا تھا بلکہ سر ہنری لارنس کی اُس ٹیم کا حصہ بھی رہا تھا جس نے 1851ء میں افغان بارڈر پر تپ دق میں مبتلا ہونے والے گورے فوجیوں کے لیے مری کے مقام پر سینی ٹوریم قائم کیا تھا جو دو سال بعد 1853ء میں مری ٹاؤن بنا۔ مری کی گلیات میں سڑکیں بناتے ہوئے جم بھی جان گیا کہ یہاں کے لوگ لاشوں کی حرمت کا خیال رکھیں نہ رکھیں مگر اپنے قبرستانوں کی حرمت پر مر مٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں یہ کسی مذہبی بات پر حاکم وقت کے خلاف اکٹھے ہو جائیں تو انہیں اپنی بات سے ہٹانا ممکن نہیں رہ جاتا۔

ولیم اگرچہ جم کی باتوں سے اختلاف نہیں رکھتا تھا مگر اتنی جرات بھی نہیں تھی کہ اپنے باپ کو سمجھا سکتا کہ مقامی گوری انتظامیہ کی نیت پر شبہ نہ کیا جائے۔ لیکن کبھی کبھی وہ خود بھی تشکیک کا

شکار ہو جاتا کہ اگر ملتان کمشنری کی انتظامیہ کی نیت ٹھیک ہے تو اُن کے مراسلوں کا جواب کیوں نہیں دیا جا رہا؟ ہر مسئلے اور معاملہ کا ایک ہی جواب کیوں کہ انتظار کیا جائے؟ سائٹ سے فرار ہو جانے والے مزدوروں کی فہرستیں اگر چہ انتظامیہ کو بھجوائی جا چکی تھیں مگر کچھ پتا نہیں تھا کہ اُن کا کیا بنا۔ انتظامیہ کے اس رویے کے سبب باقی ماندہ مقامی لوگوں کو سنبھال کر رکھنا بھی مشکل تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

یہ اِسی مایوسی کا اثر تھا کہ جہاں ماتحت عملے میں بات بات پر تلخی اور جھگڑے روز کا معمول بنتے چلے جا رہے تھے وہاں ایک روز وہ ہو گیا جو اُن دنوں عموماً نہیں ہوا کرتا تھا۔ سروے ٹیم کے دو جونیئر آفیسروں نے کیمپ کے اطراف میں معمول کی گشت کے دوران عقبی سمت سے گزرنے والی ایک نوجوان لڑکی کو زبردستی اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور پھر قریبی جھاڑیوں میں جنسی تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد وہیں پھینک کر چلے گئے۔ لڑکی ستلج کے جنوبی کنارے پر بیٹھے پکھی واسوں کی تھی۔ اگر چہ گورے آفیسروں نے لڑکی کو زبان بند رکھنے کی دھمکی دے کر اُس کے پاس کچھ نقد رقم بھی پھینک دی تھی مگر لڑکی نے اپنی جھگی میں جا کر جو بیتی تھی، سب سُنا دی۔ کسی ریلوے کمپنی کے سائٹ آفس کے باہر پہلی بار ایسا ہوا کہ علاقے کے سبھی پکھی واس گھرانوں نے نہ صرف گھیراؤ کیا بلکہ وہیں دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔

سائٹ آفس کا انچارج ہونے کے ناتے جم پر ذمے داری تھی کہ وہ اِس مسئلے کا کوئی حل نکالتا۔ سُو اُس نے گیٹ کے ریکارڈ سے معلوم کر لیا کہ اُس وقت کہ جب لڑکی جنسی زیادتی کا نشانہ بنی کون کون لوگ کیمپ آفس سے باہر تھے۔ ریکارڈ کے مطابق اُس مخصوص وقت میں چار جونیئر آفیسرز کیمپ سے باہر نکلے تھے۔ دائیں جانب جانے والے دونوں گھڑ سوار جیکب اور بُش تھے جب کہ بائیں جانب کہ جس کے عقب میں یہ واقعہ پیش آیا ڈیوڈ اور ایبٹ گئے تھے۔ لہٰذا طے پایا کہ ڈیوڈ اور ایبٹ کو جم کے خیمے میں بٹھا کر لڑکی کو اپنے والد کے ہمراہ اندر بلایا جائے تا کہ وہ شناخت کر سکے۔ اگر چہ جان برنٹن کا سائٹ آفس کے انتظامی معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اس خبر کے ملتے ہی ریلوے کمپنی کا سینئر آفیسر ہونے کے ناتے اُس نے جم کے پاس جا کر احتجاج

کیا اور اُسے کسی بھی قسم کی تادیبی کارروائی سے باز رہنے کی تنبیہ کی۔ جم نے جان برنٹن کی پوری بات سُنی اور پھر اُسے اَن سُنی کر دیا۔ اُس کے نزدیک شناخت ہو جانے کے بعد اِن جونیئر آفیسروں کے خلاف انضباطی کارروائی نہ کرنا دیگر ملازمین کو اِس قسم کے جرائم کی رغبت دلانے کے مترادف تھا۔

لیکن جان برنٹن کا خیال یہ تھا کہ اِن حالات میں کہ جب دریا کے شمالی کنارے کی ایک چھوٹی سی آبادی نے نہ صرف ریلوے لائن بچھائے جانے والے اہم ترین منصوبے کو روکا ہوا تھا بلکہ براہ راست تاج برطانیہ کے مفادات کو للکار رکھا تھا، اپنے ہی گورے آفیسروں کو سزا کے عمل سے گزارنا ایسے ہی سے تھا کہ جیسے اپنی حکومت کی رِٹ کو خود ہی پاؤں تلے روند دیا جائے۔ اِس سے بڑھ کر کون سا ایسا فعل ہو سکتا تھا کہ جو باغیوں کی بغاوت کو اور بڑھاوا دے اور اپنے لوگوں میں مایوسی پھیلائے خاص طور پر اُس وقت جب کہ مقامی مزدور پہلے ہی تادیبی کارروائی کی پروا نہ کرتے ہوئے کیمپ سے فرار ہو چکے تھے۔ ولیم اور کچھ اور جونیئر آفیسروں کا بھی یہی خیال تھا کہ لڑکی کو خیمے میں بلا کر ڈیوڈ اور ایبٹ کی شناخت کرانا اُن کی تذلیل کے مترادف تھا۔ اِن کے مطابق کوئی درمیانی راہ نکالنا مناسب تھا کہ کچھ دے دلا کر اور کچھ دھمکی اور تڑی سے انہیں دھرنا ختم کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔

لیکن جم کسی طور بھی اپنی بات سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ اُس کے مطابق وہ سائٹ آفس کا انچارج تھا اور وہ بہتر جانتا تھا کہ اِس صورتِ حال سے کیسے نکلنا ہے۔ اُس کے نزدیک جان برنٹن اور اُس کی ٹیم صرف ریلوے لائن بچھانے کی حد تک اختیارات رکھتے تھے لیکن اِس کے واسطے انتظام و انصرام اور انضباطی معاملات سے نپٹنا خالصتاً اُس کا شعبہ تھا۔ جم نے لڑکی اور اُس کے باپ کو کیمپ کے اندر بلانے کے لیے ہرکارے باہر بھجوا دیے لیکن انہوں نے اندر آنے سے انکار کر دیا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ قصوروار افسروں کو اُن کے سامنے ہی داروغہ کے حوالے لیا جائے۔ ورنہ وہ دھرنا ختم کرنے کو تیار نہیں۔ ایسے میں اُسے اطلاع ملی کہ جان برنٹن کمپنی کے ہیڈ آفس میں تمام واقعہ بذریعہ ٹیلی گراف رپورٹ کر چکا ہے جس کے بعد استفسار کا واپسی تار اُس کے لیے بھی

موصول ہو چکا تھا۔ جم نے اپنا موقف بھی ہیڈ آفس بھجوا دیا۔ اب کے اُسے انتظار کرنے کا نہیں بلکہ قصوروار افسروں کی شناخت کو یقینی بنانے اور ضوابط پر عمل کرنے کا کہہ دیا گیا تھا۔

ہیڈ آفس کو بھجوائی گئی جان برنٹن کی تار اُلٹا جم کے واسطے ڈھارس کا باعث بنی تو اُس نے ایک قدم آگے جا کر ایک اور خطرناک فیصلہ کر لیا۔ اب وہ دونوں افسروں کو شناخت کے واسطے باہر لے جانا چاہ رہا تھا۔ جان برنٹن کو اطلاع ملی تو وہ ایک بار پھر خیمے سے باہر نکلا اور تمام تر تناؤ کی کیفیت کے باوجود جم کے روبرو چلا آیا۔ اُس نے ٹھنڈے لہجے میں جم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ایسا کرنے سے باز رہے کیونکہ اپنے افسروں کو مشتعل ہجوم کے سامنے پیش کرنا اُن کی زندگی سے کھلواڑ کے مترادف تھا۔ باہر وہ سبھی کچھ ہو سکتا تھا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جان برنٹن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اپنے افسروں کو مقامی جانوروں کے سامنے شناخت کے لیے پیش کرنا سیدھا سیدھا اُن کے قتل عمد کا اقدام تھا اور جم کو اِس کی اجازت قطعی نہیں دی جا سکتی تھی۔

جم اب بھی کسی صورت اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ اُس نے جان برنٹن کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور اُسے اپنا کام کرنے دے۔ جم کی یہ بات سنتے ہی جان برنٹن زور سے چلایا کہ ایک پاگل ہو چکے آدمی کو مزید پاگل پن کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ولیم اور کچھ دیگر افسر بھی جان برنٹن کے ساتھ جا کر کھڑے ہو گئے مگر ہر کوئی حواس باختہ تھا کہ اِس صورتِ حال میں کریں بھی تو کیا کریں۔ کس کا ساتھ دیں۔ جان برنٹن کے کھولاؤ کی پروا کیے بغیر جم خیمے میں گیا اور دونوں افسروں ڈیوڈ اور ایبٹ کو باہر نکال لایا کہ جن کے ہاتھ، ہتھ کڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اُن کے چہروں پر بے اندازہ پریشانی تھی اور وہ دونوں ترحم آمیز نگاہوں سے جان برنٹن کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا پاگل پن ہے جم! کیا تم نہیں جانتے کہ وہ وحشی لوگ انہیں جان سے مار دیں گے؟''

''میں جانتا ہوں کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں..... آپ مجھے میری ڈیوٹی کرنے دیں۔'' جم اُن دونوں افسروں کو مین گیٹ کی جانب کھینچتا ہوا نہایت ادب سے بولا۔

''مگر تمہاری ڈیوٹی تاج برطانیہ کے مفاد میں مزاحم ہو رہی ہے۔'' جان برنٹن بدستور تحکمانہ لہجے میں زور سے چلا کر بات کر رہا تھا۔ اب کے جم نے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور انہیں گیٹ کی جانب کھینچتا رہا جب کہ دونوں افسر پورے جسم کا زور لگا رہے تھے کہ باہر نہ جانے پائیں۔ کچھ دیر پہلے تک اُن کے چہرے پر موجود اُمید اب مایوسی میں ڈھلنی لگی تھی۔ وہ جان چکے تھے کہ جان برنٹن سمیت کوئی بھی سینئر یا جونیئر آفیسر جم کے ارادوں میں عملی رکاوٹ بننے کو تیار نہیں۔ اُن دونوں نے بھی ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا اور فوری طور پر ایک فیصلہ کر لیا؛ اقبالِ جرم کا فیصلہ۔

جم نے دونوں کی زبان سے ایک ساتھ جرم قبول کیے جانے کی بات سُنی تو ششدر ہو کر وہیں ٹھہر گیا۔ ہتھکڑیوں پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن دونوں کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ ڈیوڈ اور ایبٹ نے شرمسار نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ جان برنٹن، ولیم اور دوسرے لوگوں کے چہرے پر غصے کا تناؤ ایک دم ہزیمت کے ڈھیلے پن میں بدل گیا کہ جیسے انہیں اُن دونوں سے یہ توقع نہ رہی ہو۔ جم نے حیرت اور بدگمانی کی ملی جلی کیفیت سے جانب برنٹن کی طرف دیکھا مگر اُس نے جم سے نگاہیں چرا لیں۔ جم اُن دونوں کو ڈھیلی پڑی گرفت کے ساتھ واپس خیمے میں لے آیا۔ اب شناخت کی کارروائی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ قصورواروں نے اپنے آپ ہی کو نہیں اپنے قصور کو بھی پہچان لیا تھا۔

خیمے میں لا کر جم نے پہلا کام یہ کیا کہ اُن دونوں کے سامنے کاغذ اور قلم رکھ دیے اقبالی بیان اپنے ہاتھ ہی سے لکھ کر دینے کے لیے اور اِس دوران ہی ہیڈ آفس کو مختصر سی رپورٹ ٹیلی گراف کی صورت بھجوا دی۔ ڈیوڈ اور ایبٹ کے اقبالی بیان ہاتھ میں آتے ہی اُس نے ٹیلی گراف ہی سے بہاول پور کے داروغے کو بلا بھیجا۔

جم کے خیمے میں کافی دیر تک خاموشی رہی۔ قریباً دو گھنٹے کے بعد داروغے کی آمد کی اطلاع ہوئی تو جم نے اُن دونوں کی ہتھکڑی کھول دی۔ ''اگر تاج برطانیہ کی توقیر راہ میں حائل نہ ہوتی تو میں تمہیں وہی سزا دلواتا کہ جو اِس جرم کے لیے ایک عام برطانوی شہری کو دی جاتی ہے۔

مگر اب میں تمہیں باہر دھرنا دیے لوگوں کے سامنے داروغے کے حوالے کروں گا اُس کو کچھ بتائے بغیر اِس لیے کہ وہ تمہیں بحفاظت ہمارے بہاول پور کے ریجنل آفس میں پہنچا دے اور تم وہاں سے کراچی اور پھر لندن واپس جا سکو۔ اب اپنے آپ کو کمپنی کی ملازمت سے ڈِسمس سمجھو۔ تحریری حکم تمہارے گھروں کے پتے پر ارسال کر دیا جائے گا۔''

کچھ دیر بعد کمپنی کے سائٹ آفس کے مین گیٹ کے باہر کھڑا ہوا داروغہ علیحدہ علیحدہ گھوڑوں پر ڈیوڈ اور ایبٹ کو لے کر روانہ ہوا تو دھرنا دیے ہوئے بستی والوں نے اُنہیں گرفتار سمجھ کر انگریز سرکار کے انصاف کی ستائش میں فلک شگاف نعرے بلند کیے اور راضی خوشی وہاں سے اپنی اپنی جھگیوں کو چل دیے۔ کچھ دیر تک وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سائٹ آفس کی اندرونی دیوار کے ساتھ بوجھل دل اور نم ناک آنکھوں کے ساتھ کھڑے جم کی پشت کو جان برنٹن نے ایک گونہ محبت سے تھپتھپایا اور ہولے سے بولا ''جم! تم واقعی ایک بہترین منتظم ہو۔''

# ۷

بستی آدم واہن کے آسمان پر تنے ہوئے تناؤ کو بیس دن گزر چکے تھے۔ کہیں سے کچھ خبر نہیں آ رہی تھی کہ گورا سرکار کے بستی کے قدیمی قبرستان سے ریلوے لائن گزار کر اُسے آدم واہن ریلوے اسٹیشن تک پہنچانے کے منصوبے کا کیا ہوا۔ دریا پر پُل بنانے کا تعمیراتی سامان بھی دونوں کناروں پر اونچے اونچے ڈھیروں کی صورت موجود تھا مگر دریا میں پانی بہت کم ہو جانے کے باوجود کسی جگہ بھی کسی ستون کے لیے کھدائی یا اُن کی بنیادیں بھرنے کا کام بھی شروع نہیں ہو سکا تھا۔ بستی کے بڑے بوڑھے بھی اِس بات پر حیران تھے کہ ماگھ کا دوسرا پندرھواڑا شروع ہو چکا تھا اور اُس کے بعد پھاگن کا مہینہ گزار کر چیت میں دریا میں پانی بھرنا شروع ہو گیا تو پُل کیسے بن پائے گا؟ اتنی بات تو سبھی جانتے تھے کہ پُل بنانے کے واسطے پوہ ماگھ جیسا موسم چاہیے ہوتا ہے کہ جب دریاؤں میں پانی کم سے کم ہوتا ہے۔

اکثریت کا خیال تھا کہ گورا سرکار بستی کے جوانوں میں پھیل جانے والی بغاوت سے پریشان ہو کر اپنا منصوبہ تبدیل کرنے جا رہی تھی لیکن کچھ کا خیال یہ بھی تھا کہ سرکار سیدے جیسے باغیوں کو وقت دینا چاہتی ہے کہ وہ اپنے ارادوں سے باز آ جائیں۔ کئی دور کی کوڑی لانے والے گورا سرکار کے ارادوں کو پیر زندہ کرامت کے عرس کی تاریخ سے جوڑے ہوئے تھے کہ جو اُب کے برس ماگھ کے تیسرے جمعے کو شروع ہونا تھا۔ اگرچہ پیر زندہ کرامت کا نہ تو بستی میں کوئی مزار تھا اور

نہ کوئی اور آثار یا یادگار مگر اِس کے باوجود قرب وجوار کے شہروں کے علاوہ ملتان تک سے اُن کے عقیدت مند دریا کے شمالی کنارے کے پتن پر جمع ہوتے، نذر نیاز دی جاتی، قوالیوں کی محفلیں ہوتیں، نٹ اپنے تماشے دکھاتے، کشتی جوانوں کا جوڑ پڑتا، گسنی پکڑنے کے مقابلے ہوتے اور پھر تیسرے روز سورج غروب ہوتے وقت پتن میں مومی پھول بہائے جانے کے بعد اجتماعی دعا کرائی جاتی اور یوں عرس کی تقریبات اختتام پذیر ہوتیں۔

پیر زندہ کرامت، دریائے ستلج کے زیریں بہاؤ سے جڑے علاقوں میں ایک زندہ روایت کے طور پر لوگوں کی عقیدت میں راسخ مقام کے حامل تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ایک بار اِس علاقے میں عجیب قسم کا قحط پڑا۔ زمینوں نے پیداوار دینی بند کر دی اِس طرح کہ ہر بھری فصلیں اناج سے خالی ہوگئیں، باغات کو پھل کیا لگنا تھا پھول تک نہ لگے، دریا میں پانی تو تھا مگر مچھلیاں نہ رہیں اور عورتیں گبھن تو ہوتیں مگر حمل گر جاتا۔ وَڈکوں نے بتایا کہ یہ سب اُن کے گناہوں کے سبب ہے۔ لہٰذا صدقہ خیرات اور توبہ معافی کا بہت دور چلا مگر حالات جوں کے توں رہے۔ حالت نقل مکانی تک آ گئی لیکن جاتے تو جاتے کہاں۔ جہاں جہاں تک ستلج بہہ رہا تھا یہی صورتِ حال تھی۔ کسی نے کہا کہ کڑوے کنوئیں کا پانی دریا میں اُنڈیلو تو اُنڈیل دیا، کسی نے کہا کہ سات کنواری لڑکیاں سات دن الف ننگی دریا میں نہائیں تو یہ ٹونہ بھی کر لیا مگر سب کچھ ویسے کا ویسے۔ اُلٹا کئی حرامیوں کی بُنڈ کُٹائی جھونگے میں ہوگئی کہ جو اِن باکرہ دوشیزاؤں کو نہاتے ہوئے تاڑنے کے واسطے اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں چھپ جایا کرتے تھے۔ اُن کا ردِعمل یہ تھا کہ لڑکیوں کا انتخاب غلط ہوا ہے اِن میں سے کئی تو باکرہ ہی نہیں بلکہ اَنواسی تھیں۔ معاملہ بہت نازک تھا۔ تنازعے کی نوعیت میں مکاشفات دخیل ہوئے تو اِس ٹونے ہی کو موقوف کرنا پڑا۔

انہی دنوں چرچا ہوا کہ ایک بزرگ نورانی صورت پتن پر اُترے اور پھر وہیں پڑاؤ ڈال لیا۔ کھانا نہ پینا اور نہ کسی سے بول چال۔ جب بھی دیکھا گیا وہی ایک سا عالمِ استغراق، آلتی پالتی مارے بیٹھے سیس نوائے، ہاتھ میں موٹے دانوں کی تسبیح برابر گھومتی ہوئی۔ مگر کوئی لوبھ نہ لالچ، نہ کسی کے آنے کی خبر نہ جانے کا پتا۔ بستی والے جاتے، اُن کے اردگرد بیٹھے رہتے اور پھر بیٹھ بیٹھ کر

اُٹھ آتے۔ کچھ کے نزدیک یہ کسی علم کے حصول کے لیے چلہ کشی تھی اور کچھ کے تئیں کسی ناکام عاشق کی اپنے محبوب کو پانے کی جستجو۔ مگر معاملہ جو بھی رہا ہوا کثریت کو خدشہ یہ تھا کہ کہیں وہ بھوک پیاس کے سبب جہان ہی سے نہ گزر جائے۔ لہٰذا کچھ نرم دِل بیبیاں کھانا بنا کر اُن کے پاس رکھ آتیں جو اگلے دن تک ویسے کا ویسا رکھا رہتا۔ لقمہ تک ٹوٹا ہوا نہ ملتا۔ کسی نے کبھی ہاتھ سے کھلانے کی کوشش کی تو جواب دیا اور نہ آنکھ کھولی۔ اب جس کا کام اور نام دونوں معلوم نہ ہوں تو خلقِ خدا اپنی طرف سے اُس کے لیے کام ڈھونڈ بھی لیتی ہے اور نام بھی گھڑ لیتی ہے۔ سُو یہاں بھی یہی ہو رہا تھا، جتنے منہ اُتنے نام اور اُتنے کام۔

غالباً ساتواں روز تھا اُس مردِ بزرگ کو چلہ کشی پر آئے ہوئے کہ جب شام ڈھلے سورج غروب ہونے سے پہلے بستی کے لوگ وہاں آنے شروع ہوئے تو پتن خالی پڑا تھا۔ جو لوگ پہلے سے وہاں دوسرے کنارے سے آ کر اُترے تھے وہ بھی کوئی بات یقین سے نہیں کر پا رہے تھے، بس یہی کہ ابھی تو اِدھر ہی تھے نجانے کہاں گئے؟ پھر سے منہ کھلے، باتیں ہی باتیں، لمبی زبانیں اور گھومتی ہوئی آنکھیں۔ وہاں پھیلی ہوئی ایک خوشبو بہر حال ابھی تک موجود تھی کہ جو اُس بزرگ کی ماضی ہو چکی موجودگی کی گواہی دے رہی تھی۔ ہاں! اور لوگوں نے دیکھا کہ پتن کے ساتھ ساتھ پانی پر بہتے ہوئے موسمی پھولوں کی ایک لمبی سی قطار کہ جیسے وہ پانی کی تہہ سے نکل کر اوپر آتے ہوں اور پھر سطحِ آب پر بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے جاتے ہوں۔ منظر کچھ عجب انداز میں سحر انگیز ہو گیا تھا۔ دیکھنے والوں کی زبانیں گُنگ اور آنکھیں ساکت ہو چکی تھیں۔ پردہ پوش ہو جانے والے بزرگ کا نام زندہ پیر رکھ دیا گیا۔

مگر خوش گوار حیرت کے لیے ابھی کچھ دن باقی تھے کہ جن کے گزرنے پر معلوم ہوا کہ بستی سمیت ستلج کے بہاؤ کے علاقوں پر سختی کے دن اب نہیں رہے۔ فصلوں کی بالیوں میں اناج لوٹ آیا، پھلدار درختوں پر بور بھی لگا، پھول کھلے تو پھل بھی لگنا شروع ہو گیا، ستلج میں پلی پلائی مچھلیاں تیرنے لگیں اور گبھرو عورتوں نے نویں مہینے تک پہنچ کر بچوں کو جنم دینا شروع کر دیا۔ رُت بدلی تو زندہ پیر کا نام بھی ''پیر زندہ کرامت'' ہو گیا اور پھر ہر سال اُن کا عرس اُس دن کی مناسبت

سے منایا جانے لگا جس روز انہوں نے پتن سے اپنا پڑاؤ کسی نامعلوم مسافت کی جانب اُٹھایا لیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کب کا واقعہ تھا مگر نسل در نسل ہر کوئی اِسے اپنے باپ دادا سے سُنتا چلا رہا تھا۔ جس طرح پیر زندہ کرامت کی اصل پہچان کے بارے میں کوئی بھی تیقن سے کچھ نہیں جانتا تھا اسی طرح اُن کا عرصہ ٔ پڑاؤ بھی اسرار کے پردے میں پوشیدہ تھا۔ مسلمان اُنہیں اللہ کا ولی، ہندو اُنہیں رام کا اوتار اور بدھ مت والے بدھ پیشوا جان کر اُن کے میلے میں شریک ہوتے۔

اُن کی شناخت کا تنازع ہوتے ہوئے بھی نہیں تھا اور نہ ہوتے ہوئے بھی موجود تھا۔ ہوتے ہوئے اس لیے نہیں تھا کہ کوئی دربار، آثار یا مزار تو تھا نہیں کہ اُس کی ہیئت وجہِ نزاع بنتی۔ انتظام و انصرام کی حد تک ذمے داریاں سنبھالے ہوئے مجاور خاندان کو صرف کمائی کی حد تک غرض تھی، وہ چاہے کوئی بھی دے یا دان کرے؛ اور پیر زندہ کرامت کی شناخت متنازع نہ ہوتے بھی اِس لیے متنازع تھی کہ جب کبھی سالانہ آمدن میں کمی محسوس ہوتی تو مجاور خاندان ایک منصوبے کے تحت اِن تینوں مذاہب کے پیروکاروں میں غیر محسوس مسابقانہ چپقلش کو ہوا دے دیتا۔ بس پھر کیا، تینوں مذاہب کے پیروکاروں کی جانب سے معاندانہ مسابقت ہُن برسانے لگتی۔ مگر اِس کے باوجود ایک بات پر اِن تینوں مذاہب کے عقیدت مندوں کا اتفاق تھا اور وہ تھی عرس کی تاریخ جو قمری یا کسی اور کیلنڈر کے بجائے بکرمی مہینوں کے حساب سے ہمیشہ ہر سال ماگھ کا آخری جمعہ ہوتی۔ کیسا اتفاق پیدا کیا تھا مجاوروں کے مفاد نے کہ ہندوؤں کا ماگھ اور مسلمانوں کا جمعہ۔ باقی رہا بدھ مت والوں کا معاملہ، وہ ماگھ کو بھی مانتے تھے اور جمعے کے ہونے سے انکاری بھی نہیں تھے۔

سیدا مجاوروں کی نوجوان نسل کا قریبی ساتھی ہونے کے سبب ہر سال عرس کی تقریبات میں جملہ انتظامات اور امن امان قائم رکھنے کا ذمے دار ہوا کرتا۔ اِس کام میں اُس کے دوستوں کا ٹولہ بھی شامل ہوا کرتا۔ مجال ہے جو کوئی چوں بھی کرے یا دَم مار جائے۔ اِس موقع کے لیے سیدے اور اُس کے ساتھیوں کا خصوصی لباس تیار ہوتا۔ سبز لمبا کرتا، اُسی رنگ کی منجلی اور سر پر پگڑی کالی جب کہ سیدے کے گلے میں جوگیے رنگ کی لمبی سی دوپٹہ نما چادر ظاہر کرتی تھی کہ وہ اِن سب کا وڈکا یا سردار ہے۔ سیدے کے ساتھیوں کا لباس بھی سارے کا سارا یہی تھا سوائے پگڑی کے جو

کالے کے بجائے سبز رنگ کی ہوتی تھی۔ سیدے سے پہلے یہی فریضہ اُس کا باپ نکھیر و نبھایا کرتا تھا مگر جب سے وہ ایک مادہ مُشکی سانپ کے انتقام کا شکار ہو کر اگلے جہان سدھارا تو ذمے داری سیدے کے سر آ رہی۔

اُڑبنگی میں سیدے کا باپ بھی سیدے سے کم نہیں تھا۔ خوامخواہ ہر کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑائے رکھنا اُس کا مزاج تھا۔ نکھیرو کی ابھی مَس بھی مشکل سے بھیگی ہو گی کہ اُس نے سانسیوں کی ملکوڑی چھوہر نکال لی اور اُسے جلال پور کے کسی زمیندار کے پاس بیچ آیا۔ شک چونکہ سبھی کو نکھیرو پر تھا اِس لیے پنچایت نے وَٹہ بھرنے کا ڈنڈ نکھیرو کے باپ پر ڈال دیا۔ اب نکھیرو کی نہ تو کوئی بہن اور نہ ہی بُو الہذا رواج کے مطابق اُس کی چچازاد بہن ڈنڈ کے طور پر سانسیوں کو دینا پڑی۔ بات پھر بھی یہاں نہ رُکی۔ اب کے نکھیرو نے سانسیوں سے انتقام لینے کا ایک اور طریقہ سوچا اور جلال پور کے اُسی زمیندار کو اُکسایا کہ مخبری وہ کرے گا لیکن سانسیوں کی دو بُہن مچھی جیسی دوشیزائیں نکالنا اُس کا کام، چاہے خود آئے یا کوئی کاٹکو ملازم بھیجے۔

جلال پور کے زمیندار نے دوسرے طریقے پر عمل کیا۔ اُس کے دو ملازم پیر زندہ کرامت کے عرس سے لگ بھگ مہینہ پہلے جوگی بن کر بستی آدم واہن کے پتن کے نزدیک جھگی ڈال کر بیٹھ گئے اور منصوبے کے مطابق لڑکیوں پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ عین عرس کی رات جب ہر کوئی کسی نہ کسی شغل میں مصروف تھا، وہ دونوں اپنے طور طریقوں سے سانسیوں کی دونوں لڑکیاں اُن کی بستی سے بھگا لائے۔ سانسیوں کو یقین تھا کہ لڑکیوں کی گُم شدگی میں نکھیرو ہی کا ہاتھ ہے مگر وہ اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے کیونکہ اُس رات نکھیرو پوری بستی کے سامنے پیر زندہ کرامت کے عرس کی محفلوں میں پوری دھما چوکڑی کے ساتھ موجود رہا تھا۔

نکھیرو اٹھارہ برس کا ہوا تو ایک دن اچانک کہیں غائب ہو گیا۔ کوئی پتا نہ کوئی نشان۔ گھر والے بھی رو دھو بیٹھے۔ مگر لگ بھگ دو سال کے بعد ایک روز اچانک اِس طرح لوٹا کہ اپنی عمر سے کوئی چار پانچ سال چھوٹی جوان چھوہر بھی ساتھ تھی۔ معلوم ہوا کہ مظفر گڑھ نام کے ایک گاؤں کے جولاہوں کی لڑکی تھی۔ نکھیرو تو کہتا تھا کہ نکاح پڑھوا کر مُکلاوا کرالایا ہے مگر نہ تو اُس کے باپ کو

یقین اور نہ ہی بستی کے مولوی صاحب کو لہٰذا ایک نکاح بستی میں بھی ہوا، اب نجانے یہ پہلا تھا کہ دوسرا، لیکن اتنا تو ہوا کہ بھاگی ہوئی حرام زادی اب گاؤں والوں کی حق حلال کی بہو بن چکی تھی۔ اِس کا نام سُکھ سوائی تھا جو سال سوا سال کے بعد سیدے کی ماں کہلائی۔

نگھیرو کے کسی چھوہر کو بھگا لانے کی بات سانسیوں تک پہنچی تو وہ اِسی ٹوہ میں جُت گئے کہ کون ہے؟ کہاں کی ہے؟ کیسے اُس کے وارثوں تک پہنچا جائے؟ لیکن نگھیرو نے پکڑائی نہ دی۔ مگر کب تک؟ آخیر سانسیوں کو بھی اِن سوالوں کے جواب ملنے تک پکے پانچ سال گزر گئے۔ مگر جوں ہی یہ بات اُن تک پہنچی، اُنہوں نے مظفر گڑھ جانے میں پانچ منٹ کی بھی تاخیر نہ کی۔ مظفر گڑھ پہنچ کر پتا چلا کہ نگھیرو کس طرح کے ظالم کھپرے ناگ جیسے لوگوں کو چرکا لگا کر بھاگا ہوا ہے۔ کوئی پچاس برس پہلے افغانستان سے آ کر ادھر آباد ہونے والے لوگوں کا چھوٹا سا خاندان اب ایک تجارت پیشہ قبیلے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ نگھیرو نے پہلے تو پکے دو برس اُن کے ہاں چاکری کی اور وہ بھی خدمت کی انتہا تک مگر جیسے ہی اُن لوگوں نے اعتبار کرنا شروع کیا تو یہ اُن کی لڑکی نکال بھاگا اور واپس آدم واہن آ گیا۔ اب دشمن کے دشمنوں نے آپس میں ہاتھ آگے بڑھایا تو ظاہر ہے وہ دوستی کا تھا۔ سُو یہ دوستی اس طرح کام آئی کہ افغانوں کے چار کڑیل جوان نگھیرو کے قتل کے ارادے کے ساتھ حساب چکتا کرنے خفیہ طور پر سانسیوں کے ہاں مہمان آ ٹھہرے۔

سانسیوں نے اُدھر بظاہر سب کچھ بھُل بُھلا کر نگھیرو کو اپنی دوستی کا یقین دلا رکھا تھا۔ دوستی کی اِس تحریک کے پس منظر میں اُن کے وڈکے نبلو سانسی کی کوششیں بہت معنی رکھتی تھیں حالانکہ اِس سے پہلے جوگیوں کے ساتھ گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں میں سے ایک اُس کی بھانجی اور دوسری بھتیجی تھی۔ اب نہیں معلوم کہ برسات کی اُس رات کو کی جانے والی وارادت میں نبلو کی رضا شامل تھی کہ نہیں مگر واردات ہو کر رہی۔

ساون کی چڑھی جوانی تھی اور شام کا ویلا کہ جب سانسیوں میں سے نگھیرو کے دو سنگتیوں نے اُسے پتن پر بھنگ گھوٹنے کی دعوت دی۔ نگھیرو کا جگری میرو ماچھی بھی بھنگ کا محبتی تھا لہٰذا چاروں پتن پر مل بیٹھے۔ سانسیوں کے چھوہَر بھنگ، خشخاش اور دوری سوٹا لائے، میرو ماچھی

اُن کا ساتھ دینے کے لیے کھجور کے بھوتروں کی بنی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ بادل تو پہلے سے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے مگر اُن کا رنگ گہرا سیاہی مائل ہونا شروع ہوا تو شام سے پہلے ہی شام سی ہو گئی۔ نگھیرو کی طبیعت میں جوانی کا تڑکا جاگا تو وہ پتن پر کِلے سے بندھی ہوئی کشتی پر چڑھ کر ڈھولے کے بول گنگنانے لگا..... ''ڈھولا لمے نہ ونج ووٗ''

بھنگ کو گھوٹ کر تیار ہونے تک گہری ہوتی شام اور گھِر گھِر آتے سیاہ بادلوں نے نہ صرف شام کو شب بنا دیا بلکہ کچھ دیر سے پڑنے والی ہلکی ہلکی پھوار نے تیزی اختیار کر لی۔ پتن کب کا ویران ہو چکا تھا۔ نگھیرو نے کشتی سے چھلانگ لگائی اور اُن کے قریب آ کر بولا ''بہن چودو! پلانی ہے تو پلاؤ ورنہ میں جاتا ہوں بستی کو۔'' نگھیرو کو اُتاولا دیکھ کر دونوں سانسی چھوہروں نے بھنگ کے جوگے کو صافے میں زور زور سے نچوڑنا شروع کر دیا۔ صافے کے نیچے دھرا بڑا سا دورا سبز رنگ کے محلول سے بھر چکا تھا۔ جوگے کو پوری طرح دبانے کے باوجود اب صرف ایک دو قطرے ہی نکل رہے تھے۔

بھنگ تیار دیکھ کر میرو ماچھی نے دھوتی کے پلو پکڑتے ہوئے قریب جھاڑیوں کی طرف دوڑ لگائی کہ خطا ہوتے پیشاب کو خطا ہونے سے بچا سکے۔ جوں ہی وہ جھاڑیوں جا کر پیشاب کرنے بیٹھا دو آدمی منہ پر ڈاٹھے باندھے ہوئے دوسری طرف کی جھاڑیوں سے باہر نکلے اور بھنگ کے پیالے کا انتظار کرتے ہوئے نگھیرو کو سیدھا گرا لیا۔ نگھیرو کو نیچے گرتا دیکھ کر دونوں سانسی لڑکوں نے بھی بھنگ کو وہیں پھینکا اور اُن دو افراد کی امداد کو دوڑے۔ اب اُن میں سے تین جوانوں نے تو نگھیرو کو سیدھا لٹا کر قابو کیا اور چوتھے نے ہاتھ میں پکڑے ٹوکے کے ایک ہی وار سے اُس کے بائیں پیر کو ٹخنے کے قریب سے اِس طرح کاٹا کہ وہ کٹ کر دور جا گرا۔ لیکن جیسے ہی اُس نے نگھیرو کے دوسرے پاؤں کو کاٹنے کی غرض سے بازو اوپر کو اُٹھایا کسی نے گوبر ملے کیچڑ کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر اُس کے منہ پر اسطرح مارا کہ آنکھیں تک لمبڑ گئیں اور ٹوکا اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔ یہ وار میرو ماچھی کا تھا جو پیشاب سے فراغت کے بعد جھاڑیوں سے باہر آ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ باقی تین لوگ کوئی نہ کوئی وار کر گزریں، میرو ماچھی نے نگھیرو کو تنگڑا رہنے کی آواز کرائی

اور پھرتی سے اُسی قسم کا کیچڑ باقی لوگوں کی آنکھوں میں بھی ٹکا دیا۔

تھوڑا سا سنبھالا ملتے ہی دایاں پاؤں کٹا ہونے کے باوجود نکھیر و اُچھل کر حملہ آوروں کی گرفت سے نکلا اور دریا کے کنارے کلاٹیاں کھاتا ہوا کیچڑ میں لت پت ہو کر گہرے پانی میں جا گرا۔ اِس سے پہلے کہ وہ چاروں حملہ آور دیکھنے کے قابل ہو پاتے نہ تو وہاں نکھیر و تھا اور نہ ہی میرو ماچھی۔ منہ متھے کو دھونے کے بعد اُنہوں نے تاڑ تاڑ کر اندھیرے میں پتن کے پانی کی سطح پر کسی قسم کی جنبش یا ہوا کا کوئی بلبلہ دیکھنے کی کوشش کی مگر اندھیرا ہو چکا ہونے کی وجہ سے بھی وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُنہیں اب تک سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہوا کیا ہے؟ کیا وہاں نکھیر و کے کچھ اور ساتھی بھی چھپے ہوئے تھے کہ جنہوں نے اِس سارے منصوبے کو ناکام کر دیا؟ لیکن جو بھی ہوا وہ اُن کی توقعات کے برعکس تھا۔ نکھیر و کے ہاتھ پاؤں اور سر کاٹ کر لاش کو ستلج میں بہانا ممکن نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر گزری تو یہ خوف بھی دامن گیر ہونے لگا کہ میرو ماچھی کہیں لوگوں کو بلانے کے واسطے بستی کی طرف نہ بھاگ گیا ہو۔ لہٰذا مایوسی اور ناکامی کے چڑچڑے پن کی ہذیانی کیفیت میں مبتلا اُن دو افغانیوں نے مظفر گڑھ کے آقاؤں کو بطور ثبوت پیش کرنے کے لیے نکھیر و کا کٹا ہوا دایاں پیر اُٹھا کر صافے میں باندھا اور سانسی چھوہروں سمیت اندھیرے میں گم ہو گئے۔

افغانیوں کو تو کسی قسم کے ردِعمل کا خدشہ نہیں تھا کیونکہ اُنہوں نے فوری طور پر مظفر گڑھ کو نکل بھاگنا تھا مگر جان پر تو سانسی چھوہروں کی بنی ہوئی تھی کہ جائیں تو جائیں کہاں۔ وہ تو دونوں پہلے ہی سے پہچانے جا چکے تھے، اب تو محض پکڑ کر سزا دینے والی بات تھی جو بہت عبرت ناک ہوتی تھی۔ اب سانسی جوانوں نے بھی اِسی میں عافیت جانی کہ وہ بھی افغانیوں کے ملازموں کے ساتھ مظفر گڑھ بھاگ جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اُدھر پتن کے کیچڑ میں گُلاٹیاں لگا کر ستلج میں گرنے والے نکھیر و کے ساتھ ہی میرو ماچھی بھی کوئی آواز پیدا کیے بغیر دریا میں اُتر گیا تھا۔ اگر میرو ماچھی ایسا نہ کرتا تو زیادہ خون بہنے کی وجہ سے نکھیر و بھی زیرِ آب بے ہوش ہو کر ڈوب چکا ہوتا۔ مگر میرو نے پانی میں اُترتے ہی نکھیر و کو اپنے چنبے میں لے لیا۔ گو کہ نکھیر و اُس کے پہنچنے تک خاصی حد تک ہوش و حواس سے لاتعلق ہو چکا تھا

مگر میرو ماچھی پھر بھی اُسے گہرے پانی میں زیرِ آب رکھتے ہوئے پتن سے کم وبیش آدھا کوہ بہاؤ کے رُخ آگے لے گیا۔ جب کوئی سُن گن نہ ملی تو اُس نے بے ہوش نگھیرو کو پانی سے نکالا، اپنی دھوتی پھاڑ کر اُس کے کٹے ہوئے ٹخنے پر باندھی اور اُسے کندھے پر اُٹھا کر گھر تک پہنچانے کے لیے اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔

یہ نگھیرو کی اڑبنگی ہی تھی کہ جس نے اُسے دائیں پاؤں سے محروم کر دیا۔ وہ گھر بھی پہنچ گیا، زخم بھی بھر گیا مگر مزاج سے غصہ نہ گیا۔ وقوعے کا مدعا سانسیوں تک پہنچا تو سانسیوں کے وڈکے اور اُس کے باپ کے سینگے نبلو سانسی نے ہمیش کی معافی کے واسطے اپنی پگ نگھیرو کے قدموں میں رکھ دی اور پنچایت کے روبرو قسم دی کہ اگر وہ دونوں سانسی جوان زندہ حالت میں جب کبھی پتن واپس لوٹے تو وہ خود پکڑ کر اُنہیں نگھیرو کے حوالے کرے گا اور اگر ایسا نہ کر سکا تو دو کنوارے ساکھ ڈنڈ کے طور پر نگھیرو کے حوالے کر دے گا۔ مگر یہ الگ بات کہ نہ تو نگھیرو کو زیادہ عرصہ زندہ رہنے کا موقع ملا اور نہ ہی وہ دونوں سانسی جوان مظفر گڑھ سے زندہ واپس لوٹے۔ اخیر دم تک یہی خبر ملتی رہی کہ افغانوں نے نگھیرو کا قتل نہ کر سکنے کے انتقام میں اُن دونوں کو واپسی کے راستے ہی میں قتل کر دیا تھا۔

سیدے کے اندر بھی یہی خون تھا جس میں تڑکا افغانیوں کا بھی لگ چکا تھا۔ اب وہ بھلا کس کے قابو میں آنے والا تھا۔ اِس عالم میں بھی کہ گورا سرکار اُس کے پیرے ناپتی پھرتی تھی، وہ پیر زندہ کرامت کے عرس کے انتظامی معاملات سنبھال کر بیٹھ گیا۔ دھڑکا دن رات ضرور تھا کہ کہیں ایسے میں گورا سرکار اپنی کمینگی پر نہ اُتر آئے اور اُس کے وڈکوں کی قبروں سے لوہے کے جناتی شہتیر نہ گزار دے۔ مگر ایک حد تک فکر کرنے کے بعد اُس نے اِس خوف کو سر سے جھٹک دیا اور اپنے سنگتیوں کے ساتھ اِس طرح مصروف ہو گیا کہ جیسے پچھلا ایک مہینہ وہ کسی تناؤ، کسی عذاب سے گزرا ہی نہ ہو۔

اب کے برس پیر زندہ کرامت کے میلے پر لوگوں کا رش دگنا ہو گیا تھا۔ ایسے لوگ بھی دیکھنے کو مل رہے تھے کہ جو اِس سے پہلے کبھی دکھائی نہیں دیے تھے۔ اِن میں زیادہ تعداد اُن باریش

علما اور بزرگوں کی تھی کہ جو پتن پر ٹولیوں کی صورت ڈیرہ جمائے پیر زندہ کرامت کی وہ کرامتیں بیان کر رہے تھے جو کبھی دیکھیں نہ سُنیں۔ سیدے سمیت یہ اُن تمام لوگوں کے لیے اچنبھے کا باعث تھا جو اِس سے قبل پیر زندہ کرامت کی ہمہ قسم کرامات سُن چکے تھے۔ مجاوروں کا خاندان تو خوش تھا کہ اِس سال نذرانوں کی رقم اور چڑھاوے کے زیورات کا کوئی حساب ہی نہیں رہا تھا مگر سیدے کے ذہن میں عجیب سی کھد بھد تھی کہ اگر ایسا ہوا ہے تو یوں ہی نہیں ہو گیا۔ ضرور اِس کا تعلق ریلوے لائن کے قضیے سے ہے۔ لیکن اگر ایسا تھا تو اُس کا کوئی سر پیر کہاں سے ڈھونڈ لاتا۔ اُس نے ذہنی کھلبلی سے مجبور ہو کر بڑے مجاور سے اپنے خدشے کا اظہار کیا مگر اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جس طرح اُس نے گورا سرکار سے ریل کے معاملے پر متھا لگایا ہے، یہ سب اُس کی دلیری کا نتیجہ ہے۔ لوگ دیکھنے آ رہے ہیں کہ یہ کون ہے پیر زندہ کرامت کا باہنا اور غلام کہ جس نے انگریز سرکار کو جوتے کی نوک پر بھی نہیں رکھا۔

سیدا دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ اگر یہ سب اُس کے چرچے کے سبب جمع ہوئے ہیں تو ذکر بھی اُسی کا ہونا چاہیے تھا مگر یہ کیسا معاملہ ہے کہ چرچا بھی پیر زندہ کرامت کا اور ذکر بھی اُسی کا تو ایسے میں سیدا کہاں سے گڑ دھال میں آتا ہے۔ ہو نہ ہو بات کچھ اور ہی ہے۔

بات یہاں تک رہتی تو خیر تھی مگر جب آگے بڑھی تو سیدے کی عقل کیا پُٹھی ہوئی، مَت بھی ماری گئی اور وہ جا پہنچا ماسی کے گھر سنگری کے مُکلاوے کے لیے۔ سنگری کی ماں ایک مدت کے بعد اپنے بھانجے کو دیکھ کر خوش تو ہوئی مگر کچھ کچھ حیران بھی کہ پیر زندہ کرامت کے میلے کے دنوں میں سارے جنجال چھوڑ کر یوں چلے آنا کب خیری ہو سکتا ہے؟ ابھی وہ اُس کی خاطر داری کے لیے چُلہانے کی طرف گئی ہی تھی کہ سیدے نے گلے میں پھنسا کھنگار صاف کرتے ہوئے اونچی آواز میں پوچھا:

''ماسی! سنگری کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہی۔''

''بیٹا تمھیں تو سنگری بہت پہلے نظر آ جانی چاہیے تھی۔''

سیدے نے کچھ نہ سمجھ سکنے کے انداز میں ماسی کی طرف دیکھا جو رَسی سے لٹکے ہوئے چھکے سے دُھلا ہوا گلاس نکال رہی تھی۔

''میں شودی تو کب سے اِس انتظار میں تھی کہ کبھی تو تمہیں سنگری کا خیال آئے اور میں مُکلاوا کروں اُس کا۔'' ماسی سُنا تو سب کچھ سیدے کو رہی تھی مگر اُس سے آنکھیں ملائے بغیر۔

''ماسی آیا تو بیٹھا ہوں، کر دے مُکلاوا، ابھی لے جاتا ہوں اُسے اپنے گھر۔''

ماسی نے حیران ہو کر سیدے کی طرف دیکھا کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہے مگر اُس کے چہرے پر تناؤ چھایا ہوا تھا۔

''تو اکیلا مُکلاوا کرے گا کیا؟ نہ کوئی جنج نہ بارات، نہ کوئی وَڈکا نہ ہمسایہ!'' ماسی حیران ہونے کے بجائے اب پریشان ہونے لگی تھی، لہٰذا وہیں پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

''کیا ضرورت ہے کسی جنج، بارات یا وَڈے کی؟ مُکلاوا تو میرے ساتھ ہی ہونا ہے نا! تو کیا میں کافی نہیں ہوں؟''

''کافی تو تو بھی ہے پُتر لیکن کچھ دنیا داری بھی ہوتی ہے نا! کیا کہیں گے لوگ کہ سیدے کا آگا پیچھا ہی کوئی نہیں ہے؟

''کس میں اتنا دَم ہے جو میرا آگا پیچھا پوچھے؟ یقین نہیں ہے تو بُلا لو کسی کو!''

''میں کیوں بلاؤں کسی کو؟ جانتی نہیں ہوں تمہیں؟ شیر ہے شیر میرا بیٹا..... لیکن پھر بھی خوشیوں کے وارد یکھنے کے واسطے جب تک چار شریک دروازے پر نہ آئیں، عزت نہیں بنتی۔ اِس طرح کر..... تو نہ بلا کسی کو میں بُلا لیتی ہوں.... تو بھی یتیم اور سنگری کا باپ بھی سَر پر نہیں.... اب ایسے میں زیادہ شور شرابہ کیا کرنا.... مِٹھے کی دیگ میں پکوا لیتی ہوں اور لُونڑیں کی تو کر لے، پانچ سات جھگے بُلا لیتے ہیں اور مُکلاوا ہو گیا..... اللہ اللہ خیر صلیٰ۔''

''مجھے نہیں کرنا اِس قسم کا مکلاوا.... میں تو سیدھی بات جانتا ہوں، سنگری میرے نکاح میں ہے اور نکاح کے بعد کسی اخروٹ چھوہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تو ایسا کر ماسی کہ سنگری کو بلا اور میرے ساتھ روانہ کر دے۔ باقی پیچھے کیا ہوتا ہے، یہ تیرا کام ہے، تو سمجھ!'' یہ کہہ کر سیدا چارپائی

سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''مگر مجھے نہیں چاہیے تیرے ساتھ مُکلاوا''...... سنگری کے غصے سے کھولتے ہوئے لہجے نے اُن دونوں کو حیران کر دیا۔ وہ اکڑ کر اپنی ماں کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور سیدا اُسے حیرت سے تکے جا رہا تھا۔ حیرت تو اُس کی ماں کی آنکھوں میں بھی تھی مگر اُس حیرت کی نوعیت، سیدے کی حیرت سے مختلف تھی۔

''کیوں نہیں چاہیے میرے ساتھ مُکلاوا؟ کوئی اور یار تاڑ لیا ہے کیا!''..... سیدے نے سنگری کو طعنہ تو طنزیہ انداز میں دیا مگر یہ اُس کے پنڈے میں بھانبڑ بھڑکا گیا۔ سنگری نے بائیں پاؤں سے جوتا اُتارا اور اِس سے پہلے کہ سیدا کچھ سمجھ پاتا، جوتا تڑاخ سے اُس کے منہ پر جا لگا۔ سیدا سنگری کی جانب سے اِس قسم کے ردِعمل کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ اُس کی ساری اَڑبنگی ساری اکڑ منہ پر پڑنے والے جوتے کے ساتھ ہی ہوا ہو گئی تھی۔ کچھ لمحوں میں اُس کے حواس بحال ہوئے تو اُس نے لپک کر سنگری کو گُت سے دبوچا اور اُسے بَل دیتے ہوئے گردن کو اس طرح پیچھے موڑا کہ اُس کا سینہ باہر کو نکل آیا۔ سنگری کی ماں کے لیے بھی یہ صورتِ حال اِس قدر پریشان کن تھی کہ اُس نے سینے پر ہتھڑ مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ اُدھر مروڑی ہوئی گُت اور گردن کو ایک بل اور آیا تو سنگری کا چہرہ اُس کی اُبلی ہوئی آنکھوں سمیت سیدے کے چہرے کے سامنے آ گیا۔ دونوں کے چہرے جیسے ہی آمنے سامنے ہوئے سنگری نے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے سیدے کے منہ پر تھوک دیا۔

منہ پر تھوکے جانے کے بعد ایک دم سیدے کے بازوؤں میں جان نہ رہی اور سنگری کی گُت اُس کے ہاتھ سے چھٹ گئی۔ یہ بھی عجیب لحہ ہوتا ہے کسی طاقتور کی دہشت کے لیے کہ جب وہ کسی کمزور کے ہاتھوں ہزیمت کا شکار ہو کر اپنی قوت کو مجتمع نہیں کر پا رہا ہوتا۔ اعصاب کی شکستگی کے اِس دورانیے میں سنگری تڑپ کر اُس کی رہی سہی گرفت سے بھی نکل گئی اور دور جا کھڑی ہوئی۔ سنگری کے سیدے کی جکڑ بندی سے آزاد ہوتے ہی اُس کی ماں کا رونا دھونا بھی بند ہو گیا تھا۔

''سیدے! اب نکل جا میرے گھر سے.... نہیں تو جوتیاں بہت پڑی ہوئی ہیں میرے

پاس..... اور ہاں ! اب بھول جا کہ میں کبھی تیرے حق میں تھی۔ عزت تیری اِسی میں ہے کہ کاغذ دے دے مجھے کل تک ..... نہیں دے گا نا تو میں بھی کسی آتے جاتے کے نیچے لیٹ جاؤں گی اور منہ پہ کالک تمہارے پھرے گی کہ سیدے کی بیوی فلاں کے سامنے چڈا کھولے پڑی ہے۔''
سنگری کے گلے سے آواز نہیں بلکہ کسی اَنت زہریلے سانپ کا زہر شوکاٹ کی صورت باہر نکل رہا تھا۔ اب کے اُس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔



# ۸

عام طور پر جمعے کو شروع ہونے والا پیر زندہ کرامت کا میلہ اتوار دن ڈھلنے سے پہلے بکھر جایا کرتا تھا لیکن اس سال رش کا اَنت ہو جانے کے ساتھ ساتھ اُتوار کا سورج غروب ہونے کے بعد بھی لوگ تھے کہ گھر وگھری جانے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ مسلمانوں کے علما، ہندوؤں کے پنڈت اور بُدھ مت والوں کے بھکشوؤں نے علیحدہ علیحدہ محفلیں جما رکھی تھیں۔ مسلمانوں کے ہاں قوالیاں، ہندوؤں کے ہاں بھجن اور بھکشوؤں کی محفل میں اُن کی مذہبی مناجات کے ورد رنگ جمائے ہوئے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہر مذہب کے مذہبی رہنما مذہبی موسیقی کے وقفوں میں وعظ و تلقین کی محفل سجا لیتے جہاں ان کے مخاطب بستی آدم واہن اور اُس کے قرب وجوار کے نوجوان ہوتے۔ یہ علماء، پنڈت اور بھکشو غضب کے ماہر نفسیات واقع ہوئے تھے۔ وہ اِس طرح دھیمے دھیمے باتیں کرتے کہ جیسے ساعت میں سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ وہ کوئی ایسا لفظ نہ بولتے جو کسی ایک بھی موجود شخص کو کسی طور گراں گزرے۔ اُن کا میٹھا میٹھا بولنا کانوں میں رس گھولتا ہوا دل میں اُتر جاتا۔ کچھ ایسا کہ ہر کسی کی خواہش ہوتی کہ وہ بولتے جائیں اور سننے والا اُنہیں مسلسل سُنتا جائے۔

ان صاحبانِ علم کی گفتگو کا محور جہاں اخلاقیات اور برائی سے بچ رہنے کا تھا وہاں زور اس بات پر بھی تھا کہ فساد سے ہر ممکن بچا جائے، عاجزی اختیار کی جائے، حاکم کا حکم مانا جائے اور

خلقِ خدا کے لیے فلاح کے راستے کھولے جائیں نہ کہ اُن پر دستیاب آسانیاں بھی محدود اور مسدود کر دی جائیں۔ شر پسندی کو اپنانے اور اُس کو ہوا دینے کے بجائے امن کا راستہ اپنایا جائے۔ حاکم ضروری نہیں کہ آپ کا اپنا ہم مذہب ہو، وہ جس مذہب سے بھی ہو، اُسے حاکم رب کی ذات نے بنایا ہے اور اُس کے کہے ہوئے کی تعمیل رعیت پر فرض ہے۔ اُن صاحبان نے نوجوانوں پر واضح کر دیا کہ وہ لوگ، جو بے شک اپنے ہوں یا پرائے، اگر آپ کو بغاوت اور فساد پر آمادہ کریں تو سمجھ لیں کہ وہ آپ کے کھلے دشمن ہیں، آپ کی ہلاکت کا باعث ہیں، اُن سے بچیں۔ اُنھوں نے نوجوانوں اور اُن کے بزرگوں کو ایک ساتھ بٹھا کر پیر زندہ کرامت کی زندگی کے ایسے واقعات سُنائے جو اِس سے پہلے کبھی نہیں سُنے گئے تھے۔ اُن کے مطابق پیر زندہ کرامت حالات کو جوں کا توں رکھنے کو بڑی خیال کرتے تھے۔ چونکہ بدی کی قوتیں چاہتی ہیں کہ ہمارے حالات میں تبدیلی نہ ہو اور نہ ہی اِس کی تحریک کہیں سے اُٹھے اِس لیے اگر بستی کے لوگ پیر زندہ کرامت کی تعلیمات کو اپنا کر اپنی زندگی سنوارنا چاہتے ہیں تو نہ صرف ترقی اور تبدیلی کی حمایت کریں بلکہ جو شیطان صفت لوگ علاقے میں، علاقے کے لوگوں کے رہن سہن میں، اُن کی زندگیوں میں ترقی کا راستہ روکنا چاہتے ہیں اُن کو علاقے سے نکال باہر کرنا چاہیے۔

یہ ساری باتیں سیدے کو اُس کے ساتھیوں کی زبانی پہنچنا شروع ہو چکی تھیں۔ اُس نے خود بھی کئی مجلسوں میں یہ ساری گفتگو اپنے کانوں سے سُن رکھی تھی۔ وہ حیران تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے میلے پر آ دھمکے ہیں خلقت کو ایسی ایسی باتیں بتانے جو اِس سے پہلے کبھی نہیں سُنی تھیں۔ وہ اِس بات پر بھی حیران تھا کہ جیسے ہی وہ کسی ایسی وعظ و تلقین کی مجلس میں جاتا ہے تو نہ صرف مُلا، پنڈت یا بھکشو اُسے غور سے دیکھنا اور گھورنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ وہاں موجود لوگ بھی اُسے یوں دیکھتے ہیں کہ جیسے وہی برائی کی جڑ، بدی کی علامت اور ترقی مخالف شیطان ہے۔ اُسے اِن لوگوں کے پیچھے گوری سرکار کا چہرہ اور اِن کے منہ میں اُسی کی زبان دکھائی دے رہی تھی۔ سیدے کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کیسے حالات کو جوں کا توں رکھنا چاہتا ہے یا وہ کیسے اپنی بستی اور اپنے علاقے میں ہونے والی ترقی کا دشمن ہے۔ وہ تو محض انگریزوں کی ترقی کا راستہ روکنا چاہ رہا

ہے کہ جو اپنی ایجادات کے ذریعے اُن کے وَڈکوں کی قبریں تک سلامت نہیں رہنے دے رہے تھے۔ کیا اپنی زمین جائیداد اور اپنے بزرگوں کی قبروں کی حفاظت کرنا کوئی شیطانی عمل ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اُسے کیوں شیطان قرار دیا جا رہا ہے؟

سیدے کو تسلی تھی کہ اُسے اُس کے گھر میں شیطان قرار دینے کی سازش کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی مذہبی تفریق سے بالاتر ہوتے ہوئے جہاں بستی کے ستر سے زیادہ نوجوان عملی طور پر اُس کے ساتھ اور اُس کے ایک اشارے کے منتظر تھے وہاں اُن بزرگوں کی دعائیں بھی تھیں جو اُس کے مشن کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ قبرستان جہاں سے گورا سرکار ریلوے لائن گزارنا چاہ رہی تھی صرف مسلمانوں کی لاشیں دفنائے جانے کی جگہ نہیں تھی بلکہ اِس سے وابستہ حرمت اور صدیوں پرانی تقدیس کے اشتراک کے سبب اِس کے تقدس کی حفاظت باقی مذاہب کے پیروکاروں پر بھی اُسی طرح فرض سمجھی جاتی تھی جیسے کہ مسلمانوں پر۔ سیدے کے تئیں خود یہی لوگ تھے جو حالات کو جوں کا توں رکھنا چاہ رہے تھے۔ کہیں سے ہلکی سی چوں یا چنگاری اُن کی پوری سرکار کو ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ یہ گورا سرکار ہی تھی جو ہر قیمت پر اپنے مقبوضہ علاقوں میں حالات کو جمود میں رکھنا چاہتی تھی۔ اُنہیں اِس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اُن کی رعیت اُنہیں کس نگاہ سے دیکھتی اور پرکھتی ہے۔ سیدے کے خون کا کھولاؤ، اُس کے مزاج کے برعکس، طبیعت میں جوش کی بجائے مایوسی پھیلائے جا رہا تھا۔ نجانے کیوں آج وہ ہاتھ پاؤں چلانے کے بجائے سوچنے کی جانب مائل تھا جو کبھی اُس کی طبع کا خاصا ہی نہیں رہا تھا۔

''یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنے کیے کو دوسروں کے سر تھوپ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ تبدیلی یہ خود نہیں چاہتے اور اس کا الزام ہم لوگوں کو دیتے ہیں کہ ہم ترقی نہیں چاہتے۔ بھلے سے ترقی کرو، جو چاہے کرو مگر ہمارے ماں باپ اور اجداد کی قبروں کو مسمار کر کے نہیں۔'' ایک طویل مایوسی کی لہر کو سر سے جھٹک کر سیدا اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بستی کا باہر و باہری چکر لگا کر دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اُس کی مایوسی کسی بڑی پریشانی کی وجہ تو نہیں بننے والی۔ پہلے اُس نے سوچا کہ بستی کا بیرونی چکر لگانے کے لیے کچھ سنگتیوں کو بلا لے تو اچھا ساتھ رہے گا مگر پھر خیال آیا کہ کیسے بُلائے، اِس وقت

تو وہ بھی میلے کے اختتامی امور نمٹا رہے ہوں گے لیکن میلہ تھا کہ ختم ہو جانے کے بعد بھی ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔ اگر اِس وقت اُنہیں اپنے ساتھ لے بھی لیا تو سب کچھ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ جو سازش اُس کے خلاف ہونے جا رہی تھی اُس کا سراغ ملنا بھی تو ضروری تھا وگرنہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جو لوگ سات سمندر پار سے آ کر اُن پر سرداری کر سکتے ہیں وہ تو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بس اپنے کچھ لوگوں کا ساتھ اُس سے توڑنا اور خود سے جوڑنا ہو گا۔

سیدا اُچھل کر اپنے ''جگری'' گھوڑے پر بیٹھا تو ایڑی دکھاتے ہی جاتی سردیوں کی خنکی سے لدی پھندی ہوا اُس کے چہرے سے ٹکرائی اور ایک پل ہی میں سارا تناؤ نچوڑ کر کہیں پیچھے جگری کے ٹاپوں سے اُڑتی گرد کا جزو بن گئی۔ مگر ابھی اُس نے بمشکل ایک فرلانگ فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ دور تک پھیلی ہوئی جھاڑیوں کے اندر ہونے والی ہلچل نے جگری کو اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر زور سے ہنہنانے پر مجبور کر دیا۔ ایک پل پہلے والا سکون غتر بود ہوا تو سیدے کو بھی ایک دم جھر جھری سی آ گئی۔ وہ اندیشہ جو کہیں اُس کے ذہن میں تھا، خوف بن کر پورے بدن میں پھیلنے لگا تھا۔ اُس نے سوچا کہ گوروں نے شاید اُسی یہیں گھیر کر مارنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔

''مگر اِن جھاڑیوں کی جانب تو وہ خود آیا ہے، اپنے ارادے سے آیا ہے، اُسے کسی نے گھیر گھار کر اِدھر آنے پر تو مجبور نہیں کیا تو پھر وہ خوف زدہ کیوں ہے؟'' سیدے کے ذہن میں کئی سوال چھوٹے چھوٹے بگولوں کی مانند یکے بعد دیگرے اُٹھتے چلے جا رہے تھے۔ جگری وہیں ٹھہر کر اپنے اگلے سُموں سے زمین کھرچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لگتا تھا وہ آگے جانے سے اڑی کر رہا ہے۔

''شاید کسی ہوائی مخلوق کا کوئی دکھالا!'' ..... یہ خیال بھی ایک اور خوف بن کر سیدے کے ذہن میں سرسرایا مگر اُس نے فوراً ہی جھٹک دیا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے اُسے؟ پہلے تو ایسے خیالات کبھی اُس کے پاس سے بھی نہیں گزرے تھے۔ کیا وہ کمزور پڑتا جا رہا ہے؟ کیا گورے اُسے خوف زدہ کر کے مارنا چاہتے ہیں؟ لیکن یہ تو نہیں ہو گا، وہ ہونے ہی نہیں دے گا۔'' یہ سوچتے ہی سیدے نے جگری کی باگ کھینچ کر اُسے پیچھے آبادی کی طرف واپس جانے کے لیے ایڑی دکھائی۔ اب اُس کا رُخ بستی کی جامع مسجد سے ملحقہ مولوی جارُاللہ کے حجرے کی طرف تھا۔

مولوی جاڑاللہ سے سیدے کا تعلق بہت احترام کا تھا۔ مولوی صاحب اُس کے والد نگھیرو کے ہم عمر اور بہت قریبی دوست بھی تھے۔ نگھیرو کے ہر اُلٹے کام کو مولوی صاحب اپنی دانائی اور دوراندیشی کے سبب ہمیشہ سیدھا کیے رہتے۔ لوگ کہتے تھے کہ نگھیرو کی ہیبت اور دبدبے کے پیچھے مولوی جاڑاللہ کا بہت ہاتھ تھا۔ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ سرپرستی یک طرفہ نہیں تھی۔ مفادات کا بہاؤ نگھیرو کی جانب سے مولوی صاحب کی طرف بھی اُتنا ہی تھا کہ جتنی مولوی صاحب کی جانب سے کی جانے والی اُس کی حمایت اور نگہبانی۔ اُن دونوں کی زندگی میں کئی مواقع ایسے بھی آئے کہ بستی کے لوگوں کی رائے زنی بڑھ کر حرفِ شکایت بنی مگر مولوی جاڑاللہ کا مذہبی منصب اور جلالی طبع ہمیشہ عوامی پسپائی اور جابرانہ سکوت کا باعث ہوئی۔ اُن دونوں کے تعلق کے بارے میں بستی والے کس قدر حُسن زن رکھتے تھے، اُس کا اندازہ اُن کی اِس رائے سے لگایا جاسکتا تھا کہ اگر سانپ کاٹے کا علم مولوی صاحب کو بروقت ہو جاتا تو وہ نگھیرو کو مرنے سے بھی بچا لیتے۔ اب نگھیرو تو دنیا میں نہ رہا مگر وہی تعلق ایک اور نوعیت کی سرپرستی کی صورت اُس کے بیٹے سیدے تک ضرور منتقل ہو چکا تھا جس میں ہمسری سے زیادہ مشفقانہ عنصر شامل تھا۔

گورا سرکار کے خلاف مزاحمت میں مولوی جاڑاللہ کا فتویٰ پہلے دن ہی سے سیدے کے لیے ڈھارس کا باعث تھا۔ مولوی صاحب کا واشگاف الفاظ میں پوری شد ومد سے دیا گیا یہ فتویٰ سیدے کے مخالفوں کے حوصلے پست کیے ہوئے تھا کہ قبرستان سے لاشیں نکالنا، میتوں کی توہین، صریحاً کفر اور گناہ کبیرہ ہے۔ مگر بدلتے حالات میں سیدا جاننا چاہ رہا تھا کہ جو سازش اُسے تنہا کر دیے جانے کی ہو رہی تھی اُس کا علم مولوی صاحب کو بھی ہے یا نہیں۔ اِس نہج پر ہر دو صورتوں میں وہ مولوی صاحب کی حمایت باقی رکھنے کا خواہاں تھا۔ اِس کے دوسری جانب مولوی جاڑاللہ کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ سیدے کی ''ریل روکو'' تحریک کے نتیجے میں اگر کوئی شخصیت مقامی سطح پر اپنی تمام تر اثر انگیزی اور کامل مقتدر کے طور پر سامنے آ رہی تھی تو وہ مولوی جاڑاللہ کی تھی۔ سودے بازی کے علاوہ بازی بنانے اور بازی لگانے کے بھی اختیار مولوی جاڑاللہ نے فتوے کی صورت اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے تھے جب کہ سیدا اور اُس کے سنگی تو محض تاش کے پتے تھے کہ جن کی ترتیب

ہار جیت کے امکانات کے مطابق بدلی جا سکتی ہے۔

بہت سے وسوسوں اور اندیشوں کے ساتھ سیدا مولوی صاحب کے حجرے تک پہنچا تو عشا کی نماز پڑھے جانے کے بعد نمازی مسجد سے نکل رہے تھے۔ خلاف معمول یہاں بھی زیادہ لوگ دیکھ کر سیدے کا ماتھا ٹھنکا۔

''کہیں مولوی صاحب نے اپنے فتوے سے رجوع تو نہیں کر لیا؟ مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ فتویٰ کیسے بدلا جا سکتا ہے؟ لیکن اگر مولوی صاحب نے فتویٰ بدل لیا تو میری تحریک کا کیا ہوگا؟ خود میرا کیا ہوگا؟ نہیں نہیں... مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب اپنی بات پر قائم رہیں گے اس لیے بھی کہ یہ سب کچھ اُنہی کا تو کیا دھرا ہے۔'' صورتِ حال کو اپنے اندیشوں کے مطابق پا کر سیدے کے ذہن میں سوالات کی بوچھاڑ ہوگئی۔ ابھی وہ اپنے جگری سے اُترنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا مسجد کے دروازے سے مولوی جاراُللہ اُنہی مولویوں کے جلو میں باہر نکل رہا ہے جو نجانے کہاں سے پیر زندہ کرامت کے میلے پر لوگوں کو حاکموں کی اطاعت کا درس دینے چلے آئے تھے۔ سیدا وہیں ساکت ہو کر رہ گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ گھوڑے سے اُترے یا اُسے ایڑی دے کر اتنا دور چلا جائے کہ جہاں تک جایا جا سکتا تھا۔ لیکن اِس سے پہلے وہ کوئی فیصلہ کر پاتا مولوی صاحب نے اُسے دیکھ لیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ سیدے کے پاس اب کوئی راستہ نہیں رہا تھا کہ وہ جگری سے اُترے اور اُس جلوس کا حصہ بن جائے جو مولوی صاحب کے ساتھ اُن کے حجرے کی جانب جا رہا تھا۔

یہ جلوس پچاس پچپن افراد پر مشتمل رہا ہوگا کہ جس میں اکثریت باہر والے لوگوں کی تھی۔ اِن باہر والوں میں بھی زیادہ تر لوگ وہی تھے جو میلے کے ایام میں جگہ جگہ محافل وعظ و تلقین منعقد کر کے لوگوں کو حاکم وقت کے خلاف باغیانہ روش سے باز رہنے کی افادیت بتاتے رہے تھے۔ سیدے کی اِن تین دنوں میں اگرچہ اِن لوگوں سے براہ راست کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی جن نظروں سے وہ اُسے دیکھ رہے تھے، صاف لگ رہا تھا کہ وہ اُسے جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی ہیں۔ سیدے کے اُن کے ساتھ شامل ہوتے ہوتے مولوی صاحب کا حجرہ آ گیا اور وہ

سبھی اندر داخل ہو کر نیچے بچھی چٹائیوں پر بیٹھ گئے۔ جگہ تنگ تھی سیدا اندر داخل ہونے کے بعد دروزے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ مولوی صاحب ازراہِ تعلق نہ سہی مگر اُس کی بستی میں چودھراہٹ کا خیال کرتے ہوئے اُسے اپنے زانو بہ زانو بیٹھنے کو کہیں گے جہاں اتنی جگہ تو بہر حال موجود ہی تھی لیکن حیران کن طور پر مولوی صاحب نے آنکھ اُٹھا کر سیدے کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ روہانسا ہو گیا۔ دل چاہا کہ باہر نکل جائے مگر مجلس کی نوعیت کا خیال کرتے ہوئے وہیں پھنس پھنسا کر بیٹھ تو گیا مگر اُس کے لیے حیرت کا ایک اور قدم منتظر کہ کوئی فریق بھی بات شروع کرنے کو تیار نہ تھا۔ سیدے نے بھانپ لیا کہ کام کی گفتگو یا تو پہلے ہی کسی اور نشست میں ہو چکی ہے یا اِس مجلس میں اُس کی موجودگی کے سبب کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ مولوی صاحب اپنا راستہ بدل چکے ہیں مگر اپنی طبع کے برعکس کسی بھی قسم کے ردِ عمل کا اظہار کیے بغیر وہ زور سے کھانسا اور پھر کھنکار تھوکنے کے سے انداز میں کمرے سے باہر چلا آیا۔ نجانے کہاں سے آنسوؤں کی ایک گھٹا اُمڈی اور سیدے کی آنکھوں کی راہیں اِس طرح برسیں کہ اندھیرے کے باوجود اُسے اپنے بازوؤں سے خشک کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ جگری پر سوار ہوتا مولوی صاحب کا ایک طالب چپکے سے اُس کے پاس آیا اور ہولے سے کان میں کہا کہ مولوی صاحب اُسے باہر رُکنے کا کہہ رہے ہیں۔

سیدے نے اپنی سُرخ ہو چکی آنکھیں اندھیرے میں چھپائیں اور جا کر ایک منڈھی پر بیٹھ گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُٹھ کر بھاگ جائے، بیٹھ کر روتا رہے یا مولوی صاحب کی طرح گورا سرکار کے خلاف مزاحمت کا منکر ہو جائے۔ آج اُسے اپنا باپ یاد آ رہا تھا کہ جس کے زندگی میں کیے گئے غلط فیصلے آج اُس کی زندگی میں بھی پھن پھیلائے کھڑے تھے۔ وہ حیران تھا کہ اُس نے تو کسی نر مُشکی کو نہیں مارا تھا کہ جس کی مادہ اُس سے انتقام لینے چلی آئے۔ مادہ سانپ کے انتقام کے خیال آیا تو سنگری اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اُس نے تو کل تک کی دھمکی دی تھی کہ اگر اُسے کاغذ نہ ملا تو وہ کسی کے بھی سامنے چِڑا کھول کر لیٹ جائے گی اور کالک اُس کے منہ پر پھرے گی۔ سیدے نے گھبرا کر اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا اور پھر اندھیرے میں اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو

دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جہاں کالک تو نہیں تھی مگر کالک جیسا اندھیرا ضرور تھا۔

سیدا اُچھل کر مُنڈھی سے کھڑا ہو گیا۔ ایک کے واسطے سیاہ مُشکی ناگن اور دوسرے کے لیے سنگری۔ کیا قسمت تھی دونوں باپ بیٹے کی۔ سیدے کو لگا کہ مُشکی ناگن کے پھن اور سنگری کے کھلے جبڑے میں کچھ بھی فرق نہیں۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا کہ مُشکی ناگن کی وِس سارے بدن میں سرعت کے ساتھ پھیلتی ہوئی اُس کی آنکھوں تک آن پہنچی ہے جہاں سے کچھ بھی دکھائی دینا معدوم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سیدے کو بھی اپنے باپ کی طرح اپنے اخیر وقت کی چاپ سُنائی دینے لگی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں میں بینائی ڈھونڈتا ہوا پھر سے مُنڈھی پر بیٹھ گیا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب اُس کے جسم سے روح کشید ہو اور وہ اپنے والدین سے جا ملے مگر جاں کنی کے یہ لمحات طویل ترین ہوتے چلے گئے۔ سیدے کی آنکھوں میں بینائی اور نہ ہی جسم میں حرارت۔ جاتے ماگھ کی سردی دریا کنارے کی نمی سے بھیگی تو اُس کے رُوں رُوں میں اُترتی چلی گئی۔

کافی دیر کے بعد اندر بیٹھے ہوئے لوگ حجرے سے باہر نکلے تو ماحول میں اعصابی طور پر منجمد سیدے کو محسوس ہوا کہ بہت سے سفید پوش فرشتے اُس سے برگشتہ انداز میں اِدھر اُدھر پھیلتے چلے جا رہے ہیں تا وقتیکہ پھر اُسی طالب کی زبانی اُسے یہ پیغام نہیں ملا کہ مولوی صاحب اندر بُلا رہے ہیں۔ وہ مُنڈھی سے اُٹھ کر مولوی صاحب کے پاس چلا تو گیا مگر یہ اُسے کسی اور جہان کا منظر دکھائی اور سُنائی دے رہا تھا۔ مولوی صاحب اُسے بتا رہے تھے کہ یہ تمام لوگ بہاول پور سے ملتان تک کے مدارس کے نیک نام اور پارسا علما ہیں۔ اُن کے نزدیک انگریز سرکار کے عوامی فلاح کے منصوبوں میں رخنہ اندازی کسی طور بھی لائق ستائش نہیں ہے۔ اُن کا اجتماعی مطالبہ ہے کہ میں اپنے فتوے سے رجوع کروں جو کسی طور بھی عامتہ الناس کے مفاد میں نہیں۔ اِس ساری گفتگو میں کچھ بھی سیدے کے لیے نیا نہیں تھا لہٰذا وہ سَر جھکائے مولوی صاحب کے سامنے بیٹھا رہا کہ کب وہ بات ختم کریں اور وہ وہاں سے اُٹھ کر سنگری کی خبر لے۔ اُس کے اندر اُٹھنے والے ہیجان کا مولوی صاحب کی پہلے سے ظاہر ہو چکی باتیں بھی کچھ بگاڑ نہیں پا رہی تھیں اِس لیے کہ اُس کے اپنے اندر جنم لے چُکا طوفان اِن سے کہیں زیادہ برہم اور تلاطم خیز تھا۔ لیکن جوں ہی مولوی صاحب نے کہا

کہ انہوں نے تمام علما کرام کو اپنے فتوے سے رجوع کرنے سے انکار کر دیا ہے تو سیدے کی آنکھیں جاگ اُٹھیں۔ اُس نے پھر سے عقیدت کے ساتھ مولوی جارُاللہ کو دیکھا اور سر کو جھکا لیا۔ ندامت ہو رہی تھی اُسے اپنے آپ سے کہ کیسا کیسا بہتان اُس نے مولوی صاحب کے بارے میں صرف سوچا ہی نہیں تھا بلکہ تھوپ بھی چکا تھا۔ منجمد ہو چکی سوچوں اور اعصاب میں پھر سے حرارت جاگنے لگی۔ شادیٔ مرگ کی اِس عجیب سی کیفیت میں اُسے بس مولوی صاحب کے ہونٹ ہلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جب کہ آواز کبھی بلند کبھی مدھم، کبھی پھٹی پھٹی سی اور کبھی صاف مگر گونجتی ہوئی اُس تک پہنچ پا رہی تھی۔ ''میں اب بھی تمہاری تحریک کے ساتھ ہوں اور یقین رکھو! میں اپنا فتویٰ کسی صورت واپس نہیں لینے والا۔''

مولوی صاحب کے بارے میں سیدے کے اندیشے ختم ہوئے تو اُسے خود پر کھویا ہوا اعتماد بھی بحال ہوتا محسوس ہوا۔ اب میلہ ختم ہو، یا کئی دن اور چلے، اُسے کچھ بھی فکر نہیں رہی تھی۔ اب اُس کی پُشت پر مولوی جارُاللہ کا مضبوط ہاتھ بدستور موجود تھا جس کے دوسرے ہاتھ میں پوری بستی تھی۔ کس کی مجال تھی کہ وہ مولوی صاحب کی ہاں کو نہ کر سکے۔ مولوی صاحب کی جانب سے حمایت کی تجدید کے بعد سیدے کو اب تو گورا سرکار بھی بوریا بستر لپیٹتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے اندر کا اَکھڑ اور اڑ بنگ سیدا انگڑائی لے کر بیدار ہوا تو اُس کے ذہن میں بننے والا پہلا ہیولا سنگری کا تھا۔

''آخ تھو □ý□ý□....... سیدے کا چہرہ یکبارگی تھوک سے لتھڑ گیا۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ چہرے پر مَلا مگر وہاں تو کچھ بھی ایسا نہ تھا کہ جسے تھوک کہا جا سکتا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ کیسے سنگری کا اپنے منہ پر تھوکا ہوا اُس سے برداشت ہو گیا۔ شاید اُن حالات میں ایسا ہو گیا کہ جب اُسے اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں رہا تھا۔ اتنی تذلیل تو ایک ٹوٹا ہوا آدمی ہی برداشت کر سکتا ہے، اندر سے ٹوٹا ہوا.... اور اُس وقت وہ اندر ہی سے نہیں ہر سمت سے ٹوٹ چکا تھا۔ سنگری کا خیال کیا جاگا، سنگری کی دی ہوئی دھمکیاں بھی مسلسل دھمک کی صورت اُس کے سَر پر دھمکتی چلی گئیں۔

''اچھا! تو اب تو میرے حق میں نہیں رہی.... اگر میرے حق میں نہیں رہی تو خود ہی بول دے کہ کس کے حق میں چلی گئی.... اپنے جیتے جی تو تجھے کسی اور کے حق میں جانے نہیں دوں گا۔ تجھے شوق ہے نا آتے جاتے کے سامنے چڑا کھولنے کا تو مجھے ہنر آتا ہے اِسے چیرنے کا لات پے لات رکھ کر۔'' سیدے کو دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ کب مولوی صاحب اندر زنان خانے میں گئے اور کب سے وہ اکیلا رہ گیا۔ خیال ہی خیال میں اُس نے سنگری سے سوال جواب تو کر لیے لیکن اُس کی طبع کو جاننے کے سبب اندر کسی گوشے میں کوئی چھوٹا سا خوف بدستور موجود تھا۔ وہ بھی اُسی کی طرح اڑبنگ تھی، کبھی بھی کسی وقت کچھ بھی کر سکتی تھی۔ حجرے سے نکل کر سیدے نے جگری کو زور سے تھپتھپایا اور اُچھل کر اوپر بیٹھتے ہی اُسے ہوا بنا دیا۔ اُس کا رُخ سنگری کے گھر کی جانب تھا۔

# ۹



ہر سال کی طرح آج دوپہر ہی سے منگر کھلر تے میلے کا نظارہ کرنے ستلج کے شمالی پتن پر موجود رہا تھا۔ کم وبیش پانچ کشتیاں دن چڑھتے ہی عرس پر آ کر واپس جانے والوں کو شمالی کنارے سے جنوبی کنارے پر پہنچاتی رہیں اور کچھ کو آج بھی دعا میں شمولیت کے لیے جنوبی کنارے سے اِدھر پتن پر لاتی رہیں لیکن زیادہ رش دیگر ویلے کے بعد ہوا۔ لوگوں کی کوشش تھی کہ شام کا اندھیرا ہوتے ہی دریا عبور کر لیا جائے کہ بہتے پانی کی کیا خبر کب بپھر جائے۔ اِس کے واسطے جہاں وہ اپنے ذاتی شناسائی کو منت ترلے کی بنیاد بنا رہے تھے وہاں کشتی بان کو چوکھیرا کرایہ دینے پر بھی از خود آمادہ دکھائی دے رہے تھے۔ منگر حیران ہوتا کہ یہ لوگ اگر ویلے سر میلے سے نکل آئیں تو نہ ملاحوں کے ترلے کرنے پڑیں اور نہ ہی وادھو کرایہ دینا پڑے مگر ہر بار، ہر سال ایک جیسا رویہ۔ اُسے یوں لگتا تھا سال پہ سال گزرنے کے باوجود پتن سے آنے جانے والے لوگوں کی ذہنی سطح جہاں تھی وہیں ہے۔ ملاحوں سے وہی گلہ شکوہ کہ فالتو سواریاں کیوں بٹھا لیتے ہو مگر وہاں موجود ہر شخص جسے کشتی نہ مل پاتی وہ خود ہی کسی کشتی کی فالتو سواری بننے کے لیے کشتی بان کی منت کیے جا رہا ہوتا۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ ہو جاتا، جو ہر سال چھوٹا یا بڑا ہو کر ہی رہتا تو داروغہ کے ہاں قصوروار ملاح ہی ٹھہرتا کیونکہ اور تو کسی کی جیب سے مال پانی نکلنے کی اُمید ہی نہیں ہوتی تھی۔ اِس حال حوالے میں کچھ بھی تو منگر کے لیے نیا نہیں تھا۔ ہاں اگر کچھ نیا تھا تو مختلف مذاہب کے وہ لوگ

جنہوں نے ملتان، بہاول پور اور دیگر علاقوں سے آ کر بستی آدم واہن کے لوگوں کے ذہن بدل کر رکھ دیے تھے۔ منگر اِن جادو بیان لوگوں سے تنہائی میں پتن کنارے ملنا چاہتا تھا کیونکہ اِن کے آنے کے بعد سیدے جیسے نوجوان کی قریبی سنگت بھی سیدے کی دوست نہیں رہی تھی۔ یہ سبھی لوگ منگر کو اپنے اپنے سے لگے جنہوں نے سیدے کی جانب سے پیدا کی گئی اشتعال انگیزی میں بھی اُس کے موقف کو اتنی جرات، بے باکی اور سمجھ داری سے آگے بڑھایا کہ بستی کے لوگوں کے سامنے تصویر کا دوسرا رُخ بھی اُتنا ہی واضح ہو کر آ گیا جتنا کہ پہلے والا۔ پہلے والے میں تشدد تھا، تباہی اور بربادی تھی جب کہ دوسرے والے میں امن تھا، آبادی اور فلاح تھی۔

منگر حیران تھا کہ حالات کے ایک دم بدل جانے کے باوجود سیدا اُنہیں ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ اگر چہ بستی کے معاملات میں وہ اُس کا بدترین مخالف تھا لیکن پھر بھی منگر کو اُس کی لاعلمی، بے وقوفی اور اُڑ بنگے پن پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ جن سنگتیوں کو اپنی طاقت سمجھ رہا تھا اُن کے تو ذہن ہی نہیں بلکہ دل تک بدلے جا چکے تھے۔ بس صرف وقت پڑنے پر ساتھ چھوٹنے اور تعلق ٹوٹنے کا معاملہ رہ گیا تھا۔ یہ تین دن بستی کے لوگوں کے لیے تین پیغام لے کر آئے تھے کہ جینا کیسے ہے، مرنا کیسے ہے اور زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔ لیکن اِس کے باوجود اِس دوران منگر پر کوئی ایک آدھ لمحہ ایسا ضرور گزرتا رہا کہ جب سیدے کی حد سے زیادہ خود اعتمادی دیکھ کر اُسے اپنے آنکھوں دیکھے اور کانوں سُنے پر یقین متزلزل ہوتا دکھائی دینے لگتا۔ کیا کوئی اور طاقت بھی ایسی ہے کہ جو سیدے کو اپنے قدموں پر کھڑا کیے ہوئے ہے؟ کیا سیدا اَب بھی انگریز سرکار سے سر پھوڑنے کی بے وقوفی کر سکتا ہے کہ جب بستی کے جوانوں سے لے کر بڑے بوڑھوں تک سب کی ایک رائے ہو چکی ہے، وہی رائے جو نبلو سانسی کی تھی، مٹھل ماچھی کی تھی، خود اُس کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ سیدا اَب بھی مولوی جارُاللہ کے فتوے کی آڑ لے رہا ہو مگر اِن تین دنوں میں ہونے والی کایا کلپ کے بعد بھی کیا مولوی صاحب کا فتویٰ کارگر رہے گا؟ بہر حال کچھ ایسا تھا کہ جو شاید ابھی ظاہر نہیں ہو پا رہا تھا یا کچھ بھی نہیں تھا اور سیدا کسی خوش فہمی میں مارا جا رہا تھا۔

اِسی گو مگو حال میں پھنسا ہوا منگر دریا کنارے کیچڑ میں پھنسی ہوئی ایک کشتی پر چڑھ کر

بیٹھ گیا۔ سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا لیکن اُس کی لَلائی ابھی تک شفق پر پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ کشتی بان جو جنوبی کنارے پر اپنا آخری پُور اُتار آئے تھے وہ اپنی کشتیوں کو کنارے پر ٹھوکے گئے اپنے اپنے کِلّے کے ساتھ باندھ رہے تھے جب کہ دوسرے جو ابھی تک دریا میں تھے، وہ تیز تیز چپو چلا کر اپنی کشتیوں کو کناروں کی طرف دھکیل رہے تھے۔ وہ جن کا منگر کو انتظار تھا، اُن میں سے کوئی بھی واپس جانے کے واسطے پتن نہیں پہنچا تھا اور نہ ہی سڑک کے راستے ملتان جانے کے لیے کیونکہ ملتان جانے والی سڑک بھی پتن کے سامنے سے ہو کر گزرتی تھی۔ اب شام ڈھلے تو ویسے بھی سڑک کے راستے کہیں بھی جانے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اگرچہ منگر نے سیدے کی ماں کا دودھ پیا ہوا تھا اور اِس لحاظ سے اُس کا دودھ شریک بھائی تھا لیکن پھر بھی نجانے کیوں اُن دونوں کے درمیان صرف ایک ہی رشتہ پنپ پایا، اور وہ بھی نفرت کا۔ سیدا تو منگر سے اِس لیے نفرت کرتا تھا کہ اُس کی ماں اُس کے منہ سے اپنا تھن نکال کر منگر کے منہ میں دے دیا کرتی تھی اور وہ اپنے فطری حق سے محروم ہو کر محض بلکتا رہ جاتا۔ یوں منگر کے خلاف یہ غصہ اور حسد اُس کے ساتھ ہی جوان ہوئے اور نکاس نہ ہو سکنے کے باعث نفرت بن کر اُس کے سینے میں پلتے رہے۔ جب کہ منگر کے دل میں سیدے کے خلاف نفرت کا نہ کوئی ہیولا اور نہ ہی پکے ٹھکے خدوخال۔ وہ بہت سوچتا کہ سیدے کے سامنے آنے پر اُس کے بدن میں انکار اور مزاحمت کی سوئیاں سی کیوں چبھنے لگتی ہیں مگر کچھ واضح ہو کر سامنے نہ آتا۔ کبھی کبھی اُسے عجیب سا لگتا کہ وہ کیوں سیدے کی ہر بے ضرر بات کے خلاف بھی خوامخواہ اپنا جھنڈا نکال کر کھڑا ہو جاتا ہے مگر کوئی صورت نظر نہ آتی۔ لیکن نجانے کیوں اِسی اثنا میں اُس کے سامنے سے گزرنے والی ایک صورت کے لبوں پر بکھر آنے والی مسکراہٹ اور آنکھوں میں قربت کی اَن کہی خواہش نے مکاشفے کے ضابطے ہی بدل ڈالے۔ وہ ایک ساعت، وہ ایک پَل جو اُس کی آنکھوں میں ستلج کے متلاطم پتن کی طرح جاگا تھا، فہم و ادراک کی کئی منزلیں اُچھالتا ہوا آگے چلا گیا۔

منگر نے آج ایک مُدت کے بعد سنگری کو یوں بے باکی سے اپنی جانب دیکھتا ہوا دیکھا تھا۔ وہ اکیلی نہیں تھی، دو ہم عمر لڑکیاں اور بھی تھیں۔ وہ تینوں منگر سے چند فُٹ کی دوری پر

تھیں اور پھر وہیں سے دور ہوتی چلی گئیں۔ ڈوب چکے سورج کی اندھیرا ہوتی روشنی میں سنگری کا اُسے گردن گھما کر دیکھنا اطراف سے اِس قدر غافل کر گیا کہ وہ جان ہی نہ سکا اُس کے ہمراہ اور کون لڑکیاں ہیں۔ عجیب سا احساس تھا۔ عورت اگر اپنا آپ چھپانے پر آئے تو برہنہ ہو کر بھی مستور رہنے پر قادر ہے اور اگر اپنا آپ دکھانے پر آئے تو سات پردے بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اُس کے سانس لینے کی آواز بھی اُسے برہنہ کیے رکھتی ہے۔

اُس ایک خاص لمحے میں اپنے آس پاس اور آنے جانے والوں کے لیے ملبوس سنگری، منگر کے واسطے بے لباس ہو چکی تھی۔ جاتی ہوئی سنگری نے گو کہ صرف ایک بار اُسے گردن گھما کر دیکھا تھا مگر وہ دیکھنا منگر کو سُجھا گیا کہ سیدے کو دیکھتے ہی اُس کا خون کیوں کھول جاتا ہے۔ اُس کے ذہن میں کہیں کوئی بات بچپن سے رہ گئی تھی کہ سنگری کی ماں نے اُسے رَد کرتے ہوئے سنگری کا نکاح سیدے کے ساتھ کیوں کر دیا تھا۔ لیکن یہ بات اب تک اُس کے ذہن کی شعوری سطح پر کیوں نہ آسکی اور اِس ایک خاص لمحے کی محتاج کیوں رہی؟ یہ سوال ابھی تک اپنے جواب کی تلاش میں تھا۔

”مگر میں نے تو اِس کے باوجود سنگری کو کبھی قربت کی خواہش کے تحت نہ دیکھا، نہ چاہا تو پھر کیوں کر اُس کا سیدے کے نکاح میں ہونا میرے واسطے حسد یا رقابت کا باعث ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی ذہن کے اندر رہ گیا چھوٹا سا واقعہ یا چھوٹی سی بات، بِنا کسی بڑے تنازعے کی بنیاد رکھے اِنسانی رویوں کو اپنی سمت ہانکے رکھ سکتی ہے؟“

”رکھ سکتی ہے تو ایسا ہوا ہے...... لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سنگری اِس نفرت کی وجہ کبھی نہ رہی ہو...... وجہ کوئی اور ہو؟“...... مگر وجہ جو بھی رہی ہو حقیقت یہی تھی کہ اُن دونوں کے درمیان کبھی نہ پاٹے جانی والی نفرت کی خلیج تو موجود تھی مگر وہ کسی خاموش آتش فشاں کے جیسی تھی لیکن سنگری کا آج اُسے شہوت ناک نگاہوں سے دیکھنا اُب تک خاموش چلے آ رہے آتش فشاں کی چوٹی کو کریدنے کے مترادف تھا۔ منگر نے پریشان ہو کر دور جاتی ہوئی سنگری کو دیکھا جو دوساتھی لڑکیوں کی جوگنوں جیسی چال میں بھی اپنے چوتڑوں کے نرم گھماؤ کے سبب صاف پہچانی جا رہی

تھی۔ منگر نے آنکھ بھر کر اُسے دیکھا مگر فوراً ہی گڑبڑا گیا۔ اُسے یوں لگا کہ سنگری اپنی گردن کو پیچھے کی طرف گھمائے بغیر بھی اُسے دیکھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ منگر کو تاسف سا ہونے لگا کہ آج سے پہلے سنگری اُسے اِس طرح کیوں دکھائی نہیں دی تھی؟ شاید خود اُس نے ہی آنکھ اُٹھا کر مکھن اور ماکھی سے بھرے اس کٹورے کو اِس طرح نہیں دیکھا تھا۔ بستی کی بہو بیٹیاں سب کی سانجھی نہ بھی سمجھی جائیں تو کون ہوتا جو سنگری کو آنکھ اُٹھا کر دیکھتا جو ویسے بھی سیدے جیسے اُکھڑ اور اَڑبنگ کے حق میں تھی۔ اگرچہ مُکلاوا نہیں ہوا تھا لیکن جائیداد تو اُسی کی تھی، اِس لیے کوئی اور ایسے دَھن کو کیوں تکتا کہ جس پر کسی اور کے نام کی مہر لگی ہو۔

''لیکن اب ایسا کیا ہو گیا۔ کیا کوئی سازش کہ سیدا اُسے سنگری کے ذریعے بستی میں بدنام کرا کر جان سے مارنا چاہتا ہے یا پھر سنگری کا سیدے سے بدگماں ہو کر کسی اور کی طرف ملتفت ہونا!'' منگر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کشتی سے اُٹھ کھڑے ہونے میں ہی عافیت جانی مگر پھر بھی خیالات کے گرد دھال سے چھٹکارا نہیں پا سکا تھا۔ ''سنگری اگر سیدے سے بدگماں ہے بھی سہی تو پھر اُس کا انتخاب ہی کیوں اور وہ بھی کاغذ لیے بغیر۔ ہو سکتا ہے اِن میں سے کچھ بھی ٹھیک نہ ہو اور سنگری اُسے دیکھ کر بلاوجہ مسکرا دی ہو لیکن پھر وہ کیا تھا جو اُس کی آنکھوں میں تھا؟''



# ۱۰

اُدھر ستلج کے جنوبی کنارے پر انڈس ویلی ریلوے کے سائٹ آفس میں کھلبلی کی سی کیفیت تھی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ کمپنی کے چیف ریذیڈنٹ انجینئر جان برنٹن نے اچانک اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اگر چہ استعفے کا معاملہ اُس کے منظور ہونے تک محدود سطح پر خفیہ رکھا گیا تھا مگر نجانے کیسے اِس کی خبر دیکھتے ہی دیکھتے نچلے کیمپوں تک پھیل گئی۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسے ملک میں جو قانونی اعتبار سے تو تاج برطانیہ کی نو آبادی ہو لیکن اِس کے باوجود اُسی نو آبادی میں ایک برطانوی ریلوے کمپنی کو انتہائی مخالفانہ ماحول میں بھی کام کرنے کا موقع نہ مل رہا ہو تو ایسے میں اُس کمپنی کے ملازمین اِس درجہ مایوس اور چڑچڑے نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے۔

جان برنٹن کو استعفیٰ دینے کے بعد ریلوے کمپنی کے ضوابط کے مطابق اُس کی قبولیت کا فیصلہ آنے تک نہ صرف اپنے عہدے پر برقرار رہنا تھا بلکہ معمول کے امور بھی انجام دینا تھے لیکن اِس کے باوجود اُس نے اپنے آپ کو اپنے کیمپ تک محدود کر لیا اور کسی بھی قسم کے امور کی انجام دہی سے اجتناب کرنے لگا۔ استعفیٰ اگر چہ ذاتی وجوہات کی بنیاد پر دیا گیا تھا لیکن اِس کی وجوہات کچھ اتنی بھی ڈھکی چھپی نہیں تھیں بلکہ سب پر ظاہر تھیں کہ گزشتہ ایک ماہ سے بہاول پور کے قریب دریائے ستلج پر پُل بنا کر کوٹری سے آتی ہوئی ریلوے لائن کو ملتان تک مِلانا عملی طور پر ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ جان برنٹن کو غصہ مقامی لوگوں پر نہیں تھا بلکہ اِنڈس ویلی ریلوے کے اعلیٰ منتظمین اور ملتان

کی مقامی انتظامیہ پر تھا جنہوں نے اُس کے کسی بھی تار پر کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے بجائے جملہ معاملات ''انتظار اور مزید انتظار'' کے نام پر لٹکائے ہوئے تھے۔ اِس طرح جان برنٹن کا استعفیٰ ذاتی وجوہات کے بجائے ''زیرِ احتجاج'' تصور کیا جا رہا تھا۔

جان برنٹن نے استعفیٰ اگرچہ کل شام ہی بذریعہ ٹیلی گراف ہیڈ آفس میں بھجوا دیا تھا مگر حسبِ سابق ''انتظار کریں'' کے دو لفظی واپسی پیغام کے سوا کہیں کسی جنبش کے آثار نہیں تھے۔ آج کا آدھا دن گزرا تو شب بھر سے جاگتے چلے آ رہے انجینئر کے اعصاب جواب دے گئے۔ اُس نے الماری سے وہسکی کا اپنا پسندیدہ برانڈ نکالا اور پیگ بنا کر اِس کے تیز تیز سِپ لینے لگا۔ دوسرا پیگ بھی اُس نے اُتنی ہی تیزی سے حلق میں اُنڈیلا اور نڈھال ہو کر دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذہن تو قدرے سکون میں آ گیا تھا لیکن وہاں اُٹھنے والے سوالات جوں کے توں تھے کہ جن کے اودھم نے جان برنٹن کو گذشتہ کئی دنوں سے ہلکان کر رکھا تھا۔

''کمپنی اور حکومت آخر دونوں چاہتے کیا ہیں؟ یا تو کوئی فیصلہ کیا جائے اور اگر نہیں تو اُسی پر ہی چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے کام کو کیسے کرتا ہے اور کیسے تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ مگر اُدھر تو مہینہ بھر سے ہر بات کے جواب میں انتظار، انتظار اور انتظار۔ آخر کوئی کتنا انتظار کرے۔ اگر نہیں کرنا کام تو لپیٹیں سب کچھ اور جائیں اپنے اپنے گھروں کو مگر اُس کی بھی اجازت نہیں۔ تو کیا کریں، کیسے سامنا کریں اپنے سٹاف اور اپنے آپ کا۔ اب یہی حال رہا تو کیسے چلے گی حکومت برٹش کراؤن کی یہاں انڈیا میں۔ اِس سے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سو سالہ شاہی بہتر تھی۔ کم از کم اِن باسٹرڈ انڈینز کو تو رگڑا لگائے رکھتی تھی۔''

کیمپ کے باہر رکھی دستی گھنٹی بجی تو جان برنٹن کے ذہن میں اُبلتے ہوئے سوالات لمحہ بھر کے لیے ساکت ہو کر رہ گئے۔ اُس نے سر اُٹھا کر کیمپ کے دروازے پر پڑے بھاری پردے کی طرف دیکھا اور کچھ اندازہ لگاتے ہوئے بُلاوے کی آواز دے دی۔

پردہ ایک طرف ہوا تو ایک قبول صورت خاتون تمام تر جسمانی دلکشی مگر چہرے پر سنجیدہ تاثرات کے ساتھ نپے تلے قدم اُٹھاتی اندر چلی آئی۔ جان برنٹن کے لبوں پر در آنے والی

مسکراہٹ محض رسمی نہیں تھی۔

''آؤ ایما...... تم ابھی تک اِدھر ہو؟''

ایما نے بھی جوابی مسکراہٹ میں بتلا دیا کہ وہ اِس صورتِ حال میں اُسکے واسطے کتنی فکر مند ہے۔ جان برنٹن نے اُس کے چہرے کو پڑھا تو اپنے تاثرات چھپانے کے لیے نگاہیں جھکا کر پیگ بنانے لگا۔

''تم لوگی؟''

ایما نے اثبات میں سر ہلا کر ساتھ رکھی کُرسی کو جان برنٹن کے قریب گھسیٹا اور دونوں گھٹنے آپس میں جوڑے ہوئے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ ایما کا پیگ بنانے کے بعد جان نے اُسے تھمایا اور ایک دوسرے کے لیے نیک خواہشات کے اظہار کے بعد دونوں ہلکی ہلکی چُسکیاں لینے لگے۔ لگتا تھا کہ وہ دونوں موجودہ حالات میں کوئی بھی بات شروع کرنے سے گریزاں تھے کیونکہ دونوں وہ سبھی کچھ جانتے تھے کہ جو اِس مرحلے پر کہا جاسکتا تھا۔ لہٰذا کیا تبصرہ کیا جاسکتا تھا ماسوائے خاموش رہنے کے۔

ایما پینتیس چھتیس برس کی سکاٹش خاتون تھی۔ بیک وقت مہم جو مگر دھیمے سُروں میں مست رہنے والی ایک حلیم، دردمند اور سادگی شعار عورت جو انڈس ویلی ریلوے کمپنی کے جونیئر منتظمین میں شامل ہوئی تو اُسے حسبِ خواہش بہاول پور آفس میں تعینات کر دیا گیا۔ روہڑی سے بہاول پور تک ریلوے لائن کے سروے اور پھر ریلوے لائن بچھائے جانے کے عمل میں ایما کبھی کبھی ہفتے کی دوپہر کو اِنڈس ویلی کے سائٹ آفس میں آجاتی جہاں ہفتے بھر کی یبوسیت سے جان چھڑانے کی غرض سے جب فیلڈ انجینئرز خوب موج مستی کرتے تو یہ اپنی موجودگی سے احساس دلاتی کہ وہ اُن کے شغل میں اُن کے ساتھ ہی ہے۔ لیکن اِس دوران اُس کی کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ وقت اپنے ہم عمر انجینئرز کے بجائے چیف ریذیڈنٹ انجینئر جان برنٹن کے ساتھ گزارے جو ہفتے کی رات کو بھی عموماً اپنے کیمپ ہی میں رہتا اور اِس دوران اپنی پسندیدہ شراب شیواز کی چُسکیاں لیتے ہوئے مسلسل اپنی پہلے سے منظور شدہ ڈرائنگز میں موقع کی مناسبت سے مزید جدت

پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا کہ جس سے نہ صرف انڈس ویلی ریلوے کمپنی کے اخراجات میں کمی ہو بلکہ کام کا معیار بھی اپنے ممکنہ عروج کو چھونے لگے۔ جونیئر انجینئرز کے ساتھ ہلکے پھلکے ہنسی مذاق کے بعد جب ایما جان برنٹن کے کیمپ میں آتی تو پہلے پہل رسمی کلمات کی تبدیلی اور شیواز کے دو تین پیگز سے زیادہ کی نوبت نہ آتی۔ ایما کے پاس شاید کہنے کو الفاظ کم تھے یا اُس کی قوت ِ اظہار جان برنٹن کے روبرو کم مائیگی کا شکار ہو جاتی، بہر حال جو بھی تھا اُس کے سبب جان برنٹن اپنے آپ کو سہولت میں محسوس نہیں کر پاتا تھا۔ شروع شروع میں وہ اکثر ایما کی موجودگی کو اپنے کام میں مخل ہونا خیال کرتا۔ مگر دو تین مہینوں کے بعد اِس طرح کایا کلپ ہوئی کہ ایما کی موجودگی اُس کی تخلیقی فکر کو شیواز سے زیادہ مہمیز کیے رکھتی۔ کچھ عرصہ بعد تو ایما کی خاموش موجودگی نے کچھ ایسا جادو جگایا کہ اُس کا ہفتہ بھر نہ ہونا جان برنٹن کی قوت متخلیہ کو معکوس اعتبار سے متاثر کرنے لگا اور وہ ہفتہ بھر نہ صرف اُس کے آنے کا انتظار کرتا بلکہ کچھ ایسے پیچیدہ معاملات شبِ ہفتہ کے لیے ٹال رکھتا کہ جو ایما کے آنے پر زیرِ غور لائے جائیں۔ کچھ دن اور گزرے تو ایما دھیمے دھیمے لہجے میں جان برنٹن کے ساتھ اُس کے پیشہ ورانہ مشاورت میں بھی دخیل ہونے لگی تھی۔ لیکن اُس دو پہر کو وہ چاہتے ہوئے بھی جان برنٹن سے استعفےٰ کی وجوہات پوچھ نہیں پا رہی تھی۔ اِس لیے نہیں کہ استعفےٰ کی وجوہات ڈھکی چھپی تھیں، محض اِس لیے کہ کسی بہانے تو جان برنٹن کے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔

تیسرا پیگ ختم ہوا تو ایما یکا یک اُٹھ کھڑی ہوئی مگر جان برنٹن نے آنکھ اُٹھا کر بھی اُس کی جانب نہیں دیکھا۔ آج نہ تو اُس کی تخلیقی فکر کو مہمیز کی حاجت تھی اور نہ ہی قوتِ متخلیہ کو کسی پیچیدہ گتھی کے سلجھانے کی تگ ودو۔ بس سر جھکائے گلاس کی اندرونی سطح سے چمٹے ہوئے شیواز کے کچھ قطروں کی رنگت کو تکے جا رہا تھا جو اپنے کُل سے بچ جانے کے بعد نہ تو اپنا رنگ باقی رکھ سکے تھے اور نہ ہی ذائقہ۔ جان برنٹن کے اُداس اور شکستہ انہماک نے ایما کے اندر کی مہربان عورت کو اس طرح کریدا کہ وہ دو قدم اُٹھا کر سیدھی اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اپنی بانہیں عمر کے ساٹھویں برس کو چھوتے ہوئے جان برنٹن کے گلے میں ڈال دیں۔ جان نے چونک کر اوپر کی طرف دیکھا۔ ایما کے لب ہی نہیں آنکھیں تک ایک ڈھارس کی صورت اُس کے سامنے بچھے جا

رہے تھے۔اب کے حیرت جان برنٹن کی آنکھوں سے اُمڈ کر پورے چہرے پر ساکت ہوگئی۔ ایما نے اِس لمحے کو رائیگاں نہیں جانے دیا اور شیواز کے سرور میں غرقاب اپنے ہونٹ جان کے لبوں پر رکھ دیے۔ حیرت کہیں جان برنٹن کی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے پاتال میں گم ہوچکی تھی اور ایما کے لبوں پر پھیلی ہوئی ڈھارس اَب جان کے رگ وپے میں اُترتی چلی جارہی تھی۔

یہ ایک طویل بوسہ تھا؛ ایک عورت کی جانب سے خودسپردگی سے ماورا ہوکر وارفتگی کا مظہر کہ جس میں کائنات کے تخلیقی تسلسل پر مامور دو فریق اپنی جسمانی ہم آہنگی کے ذریعے زندہ رہنے کے ہُنر سے آشنائی کے مراحل میں تھے۔ زندگی اگر روح کی موجودگی میں کہیں ٹوٹ کر بکھرنے کو ہو تو اُس میں کسی محبوب بدن سے منتقل کی گئی ذرا سی جسمانی حدت، تھوڑی سی محبت کا اتصال اُسے ریزہ ریزہ ہونے سے بچالیتا ہے۔ اُن دونوں کے ہاں بھی بدن میں پیوست ہوچکے کانٹے اپنی پلکوں سے چُن لینے کا عمل کہیں لبوں میں منتقل ہوچکا تھا۔ یہ بوسہ طلب، تفہیم اور تلاطم کے مراحل سے گزرتا ہوا باہمی تشفی اور تسکین پر مُنتج ہوا تو ایما ایک ادائے سرشاری سے اُٹھی اور جان کی آنکھیں وا ہونے سے پہلے ہی کیمپ سے باہر چلی گئی۔

جان برنٹن کو اپنی آنکھیں کھولنے میں دیر لگی۔ وہ ایما جیسی سنجیدہ اور ہر قسم کے اسکینڈلز سے دور رہنے والی لڑکی سے اِس نوعیت کے رویے کی توقع نہیں کر پا رہا تھا۔ گو کہ اُس نے اِس سے پہلے بھی ایما کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات دیکھ رکھے تھے مگر وہ بہر طور جنسی وابستگی کی خواہش سے عاری ہوا کرتے۔ وہاں اگر کچھ ہوتا تو محض احترام اور ستائش، اِس کے سوا کچھ نہیں۔ جان سمجھتا تھا کہ وہ پختگی کی اُس منزل پر ہے کہ جہاں کامیابی سے اپنے دلی جذبات اور ذہنی کیفیت کو چھپا سکتا ہے مگر یہ کیا کہ ایما نے اُس کا شخصی بھید جان لیا اور اُس کی ڈھارس کو چلی آئی۔ جان برنٹن کو بیک وقت اپنے آپ سے شرمندگی بھی تھی اور طمانیت کا بے پایاں احساس بھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ ایما نے اُس کے روم روم میں سے مایوسی کو نچوڑ کر اطمینان اور اُمید کو سمو دیا ہے۔ اُس کے اندر کا کھولاؤ کسی قدر فراست میں منقلب ہو چکا تھا۔ رات کے جگراتے اور مسلسل بے قراری کے بعد اُس پر چھائی ہوئی یبوسیت بے معنی سی ہو چکی تھی۔ اُس نے پھر سے

آنکھیں موند لیں اور اپنے خشک ہو رہے ہونٹوں پر زبان پھیری جہاں نہ صرف ایما کے ہونٹوں کا لمس بلکہ ذائقہ تک موجود تھے۔ اُسے اپنی بیوی مُیری یاد آئی جس کے ساتھ خلوت میں کیے گئے آخری اختلاط کو زمانہ بیت چکا تھا۔ شاید تین برس پہلے انڈیا آتے ہوئے کہ جس کا اَنت ایک الوداعی بوسہ، بے مہر اور برفیلا سا جس میں سے نسوانی حلاوت اور حدت دونوں عنقا ہو چکے تھے۔ جان نے سوچا کہ ہونٹ تو محض علامت ہیں۔ اِن میں مٹھاس اور گرمائش تو دل کی دھڑکنیں اُنڈیلتی ہیں۔ جہاں کسی کے واسطے دل دھڑکنے کی نوبت ہی نہ آئے تو پھر کہاں کی شیرینی، کہاں کی حدت اور حلاوت!

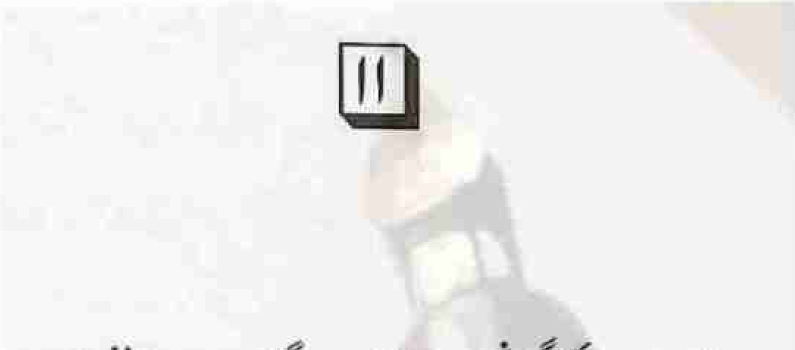
مُیری کا خیال آیا تو جان برنٹن کو یاد آیا کہ مستعفی ہونے کے بعد اس کے بیٹے ولیم آرتھر نے پلٹ کر اُس کی خبر ہی نہیں لی حالانکہ وہ اسی سائٹ آفس میں گزشتہ تین مہینوں سے موجود ہے۔ شاید وہ اُس کا احتراماً سامنا نہیں کر پا رہا ہوگا۔ مگر کیوں؟ باپ کی پریشانیوں کی خبر گیری میں بیٹے کے لیے احترام کا مسئلہ کیوں در آتا ہے؟ بات جو بھی تھی، کچھ جچی نہیں تھی۔

کافی دیر کے بعد جان برنٹن کرسی سے اُٹھا تو اُسے سگار کی طلب ہو رہی تھی۔ سگار کے پہلے کش کے ساتھ ہی اُس کے لبوں پر موجود ایما دھواں بن کر پورے وجود میں پھیلتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ جان نے اپنے خیمے کی کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو ایما اُسے اپنے خیمے سے نکل کر تیز تیز قدموں کے ساتھ سائٹ آفس کے بیرونی دروازے کی طرف جاتی دکھائی دی۔ جان نے پہلی بار اسکرٹ میں ملبوس جاتی ہوئی ایما کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ ریل کی پٹڑی کی طرح توازن میں ترتیب گیا اُس کا بدن جان کو ستلج کے پُل سے اُتر کر بہاول پور کے ریتلے ٹیلوں میں داخل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ حیرت ہو رہی تھی کہ ایما اب تک اُسے اِس طرح دکھائی اور سُجھائی کیوں نہیں تھی؟ وہ تو کئی کئی گھنٹے اُس کے پاس گزارا کرتی رہی تھی مگر کبھی احساس ہی نہ ہوا کہ اُس کے قرب میں کوئی نسوانی وجود بھی ہے۔

''تو کیا صنفِ مخالف کے ہاں صنفی احساس جگانے کے لیے جسمانی موجودگی سے زیادہ جسمانی اتصال ضروری ہے؟''...... جان کے ذہن میں اُٹھنے والے سوال اُس کی ذہنی

کیفیت کو مسلسل رگیدے جا رہے تھے اِس لیے بھی کہ یہ نہ تو کبھی اُس کا موضوع رہے تھے اور نہ ہی اُس کی پیشہ وارانہ ترجیحات میں شامل۔ ایک سیدھا سادہ انجینئر جسے اپنے کام کے سوا عورت سمیت کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ لیکن آج کی اِس اعصاب شکن کیفیت میں ایما کے لبوں کی محض اُس کے لبوں تک رسائی اُسے اُن تمامی عذابوں سے نجات دلا چکی تھی کہ جن میں وہ گرفتہ چلا آ رہا تھا۔ اُس کا دل چاہا کہ اپنے منصب، اپنی حیثیت، اپنی پروقار سنجیدگی اور پیشہ ورانہ اُنا کو خاطر میں لائے بغیر ایما کو آواز دے کر واپس بُلا لے اور اپنے ساتھ کچھ وقت اور گزارنے کو کہے۔ پہلی بار اُسے کسی عورت کی صحبت کی طلب اپنی پسندیدہ شراب شیواز اور کیوبن سگار سے کہیں سوا ہو رہی تھی۔

"لیکن ایما جیسی وضع دار اور مہذب لڑکی کا یوں چلے جانا کہیں یہ تو ظاہر نہیں کرتا کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے اور پچھتا رہی ہے؟"..... جوں ہی یہ خیال جان برنٹن کے ذہن کو چھو کر گزرا اُسے اپنے اعصاب پھر سے نامعلوم بوجھ تلے دبتے اور چٹختے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ نڈھال انداز میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُس نے میز کے کونے پر لگی ٹیلی گرام مشین کو دیکھا کہ جو ابھی تک ساکت چلی آ رہی تھی۔



# ۱۱

رات کا پہلا پہر ابھی گزر نہیں پایا تھا کہ سیدا جگری پر سوار اپنی مخصوص وارداتی خاموشی کے ساتھ سنگری کے دروازے پر جا پہنچا۔ وہ جوں ہی گھوڑے سے اُترا تو جگری نے اگلے پاؤں اُٹھا کر اگلے احکامات کے لیے اپنی بے تابی ظاہر کی مگر سیدے کی ایک تھپکی نے اُسے شانت کر دیا۔ جگری کو وہیں چھوڑ کر سیدے نے سامنے والے گھر کے ویہڑے کی چھوٹی سی دیوار پھلانگی اور اندر داخل ہو کر داخلی دروازے کی کنڈی کھول دی اور پھر اندھیری رات کے اندھیرے میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد سیدے کی واپسی ہوئی تو اُس نے ایک ہاتھ پاؤں اور منہ بندھے نسوانی وجود کو کندھے پر ڈالا ہوا تھا۔ سیدے کو دیکھ کر جگری نے ایک بار پھر ہنہنائے بغیر اگلے قدموں سے زمین کھرچ کر ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار ہونے کی اطلاع دی۔ سیدے نے قریب آ کر لڑکی کو زِین کی طرح گھوڑے کی پشت پر ڈالا اور دوسرے ہی لمحے ایک جست کے ساتھ خود بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سیدے کی ٹانگوں نے جیسے ہی گھوڑے کی پشت کو مس کیا وہ پیچھے کی طرف گھوما اور واپس اُسی سمت بگٹٹ دوڑ اُٹھا۔

کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیدا گھنے درختوں کے ایک جھنڈ میں واقع چھوٹی سی ڈیرہ نما عمارت میں داخل ہوا تو دو درمیانی عمر کے کشتی جسم کے شخص مشعلیں اُٹھائے اُس کے سامنے آ گئے۔ سیدے کو دیکھتے ہی انہوں نے احترام کے ساتھ سلام کیا اور ایک طرف ہو کر کھڑے

ہو گئے۔ سیدا گھوڑے سے اُترا تو اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر جگری کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی جب کہ سیدے نے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں چلاتی لڑکی کو واپس کندھے پر ڈالا اور اندر ڈیرے کے دالان کی طرف چل دیا۔ دوسرا شخص مشعل اُٹھائے اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ چند گز کے بعد سامنے چار کوٹھے دکھائی دیے جن کی چھتیں سرکنڈوں کی تھیں۔ اِن میں سے ایک کوٹھے میں دیے کی روشنی دور سے دیکھی جا سکتی تھی۔ سیدا سیدھا اُسی کوٹھے میں گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اِس کوٹھے میں بان کے بُنے ہوئے دو بڑے ماچے بچھے تھے جن کی سرہاندی کی طرف کپاس کے بھرے ہوئے سرہانے اور پواندی کی طرف اونٹ کی اون اور سوتی دھاگے سے بُنے ہوئے موٹے کھیس پھیلا کر بچھائے گئے تھے۔ سیدے نے کاندھے پر لدی لڑکی کو اِن میں سے ایک پر اِس طرح پھینکا کہ اُس کا سَر چارپائی کی پاٹی سے جا لگا۔ یقیناً لڑکی کے گلے سے چیخ نکلی ہو گی مگر وہ سختی سے بندھے ہوئے منہ کے سبب باہر آنے کے بجائے ٹیس بن کر اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ سیدے نے لمبا سانس لیا اور لڑکی منہ سے دوپٹہ نما کپڑا کھول دیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں والی یہ لڑکی سنگری تھی۔

منہ سے دوپٹہ کھولنے کے بعد سیدا اُس کے ہاتھ اور پاؤں کھولنے کے لیے جیسے ہی جھکا تو سنگری نے یہاں بھی سیدے کے منہ پر وہ سارا تھوک اُگل دیا جو کافی دیر سے اُس کے منہ میں جمع ہوتا چلا آ رہا تھا۔

"کمینے..... حرامی... آج تک کسی نے اپنے نکاح والی عورت کو بھی اُٹھایا تھا جو تو اُٹھا لایا ہے۔ ہمارے مرد تو سَر ہتھیلی پر رکھ کر دوسروں کی عورتوں کو کھلے عام اُن کی مرضی سے نکال لاتے ہیں مگر آدم واہن والوں نے یہ کیسا ہیجڑا جنا کہ جو اپنی ہی عورت کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے زبردستی دوسروں کے ڈیرے پر لے آیا ہے۔" سنگری نے اُس کے منہ پر تھوکنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کا غصہ بھی باہر تھوک دیا لیکن ابھی وہ آخری جملے کا آخری لفظ ہی کہہ پائی تھی کہ چہرے پر پڑنے والے یکے بعد دیگرے کئی تھپڑوں نے اُسے چارپائی سے زمین پر پٹخ دیا۔ زمین پر گرتے ہی ہاتھ پاؤں بندھی سنگری کو اپنی ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ پورے بدن پر بلا سوچے سمجھے پڑنے والی

ضربوں سے پہلے پہل تو سنگری اِس قدر چیخی کہ لگتا تھا کوٹھے پر پڑی ہوئی سرکنڈوں کی چھت نیچے آن گرے گی۔ مگر جب مسلسل ٹھوکریں مارتے ہوئے سیدے کا دل نہ پسیجا تو سنگری کے گلے سے ایسے گرگاٹ نکلنے لگے کہ جیسے کسی جانور کو ذبح کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود سیدے کے جنون میں کوئی کمی نہ آئی۔ نجانے کب سیدے کو احساس ہوا کہ سنگری کے گلے سے نہ صرف گرگاٹ نکلنے بند ہو چکے ہیں بلکہ اُس کا جسم بھی بے جان ہو کر اِدھر اُدھر لڑھک رہا ہے۔ سیدے کا غصہ یکدم منجمد ہو کر رہ گیا اور وہ سنگری کے بے حس و حرکت جسم کو حیرت سے دیکھتا ہوا قریبی ماچے کی پاٹی پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ دیے کی تھرتھراتی لو میں سنگری کا پورا بدن بھی تھرتھراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سیدا ایک بار پھر گھبرایا ہوا سا اُٹھ کھڑا ہوا اور ویسے ہی ہانپتا ہوا سنگری کے قریب گیا اور اُس کی ناک اور منہ کے سامنے ہاتھ رکھ کر سانس کا آنا جانا محسوس کرنے لگا۔

وہ بے ہوش ہوئی تھی، مری نہیں تھی۔

سیدے نے کوٹھے کے ایک کونے میں دھری ''یک گھڑی'' گھڑاونج پر رکھے گھڑے میں سے پانی کا کٹورا نکالا اور واپس جا کر سنگری کے چہرے پر ہلکے ہلکے چھینٹے مارنے لگا۔ سنگری ہوش میں آنا شروع ہو چکی تھی۔ سیدے نے اُس کے ہاتھ پاؤں کھولے اور واپس آ کر ماچے پر بیٹھ گیا۔ اُس کی سانس ابھی تک درست نہیں ہوئی تھی۔ سنگری کے ہاتھ پاؤں کھولتے ہوئے سیدے کی نگاہ اُس کے ہاتھوں پیروں پر نگی تو اُن کی بھری بھری جاذبیت جہاں نگاہوں کو خیرہ کر گئی وہاں اُن کا ملائمانہ لمس سیدے کی آنکھوں میں اُترتا چلا گیا۔ اب ماچے پر بیٹھے ہوئے بھی سیدے کی نگاہ وہیں کچے فرش پر پڑی ہوئی سنگری کے ہاتھوں پیروں پر رُک سی گئی تھی۔ کئی سال ہوئے ایک جوگی نے کہا تھا کہ عورت کی خوب صورتی اُس کے پاؤں سے شروع ہوتی ہے اور پاؤں پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بات تب تو اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر آج سنگری کے ہاتھ اور پیر دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلا کہ جوگی نے کچھ ایسا بھی غلط نہیں کہا تھا۔

جوں جوں سیدے کی سانس درست ہو رہی تھی اُسے شدید تاسف ہو چلا تھا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے۔ کوئی بھلا اپنے نکاح میں آئی ہوئی عورت سے بھی ایسا سلوک کرتا ہے اور وہ بھی

سنگری جیسی نازک اور ملوکڑی لڑکی سے۔ کتنا مارا ہے اُسے بے دردی سے۔ کیا حال کر دیا ہے اُس کے پھول جیسے جسم کا۔

''اور اُس نے جو دو بار میرے منہ پر تھوکا ہے، ایک بار جوتا مارا ہے تو کیا کوئی عورت اپنے سر کے سائیں سے بھی ایسا وَرتاوا کرتی ہے؟''...... سیدے کے ذہن میں اُبھرنے والے سوالوں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ مگر یہ جواز اور یہ تسلیاں اُن کراہوں میں دب گئیں جو سنگری کے حلق سے نکل رہی تھیں۔ اُس کے بے ہوشی سے ہوش میں آنے کے عمل میں شاید جسم سے اُٹھنے والی درد کی ٹیسیں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ سیدے نے گردن جھکا لی مگر زیادہ دیر تک نہ جھکا سکا۔ بند آنکھوں کے ساتھ درد سے کراہتی ہوئی سنگری نے ہلکی سی کروٹ لی تو اُس کا گھاگھرا کمر تک کھسک گیا۔ کوٹھے میں دیے کی تھرتھراتی روشنی ایک دم ماند پڑتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن اِس کے باوجود سیدے کے لیے نگاہیں ہٹانا ممکنات میں نہ رہا۔ کیا کوئی نسوانی جسم اتنا بھی دلکش ہو سکتا ہے کہ سارے احساسات ہی کو جب چاہے ٹھٹھرا کر بے عمل کر دے اور جب چاہے حدت کے پیمانے کا معیار بنا دے۔ سیدے کی کنپٹیاں مسلسل کھولاؤ کے احساس کے بعد اب دہکنا شروع ہو چکی تھیں۔ اُسے یوں لگا کہ کسی نے اُسے بالوں سے پکڑ کر اُس کا سر بھڑکے ہوئے تندور کے منہ میں دے دیا ہے۔ سنگری کے دودھیا زیریں جسم پر سیدے کے پاؤں کی ٹھوکروں کے نشان نیلگوں دھبوں کی صورت جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ سیدے کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی مگر اُس نے جنونی انداز میں سر کو جھٹکتے ہوئے نفرت کے اِس احساس کو بھی جھٹک دیا۔

''سارا قصور اِسی حرام زادی کا تو ہے''..... سیدا ماچے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تھوکتی تھی نا مجھ پر.... اب خود ہی تھوک ہوئی پڑی ہے کنجری.... یہ مجھے جوتے مارے اور میں بٹھاؤں اِسے سر آنکھوں پر..... یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بہت شوق تھا نا تمھیں ہر ایک آتے جاتے کے سامنے چڈا کھول کے لیٹ جانے کا تو اب ذرا اُٹھ اور دیکھ کون کس کے سامنے چڈا کھولے پڑا ہے۔''

سیدا اُکھڑے اُکھڑے انداز میں سنگری کے قریب جا کر ایک دو بار اُس کے گرد گھوما

اور پھر اُس کی رانوں کے قریب وہاں اُکڑوں ہو کر بیٹھ گیا کہ جہاں سے اُس کا گھا گھرا اُلٹا ہوا پڑا تھا۔ کچھ عجیب سی ذہنی کشمکش میں گرفتہ ہو چکا سیدا کوئی بھی فیصلہ کن قدم اُٹھانے سے گریزاں لگ رہا تھا۔ بیک وقت اگر ایک جانب وہ سنگری کے جسمانی خدوخال کو دیکھ کر جذباتی طور پر برانگیختہ اور بے قابو ہو رہا تھا تو دوسری جانب سنگری ہی سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ اُس کے جسم کو ٹھوکروں سے اُڑا کر بھی انتقام پورا نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسے میں بے ہوشی سے ہوش کی جانب سرکتی ہوئی سنگری کے برہنہ جسم کو جوں ہی کسی مرد کے ناگوار قرب کا احساس ہوا تو اُس میں ایک شدید کپکپاہٹ سی ہوئی اور وہ اپنی بقا کی جستجو میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی پہلی نگاہ سیدے پر پڑی تو نفرت ایک سیاہی بن کر اُس کے چہرے پر پھیلتی چلی گئی مگر جوں ہی اُسے گھاگھرے کے ہٹ جانے اور اپنے زیریں بدن کی برہنگی کا احساس ہوا، وہ ایک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُچھلی، گھاگھرے کو درست کیا اور دو تین قدم پیچھے کی طرف کھسک گئی۔ سنگری کے تئیں سیدا اُسے برہنہ کرنے کے بعد مزید پیش قدمی کی طرف جا رہا تھا۔ یہ سوچتے ہی اُس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ باکرہ سے اَنواسی ہونے کے خوف میں مبتلا سنگری، اپنے آپ کو بچا رکھنے کی جہد میں گھسٹتی ہوئی دو تین قدم اور پیچھے کی طرف ہٹی تو سہی مگر ماچہ پڑا ہونے کے سبب مزید دور جانا ممکن نہ رہا۔

سنگری جیسی اُکھڑ اور ہتھ چُھٹ لڑکی کو یوں بے بسی سے گھسٹتا دیکھ کر سیدے کو محسوس ہوا کہ جیسے اُس نے ساوی کے پانچ چھ کٹورے چڑھا لیے ہوں۔ تلذذ اور تسکین کا احساس پورے بدن میں سرشاری پیدا کیے چلا جا رہا تھا۔ وہ سنگری کے بدن کو نگاہوں سے ٹٹولتا ہوا اُٹھا اور دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے لے جا کر اُن کی اُنگلیاں آپس میں پھنسائیں اور ایک زوردار انگڑائی لی جس میں دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں سے نکلنے والے کڑاکے بھی شامل تھے۔ چند لمحے پہلے اُس کے ذہن میں کھلبلی مچائے ہوئے دو متضاد رویے اب ایک ہی نکتے پر مرکوز ہوتے دکھائی دینے لگے تھے اور وہ نکتہ تھا سنگری کے پھاوا پھاوا ہوئے جسم کی رہتی سہتی اکڑ کو اُس کی اُخیر تک پہنچانا۔

سنگری بھانپ چکی تھی کہ سیدا اب کیا کرنے والا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اُس جیسے شخص کے سامنے کیا جانے والا منت ترلا اُلٹا اُس کی خوئے وحشت کو ہوا دیتا ہے لہٰذا جو کرنا تھا اُس

نے خود ہی کرنا تھا۔ سیدے کو اپنے قریب آتا دیکھ کر سنگری نے اِدھر اُدھر نگاہ گھمائی۔ اُسے سیدے کے خنجر کی تلاش تھی کہ جو عموماً وہ اپنی پنڈلی سے باندھ کر رکھا کرتا تھا مگر آج وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کو متلاشی انداز میں گھومتا دیکھ کر سیدا زور سے ہنسا۔

''آج تیرے کام کچھ نہیں آنے والا...... بس تو جان لے کہ حق والیوں کا اگر دماغ خراب ہو جائے تو اُنہیں رنڈی کیسے بنایا جاتا ہے۔'' سنگری کی آنکھیں خوف سے کچھ اور پھیل گئیں۔ اُس نے پورے بدن کی طاقت سے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا چاہا مگر اُس کے دھکے ہوئے جسم نے درد کی اُٹھنے والی ٹیسوں کے سبب ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ سیدے کی جانب سے مسلسل لگائی گئی اندھی ٹھوکروں کی وجہ سے اُس کا بدن اگر اندر واندری کٹا ہوا نہیں تھا تو پھٹا ہوا ضرور تھا۔ بے بسی کے اِس عالم میں سنگری اگر خود نہیں رو رہی تھی تو اُس کی آنکھیں ضرور پانی بہا رہی تھیں۔ وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ آپ ہی آپ بہے چلے جا رہے آنسو بدن دریدگی کے سبب ہیں یا وہ واقعی سیدے کے عزائم سے خوفزدہ ہو چکی ہے۔

سیدا اب اُس کے اتنا قریب آ چکا تھا کہ وہ اُس کے جسم سے اُٹھنے والی پسینے اور گرد کی بو کو بہت بری طرح محسوس کرنے لگی تھی۔ اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا اور منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ کیسے خود کو سیدے کے ارادوں سے محفوظ رکھا جائے۔ مگر وہ پھر بھی بے بس چڑیا کی طرح شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اُس نے سوچا کہ ماچے کے پاوے سے ٹیک لگا کر بیٹھنے ہی میں کوئی ایسی ترکیب کرے کہ سیدے کو منہ کی کھانی پڑے۔ چہرہ ہاتھوں میں چھپا ہونے کے باوجود سنگری کا ذہن جہاں بچاؤ کی تلاش میں بُری طرح گھومے جا رہا تھا وہاں اُس کا پورا جسم آنکھ بن کر سیدے کی جانب سے کی جانے والی کسی بھی کسی بھی حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ سنگری کی یہ کیفیت دیکھ کر سیدے کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ شاید اپنی طاقت کے استعمال میں گریز اور بے بس ہو چکی سنگری کی بے وقوفانہ مزاحمت کی اِس کیفیت کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد ہنسی رُکی تو اُس نے سنگری کے بدن کو بچوں کے سے انداز میں جگہ جگہ سے چھیڑنا شروع کر دیا۔ کبھی پیٹ میں گدگدی کرتا کبھی سینے کو چھیڑتا اور کبھی رانوں کی طرف

ہاتھ بڑھاتا۔ اِس ہذیانی عمل کے دفاع میں سنگری کے چہرے سے اُس کے ہاتھ ہٹ چکے تھے اور اب اُس کے ہاتھ وہاں وہاں لپکتے کہ جہاں جہاں سیدا اپنا ہاتھ بڑھانے کا جھانسا دیتا۔ تھکا دینے والے اِس عمل نے چند ہی لمحوں میں سنگری پر جھلاہٹ طاری کر دی اور اُس نے سیدے کو پرے دھکیلتے ہوئے خود کو اُس کی پہنچ سے دور کرنا چاہا۔ مگر پہلے سے تیار سیدے نے ایک ہی جھٹکے سے اُس کی چولی کو سامنے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا۔ سنگری کا سینہ بالکل برہنہ ہو چکا تھا۔

لاچاری کی انتہا پر پہنچ چکی سنگری کبھی دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھتی اور کبھی ہر اُس جگہ پر کہ جہاں جہاں سیدا اُسے اب بھی چھیڑے اور بے اختیار ہنسے جا رہا تھا۔ سنگری تڑپ رہی تھی مگر سیدے سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس دوران سنگری نے گھاگھرے کے ایک حصے کو تھوڑا سا اوپر کر کے سینے کو ڈھانپنا چاہا مگر سیدے نے ایک ہی جھٹکے میں اُسے گھاگھرے سے آزاد کر کے اِس طرح کر دیا کہ اپنا آپ چھپانے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ سنگری نے اب کے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔

''روتی کیوں ہے کملی! تیری تو آج سہاگ رات ہے، کوئی زنا تھوڑا ہے۔ جو حق میں ہو اُس کا کیا رونا...... یہ حق والیاں، گھر والیاں، اِن کا تو کام بھی عجیب ہوتا ہے.... اپنے سر کے سائیں کے منہ پر تھوکنا، انہیں جوتے مارنا اور جب وہ تھوڑا سا، اتنا سا پیار کرنے لگیں تو رونا شروع کر دینا...... میری جان! اپنے آنسو وقت سے پہلے ضائع نہ کرو...... رونے کا وقت تو ابھی آیا نہیں، جب وہ ویلا آیا تو پھر کیا بہاؤ گی؟ میرا اٹو!...... دیکھو نا! میں تو ہوں تمہارا گھر والا،.... میں تم سے جو بھی کروں وہ ہے میرا حق، اپنا حق وصول کرنے کے بعد میں نے تمہیں دے دینی ہے طلاق اور یہاں سے چلے جانا ہے..... تیرا میرا رشتہ تو ختم نا...... ہاں میرے جانے کے بعد جو یہاں اس ڈیرے پر پندرہ بیس مُشٹنڈے ہیں... وہ جو تم سے پُل بندی کی صورت کریں گے اُسے ضرور زنا کہتے ہیں، اُس وقت رو لینا اور بہت ہی رَج کے رو لینا..... پھر میں تم سے پوچھوں گا کہ کس کس کے منہ پر تھوکا اور کسے کسے جوتا مارا.... اری کملی! منہ میں تھوک اور پاؤں میں جوتا رہے گا نا تو تھوکو گی بھی سہی اور جوتا بھی پھینکو گی۔'' آنے والے وقت کی دہشت سے سنگری کے اعصاب

جواب دیتے محسوس ہونے لگے تھے مگر اِس سے پہلے کہ وہ پھر ہوش میں نہ رہتی، سیدے نے اُسے دونوں بازوؤں میں اُٹھایا اور اُٹھا کر ماچے پر پھینک دیا۔

اتنے میں کوٹھے کا بند دروازہ کافی زور کے ساتھ باہر سے دھڑ دھڑایا گیا۔ سیدے اور سنگری دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا مگر دونوں کے چہروں پر اُبھرنے والے تاثرات کی نوعیت مختلف تھی۔ ایک کے چہرے پر ناگہانی پریشانی اور دوسرے پر حیرت اور کچھ کچھ اضمحال کی ملی جلی پرچھائیاں۔ سیدا جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں پھر کسی نے باہر سے دراوزہ پیٹا اور سیدے کو آواز دی۔ آواز سیدے کی جانی پہچانی تھی لہٰذا وہ فوری طور پر دروازے کی طرف لپکا اور اندر والی کنڈی کھول دی۔ باہر وہ دونوں مشعل بردار پریشان حالت میں کھڑے تھے۔ اُن دونوں کی جانب سے سیدے کو دی گئی خبر اس سے بھی زیادہ پریشان کن تھی کہ آج آدھی رات کے بعد ابھی ابھی انگریز سرکار نے اپنی پوری قوت سے بستی آدم واہن کے قبرستان سے ریلوے لائن گزارنے کا آپریشن شروع کر دیا ہے۔ پوری بستی کے گرد اُن کے فوجی کھڑے ہیں، نہ کوئی آ سکتا ہے اور نہ کوئی جا سکتا ہے جب کہ بڑی بڑی مشینیں لا کر قبرستان کی قبروں کو اُکھاڑا جا رہا ہے۔

اس اچانک خبر نے سیدے کو حواس باختہ کر دیا۔ اُس نے اپنے باقی ساتھیوں کے متعلق اُن سے پوچھا تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ بپھرے ہوئے سیدے نے مزید حواس باختہ ہو کر اُن دونوں کو بھی گھونسے جڑ دیے اور کہا کہ ''حرام زادو! میرا جگری لاؤ، میں ابھی پہنچتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ انگریز کیسے ماں .......!'' سیدے نے گالی اتنی منہ بھر کر دی کہ وہ دونوں جگری کو لانے دوڑ پڑے۔ ''اور ہاں تم دونوں بھی اپنے گھوڑے لیتے آؤ.... اکٹھے نکلتے ہیں۔''

سیدے کو بہت غصہ تھا سنگری کو اُس کے انجام تک نہ پہنچا سکنے کا۔ اندر کوٹھے میں آیا تو وہ نیم برہنہ کواڑ کی اوٹ میں چھپی ہوئی تھی۔ ''حرام زادی! تو بہت منحوس ہے میرے لیے، جب سے تو میرے ناویں لگی ہے کامیابیاں میرے پاس آتے آتے راستہ بدل لیتی ہیں۔ میں تو اب چلا، تو بھی جا..... ہم دونوں ایک دوسرے کے نصیب میں نہیں تھے۔ گورا سرکار نے بستی پر دھاوا بول دیا ہے، اگر میں بچ گیا تو اپنا اُدھار وصول کروں گا اور اگر مارا گیا تو قبر سے آ کر تجھے گھسن

کروں گا۔"

اتنے میں باہر جگری کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ سیدا حسرت سے سنگری کو دیکھتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ جگری پر سوار ہوتا ایک چھوٹی مگر تیز دھار کلہاڑی کوٹھے کے اندر سے تیر کی طرح آئی اور سیدے کے بائیں بازو کو مس ہو کر جلد کو چھیلتی ہوئی آگے جا گری۔ سیدے نے حیران ہو کر پیچھے کی طرف دیکھا تو دروازے میں سنگری اُسی طرح نیم برہنہ کھڑی ہوئی تھی جس کے چہرے پر کلہاڑی کا وار خطا جانے کا تاسف ابھی تک موجود تھا۔ وہ برق کی سی رفتار سے واپس پلٹا مگر سنگری نے کواڑوں کو زور سے دھکیل کر اندر سے کنڈی لگالی۔ سیدا اور بھی پاگل ہو گیا اور دائیں کندھے کی مسلسل ضربات سے دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ دروازہ مضبوط تھا مگر جب دونوں مشعل بردار بھی سیدے کے ساتھ جُو گئے تو اندر کی کنڈی ٹوٹ کر اندر ہی جا گری۔ سیدا کسی شکاری کتے کی طرح اندر داخل ہوا اور دروازے کے پیچھے چھپی ہوئی سنگری کو گردن سے دبوچ کر ماچے پر گرادیا۔

"بہت کُتی چیز ہے تو.... تقدیر لکھنے والے نے تو تجھے میرے ہاتھ سے بچ جانے کا موقع دیا تھا مگر جو عورت اپنی تقدیر خود لکھنا چاہتی ہو اُسے تو پھر تقدیر لکھنے والا بھی نہیں بچاتا بلکہ ایک طرف ہو جاتا ہے۔" سیدے نے اپنا کُرتا اُتارا اور ایک طرف پھینک دیا اور اِسی طرح دھوتی بھی۔ جب کہ سنگری کا گھاگھرا تو محض ایک جھٹکے کی مار تھا سو اُسے بھی جھٹکا دے دیا۔ "میں نے اپنا مقصد بھی کھوٹا کیا اور کام بھی اور ساتھیوں کو بھی انگریزوں کے سامنے مرنے کے لیے چھوڑ دیا لیکن اب اگر یہ کام کر کے نہ جاتا تو قسم ہے پیدا کرنے والے کی مر بھی نہیں سکتا تھا۔"

سیدا کوٹھے سے باہر نکلا تو رات کا ایک اور پہر گزر چکا تھا۔ اب نہ اُس کے دماغ میں اُبال تھا اور نہ چہرے پر جھنجھلاہٹ۔ بلکہ اطمینان اور وہ بھی فاتحانہ۔ باہر نکلتے ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں چھلانگ لگا کر جگری پر سوار ہوا لیکن اِس سے پہلے کہ وہ اسے ایڑی دکھاتا وہ گھوڑے کو کوٹھے کے دروازے تک لایا، اُترا اور اُتر کر اندر گیا۔ پھر باہر نکلا تو سنگری کو اُس نے چادر میں لپیٹ کر کندھے پر ڈالا ہوا تھا۔ اب کے اُس نے اُسے زین کی طرح گھوڑے کی پشت پر ڈالنے کی

بجائے اپنے آگے بٹھایا اور جگری کو ایڑ دکھا دی۔

وہ تینوں گھڑسوار غیر معروف راستوں سے ہوتے ہوئے بستی کے قریب جا نکلے جہاں قبرستان سمیت بستی کے اطراف میں روشنی کے لیے آگ کے الاؤ جلائے گئے تھے۔ انگریز فوجیوں نے واقعی بستی کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ سیدے کا دل بھر آیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آج پیر زندہ کرامت کے میلے آخری دن جب کہ ابھی میلہ پوری طرح کھلا بھی نہیں تھا، یہ دھوکے باز لوگ اچانک ہی اُن کے وڈکوں کی ہڈیاں بکھیرنے اور اُن کی تذلیل کرنے نکل کھڑے ہوں گے۔ سیدے نے جگری کو خاموش چال پر رکھ کر خطرہ مول لیتے ہوئے سنگری کو اُس کے گھر سے ہر ممکن قریب جگہ پر جا کر اُتارا۔ وہ نڈھال سی وہیں بیٹھ گئی۔

''سُن ! میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا.... تو میرے نکاح میں تھی اور میں نے تیرے ساتھ سہاگ رات گزاری...... تو نے میرے منہ پر تھوکا اور میں نے تیری کوکھ میں، حساب برابر۔ تو نے مجھے جوتا مارا اور میں نے تمہیں جوتے، یہاں معاملہ گڑبڑ ہوا.... مگر قصور تو تیرا تھا... خیر اگلے جہان ملیں گے تو حساب فرشتے کرلیں گے۔ جا اب میں نے تجھے آزاد کیا، طلاق دی، طلاق دی اور طلاق دی۔ میں نہیں چاہتا کہ تو سیدے کی بیوہ کہلائے اور لوگوں کے نیچے لیٹنے کا شوق بھی پورا کرے۔''

سیدا واپس گھوما تو اُس کے دونوں ساتھیوں کو انگریز فوجی نہایت خاموشی سے گرفتار کر چکے تھے جب کہ اُن کا ایک اور جتھا دبے پاؤں اُس کے گرد گھیرا تنگ کرتا چلا آ رہا تھا۔ حیرت سے اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ ایک ہی ساعت میں موت کا اندھیرا اُس کی آنکھوں کے سامنے کیا لہرایا اُس کا پورا وجود ہی سُن ہو کر رہ گیا۔ موت تو آنی ہی تھی مگر اتنی جلدی؟ یہ اُس کی سوچ میں بھی نہیں تھا۔ مایوس ہو چکے سیدے نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی سنگری کو دیکھا۔ ایک تلخ مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''عجیب طرح کی حرام زادی ہے تو.... طلاق کے بعد بھی میرے لیے منحوس ہی رہی۔''

یہ کہہ کر اُس نے جگری کو ہوا ہو جانے والی ایڑ دکھائی، اُس طرف کہ جہاں سے گھیرا توڑ کر نکل جانے کا کچھ تو امکان ہو سکتا تھا۔ سیدے کو اُس جانب جاتا دیکھ کر انگریز فوجیوں کا پورا جتھا بھی اپنے برق رفتار گھوڑوں کی پیٹھ ٹھوکتے ہوئے اُسی طرف لپکا۔



# ۱۴

انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کے سائٹ آفس میں رات کے آخری پہر بھی دن کا سا سماں تھا۔ ہر شخص پرجوش اور ایک عجب سے ہیجان میں مبتلا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے کی نفری نے کسی بھی ناخوش گوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے سائٹ آفس کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اگرچہ شام ڈھلے تک کچھ بھی امکان نہیں تھا کہ آج کی رات فیصلہ کن ہوگی مگر آٹھ بجے ٹیلی گراف مشین پر ہونے والی ہلکی سی ٹِک ٹِک نے پورے کا پورا ماحول ہی بدل کر رکھ دیا۔ سب سے پہلے ملنے والا پیغام جان برنٹن کے استعفے کے نامنظور کیے جانے کا تھا جب کہ دوسرا پیغام جو انتہائی خفیہ کی ہدایت کے ساتھ جاری ہوا وہ انتظامیہ اور فوج کی طرف سے آپریشن ''گوتھرو'' کا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی اطلاع ملی کہ ملتان انتظامیہ کا چیف اور مقامی فوج کی کور کا لیفٹیننٹ کرنل پندرہ منٹ کے بعد آپریشن کی حتمی جزئیات طے کرنے وہاں پہنچنے والے ہیں۔

جان برنٹن پر چھائی ہوئی شادمانی دیکھنے کے لائق تھی۔ طبعاً اپنے خول میں بند رہنے والے جان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی بے پایاں خوشی کا اظہار کرے بھی تو کس طرح کرے۔ اُس کا صرف آج کا دن ہی نہیں دن بلکہ گذشتہ ایک ماہ کا عرصہ جس طرح سے گزرا تھا، وہی جانتا تھا۔ ویسے آج تو اعصاب شکنی کی حد ہوگئی تھی کہ جب اُسے اپنے استعفے کا جواب تک نہیں مل پا رہا تھا۔ اگر ایما اپنے غیر متوقع بوسے سے اُس کی ذہنی کیفیت کو نہ بدلتی تو مارے تناؤ کے اب تک اُس

کی اعصابی ہلاکت ہو چکی ہوتی۔ جان برنٹن کو اپنے انجینئرنگ اسکول کا ایک بوڑھا ٹیچر سیموئل یاد آیا جو انہیں ''انہونی کی اخلاقیات'' پڑھایا کرتا تھا۔ اُس کے مطابق اگر کسی مرد کی زندگی میں پریشانیوں کے سبب مایوسی نے اُمید کے تمام دروازے بند کر رکھے ہوں تو کسی ایک مہربان عورت کا عطا کیا ہوا جسمانی لمس معجزاتی طور پر سبھی دروازے کھول کر اُس کی زندگی کو کامیابیوں کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ اِس کے برعکس یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی نامہربان عورت سے ناگوار جسمانی اتصال ایک کامیاب زندگی کو ناکامیوں کے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔

''تو کیا ایما اُسے دل سے چاہتی ہے؟ کیا اُسی کا عطا کیا ہوا والہانہ بوسہ کرشماتی طور پر اُسے مایوسیوں کے اندھیروں سے باہر نکال لایا ہے؟''..... جان برنٹن نے تیزی سے شیواز کا ایک پیگ اپنے اندر اُنڈیلا اور اِس موضوع کو کسی فراغت کے وقت پر اُٹھار کھنے کا سوچ کر جلدی جلدی اُن کاغذات کو ترتیب دینے لگا جن کی میٹنگ میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ بہرحال فوری طور پر تسلیم شدہ حقیقت یہ تھی کہ ایما کا چند ساعتوں کا مہربان قرب اُس کے لیے خوش بختیوں کے دروازے وا کر چکا تھا۔

جیسے بارہ منٹ گزرے جان برنٹن اپنے خیمے کے برابر والے خیمے میں چلا گیا کہ جہاں ایک بڑی سی میز پر مختلف نوعیت کے آپریشنل نقشے بچھے ہوئے تھے۔ اُس کا بیٹا ولیم آرتھر، سائٹ انچارج جم اور کچھ دوسرے جونیئر آفیسر وہاں پہلے سے موجود تھے۔ جان برنٹن کا کھلکھلاتا ہوا چہرہ اُن سب کے لیے بھی خاصے کی چیز تھا۔ ایک ماہ سے زائد عرصے کے ذہنی تناؤ اور بے یقینی حالات کے بعد کمپنی کے چھوٹے بڑے سبھی ملازمین نے سکھ کا سانس لیا تھا مگر جان برنٹن جیسی کیفیت کسی کی بھی نہیں تھی۔ خود ولیم آرتھر نے اِس سے بھی زیادہ مشکلات سے بچ نکلنے کے بعد اپنے والد کو کامیاب و کامران دیکھا تھا مگر اُس کا رویہ مدبرانہ سطح سے کبھی نیچے نہیں آیا تھا۔ لیکن آج اُس کے چہرے پر بچوں جیسا نہالا پن کسی اور جذبے کی غمازی کر رہا تھا جس میں پیشہ ورانہ عزم کی کاملیت کے ساتھ ساتھ ذاتی احساسات کی نمودِ نو بھی شامل تھی۔ یہ سب کیا تھا، اِس کا مکمل ادراک ابھی تک خود جان برنٹن کو بھی نہیں ہو سکا تھا۔

ٹھیک تین منٹ کے بعد خیمے کے باہر اطلاعی گھنٹی بجی اور پردہ ہٹنے پر دو اشخاص اندر داخل ہوئے اُن میں سے ایک ملتان انتظامیہ کا چیف کیپٹن البرٹ والٹر اور دوسرا مقامی کور کا لیفٹیننٹ کرنل ہیری تھامسن تھا۔ دونوں آدم واہن کے پتن سے دو میل آگے کی جانب کشتیوں کے پُل سے گزر کر ستلج کے جنوبی کنارے کی طرف آئے تھے۔ جان برنٹن نے اپنا اور اپنے دیگر افسروں کا تعارف کرانے میں لمحہ بھر کی تاخیر بھی نہ کی اور مختصر ابتدائی کلمات کے بعد جہاں کیپٹن البرٹ والٹر سے ملتان کی انتظامیہ کے لائحہ عمل کے بارے میں پوچھا وہاں انڈس ویلی ریلوے کے ملازمین کی ذمہداریوں کے متعلق بھی استفسار کیا۔ خلاف توقع کیپٹن البرٹ کی بجائے کرنل ہیری اُس سے مخاطب ہوا اور بتایا کہ انڈس ویلی ریلوے کے ملازمین کو اپنے پیشہ ورانہ امور کی انجام دہی کے علاوہ کسی معاملے میں دخل نہیں دینا۔ ملتان کور سے آئی ہوئی فوج رات ایک بجے بستی آدم واہن کو کارڈن آف کرلے گی اور جب تک لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، قبرستان کا وہ حصہ جہاں جہاں سے ریلوے لائن گزرنی ہے، علیحدہ سے فوج کی نگرانی میں رہے گا۔ باقی رہے انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کے انجینئرز کے ذمے امور تو وہ رات تین بجے کے بعد ریلوے ٹریک کا تعمیراتی سامان آدم واہن بستی اور اُس کے قبرستان تک پہنچانا شروع کردیں گے۔ اسی طرح پُل بنانے والی جگہ سے دریا کا رُخ موڑنے کا بندوبست بھی ہنگامی بنیادوں پر کل صبح سویرے شروع ہو جانا چاہیے تاکہ ستون بنائے جانے کے لیے کھدائی شروع ہو سکے ورنہ دو ماہ کے بعد دریا میں پانی کی سطح بلند ہونا شروع ہو جائے گی۔

جان برنٹن نے حیرت، مسرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات سے کرنل ہیری کی جانب دیکھا۔ وہ سمجھ گیا اور باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ''کمپنی کی جتنی لیبر یہاں سے بھاگ گئی تھی وہ سب انتظامیہ کی تحویل میں تھی اور تک سائٹ کیمپ کے گیٹ پر پہنچ چکی ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ تربیت یافتہ لیبر جو دریا کے پانی کا رخ موڑنے کے لیے چاہیے، اُس کا بھی بندوبست کرلیا گیا ہے اور کچھ دیر میں وہ لوگ بھی پہنچ جائیں گے۔ اب آپ لوگ تین بجے والے اشارے کا انتظار کریں۔ ہمیں اس کے علاوہ ریزرو لیبر کا بھی بندوبست کرنا ہے۔''

وہ دونوں جانے کے واسطے مڑے تو کیپٹن البرٹ اُنہی قدموں پر رُکا اور جان برنٹن کا ہاتھ مصافحے کے سے انداز میں تھام کر بولا ''انتظامیہ کو کبھی انڈر ایسٹیمیٹ نہیں کرتے۔ اس کے کام کرنے کا اپنا طریقہ کار اور اپنا انداز ہوتا ہے۔ اِس میں اُتاول نہیں کی جاتی بلکہ دشمن کے خود ہی اپنے جال میں پھنسنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اور ہاں صبح دیکھنا! قبرستان کو ہم نے نہیں بلکہ خود اُن لوگوں نے مسمار کرنا ہے کہ جو اِس کے باقی رہنے کے لیے اپنی جانیں دینے کو تیار تھے۔'' کیپٹن البرٹ نے اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے جان برنٹن کے ہاتھ کو زور کا ہلایا مگر اُس کی آنکھوں کی حیرت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ ''آپ شاید اُن باغیوں کا پوچھنا چاہ رہے ہیں کہ جنہیں ہم نے ڈھیل دے رکھی تھی، ہیں نا؟''

جان برنٹن نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اُن میں سے اکثر نے تو بغاوت چھوڑ دی ہے اور جو باقی بچ گئے ہیں اُن کی قبروں کے لیے بستی کے شمال مغرب کی طرف بننے والے نئے قبرستان میں کافی جگہ رکھ دی گئی ہے۔'' کیپٹن البرٹ والٹر نے ایک بار پھر جان برنٹن کے پکڑے ہوئے ہاتھ کو مصافحے کے سے انداز میں زور کا ہلایا اور وہ دونوں گڈ لک کہتے ہوئے خیمے سے باہر نکل گئے۔ اُن دونوں کے خیمے سے باہر جاتے ہی جم اُٹھ کر جان برنٹن کے پاس آیا اور اُس کی آنکھوں میں جھانک کر اِس طرح دیکھا کہ جیسے یاد دلا رہا ہو ''میں نہ کہتا تھا کہ انتظامیہ کو کبھی انڈر ایسٹمیٹ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کے رموز اور اس کے امور الگ الگ اور معاملات جدا۔'' جان برنٹن نے جم کی بات کا بظاہر کوئی نوٹس نہ لیا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔ جم سمیت باقی آفیسرز اور انجینئرز بھی، جو کیپٹن البرٹ اور کرنل ہیری سے ملاقات کے وقت خیمے میں موجود تھے وہ جان برنٹن کے پیچھے باہر نکل آئے۔ اُن کے باہر آتے ہی مین گیٹ سے اطلاع ملی کہ ایک مہینہ پہلے بھاگی ہوئی لیبر کے کم و بیش سبھی افراد باہر موجود ہیں اور اندر آنے کی اجازت کے خواہاں ہیں۔ جم کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے کی باری اب جان برنٹن کی تھی۔ جم سمجھ گیا کہ اُسے کیا کہا جا رہا ہے لہٰذا جونیئر آفیسرز میں سے دو کو اُس نے فوری طور سائٹ آفس کے صدر دروازے پر بھجوا دیا گیا تاکہ حاضر آ چکی لیبر کو آپریشنل ہدایات کے لیے

اکٹھا کیا جا سکے۔ اتنے میں جان برنٹن کو ایک اور بند لفافہ پہنچایا گیا جس میں دو سو چالیس ایسے تربیت یافتہ پیشہ وروں کی فہرست تھی کہ جو ابتدائی طور پر دریا کا رُخ موڑنے اور ستونوں کی بنیادیں کھودنے کے کام میں مہارت کے حامل تھے۔ اِن لوگوں نے صبح چار بجے سائٹ آفس میں حاضر ہونا تھا۔ اُن کے گروپس اور شفٹیں کیسے بنانی ہیں اور کام کا آغاز کیسے کرنا ہے، یہ سبھی کچھ چیف ریذیڈنٹ انجینئر جان برنٹن پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جان نے یہ فہرست بھی جم کو تھما دی اور زبانی کہہ دیا کہ یہ لوگ جوں ہی حاضر ہوں اُن کی اَسی اَسی کی تین شفٹیں بنا کر اُسے اطلاع کی جائے۔

ہواؤں میں اُڑنے والا محاورہ جان برنٹن کی موجودہ کیفیت کو بیان کرنے کے لیے ناکافی محسوس ہو رہا تھا۔ جم نے بھی محسوس کیا کہ اُسے ہدایات دیتے ہوئے جان برنٹن کا لہجہ غیر ضروری طور پر تحکمانہ ہو گیا تھا مگر اُس نے حالات کی نوعیت کے پیشِ نظر اُسے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔ جان برنٹن اپنے آپ ہی سے بڑبڑا کر باتیں کرتا ہوا اپنے خیمے میں چلا گیا اور وہیں اپنی جونیئر کمانڈ کو بلا لیا جس میں اُس کا بیٹا ولیم آرتھر بھی شامل تھا۔ اگرچہ ایک بجنے میں ابھی کافی دیر تھی مگر جان کے لیے اب مزید انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس نے گلے میں لٹکی ہوئی دوربین دائیں ہاتھ میں پکڑ کر آنکھوں پر لگا لی اور دریائے ستلج کے پار بستی کی آبادی کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی بھی ایسی حرکت دیکھنے میں نہیں آئی جس سے کسی بہت بڑے آپریشن سے پہلے کا گماں ہو سکتا ہو۔ اُسے کیپٹن البرٹ اور کرنل ہیری کا آنا خواب اور اُن کی باتیں یاوہ گوئی سی لگنے لگیں۔ جان نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور اضطراب کی حالت میں وہسکی کی فلاسک کا ڈھکن تیزی سے کھول کر اُسے منہ سے لگا لیا۔ ولیم آرتھر اپنے والد کی پل پل بدلتی ہوئی کیفیت کو بھانپتے ہوئے اُس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ابھی ایک بجنے میں کچھ دیر ہے''.... ولیم آہستہ سے بڑبڑایا جیسے کہہ رہا ہو کہ ابھی اُتاولا ہونے کی ضرورت نہیں۔

''جانتا ہوں''..... جان نے اُتنی ہی آہستگی سے جواب دیتے ہوئے فلاسک کو ایک بار پھر اپنے منہ سے لگا لیا۔ ''میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ملتان کور کی فورس ایک بجے بستی کو کارڈن

آف کرے گی اور ہم نے قبرستان کی سائٹ پر میٹریل تین بجے پہنچانا شروع کرنا ہے۔ ابھی ہم اپنی حاضر ہو چکی لیبر کو آرام کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اڑھائی بجے تک یہ لوگ تازہ دم ہو چکے ہوں گے۔'' اپنے باپ کے رویے کے برعکس ولیم آرتھر نہ صرف پُرعزم تھا بلکہ وہ معاملات کو کسی شک کے بغیر دیکھ رہا تھا۔

جان برنٹن نے ولیم کی گفتگو کو اَن سُنی کرتے ہوئے اپنی کئی جیبوں والی بشرٹ میں سے سگار کو ڈھونڈ کر نکالا اور اُسے سلگانے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ولیم نے جھٹ سے اُسے سگار سلگانے میں مدد کی اور جان پہلے کش کے ساتھ ہی پرسکون ہوتا چلا گیا۔ غالباً وہسکی اُسے اعصابی تناؤ سے نکالنے میں ناکام رہی تھی۔ ''تمہیں تو معلوم ہے ولیم کہ میں نے ایک سال پہلے اِنڈس ویلی ریلوے کمپنی کی ملازمت کے دوران کس قدر جان جوکھم میں ڈال کر کوٹری سے ملتان تک ریلوے ٹریک بچھانے کا سروے کیا تھا۔ اب جب کہ کوٹری سے سکھر اور روہڑی سے بہاول پور تک ریلوے ٹریک کی بنیادیں بنائی جا چکی ہیں اور آدم واہن سے ملتان تک کا حصہ بھی تکمیل کے قریب پہنچ چکا ہے تو یہ محض پندرہ میل کا ٹکڑا میرے لیے عذاب بنا دیا گیا جس میں دریائے ستلج پر ایمپرس پُل بنانا بھی شامل ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے نہ صرف بیرونی محاذ پر مخالفتوں کا سامنا ہے بلکہ ہمارے اپنے پبلک اینڈ ورکس ڈیپارٹمنٹ کے لوگ بھی نہیں چاہتے کہ یہ پُل میرے ہاتھوں بنے۔'' ولیم نے آخری جملے پر حیران ہو کر اپنے والد کی طرف دیکھا مگر پھر خاموش ہو گیا۔ فلاسک سے وہسکی کا ایک لمبا گھونٹ لینے کے بعد سگار کے کش نے اُسے پھر سے تازہ دم کر دیا تھا۔

''تم ولیم سینٹ جان گالوے کو تو جانتے ہو گے۔'' ولیم کے چہرے پر ناآشنائی کے تاثرات دیکھ کر جان برنٹن کا لہجہ قدرے بلند اور تلخ ہو گیا کہ جیسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''وہی گالوے جو نہیں چاہتا تھا کہ میں سنڈی ریلوے کمپنی کے ختم ہونے کے بعد انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کا حصہ بنوں اور اِس پراجیکٹ پر کام کروں۔'' ولیم کے چہرے سے یوں لگا کہ جیسے اُسے بہت کچھ یاد آ گیا ہو۔ ''لیکن میرے بیٹے! یہ پراجیکٹ میرا عشق ہے، میں برصغیر کے تین دریاؤں پر کاٹھی ڈال کر انہیں مسخر کرنے کے پراجیکٹ کا حصہ ہوں۔ اِن میں ایک دریا سندھ ہے اور دوسرا

یہ ستلج جس میں تیسرا بیاس بھی شامل ہے۔ اِن دریاؤں نے کبھی کسی انسان کو اپنے اوپر پُل نہیں بنانے دیا لیکن میں اِن دو جڑواں دریاؤں ستلج اور بیاس کو مسخر کرنے جا رہا ہوں اِن پر لوہے کا پُل بنا کر۔ چار ہزار دو سو چوبیس فٹ طویل اِس پُل میں میں نے سولہ درے ڈیزائن کیے ہیں اور ہر درے کے بیچ میں دو سو چونسٹھ فُٹ کا فاصلہ ہوگا۔ مگر وہ ولیم گالوے نہیں چاہتا کہ اِس پُل کی تکمیل میرے ہاتھوں ہو۔ وہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے یہ پُل مجھ سے ہتھیانا چاہتا ہے اِسی لیے تو اُس نے اپنے خاص آدمی ہیوج لیووِن کو پُل کے پراجیکٹ کا اسسٹنٹ انجینئر لگا رکھا ہے۔" جان برنٹن نے ایک بار پھر فلاسک سے وہسکی کا لمبا گھونٹ لیا اور اُس کے بعد سگار کا طویل کش۔ ولیم آرتھر حیران ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے والا ہواؤں میں اُڑتا ہوا اُس کا باپ اِس لمحے کس قدر اعصابی شکست و ریخت کا شکار ہے۔

"میرے بیٹے میری بات سنو! میں کبھی بہت اچھا یا مثالی شوہر نہیں رہا۔ میں نے اپنے پروفیشن کو ہمیشہ گھریلو معاملات پر ترجیح دی اور ہزاروں میل دور چلا آیا۔ میری ازدواجی زندگی ایک سوکھی شاخ کی طرح ہے جس پر بہار آنا بھول چکی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جس کام کے لیے مجھے پیدا کیا گیا تھا وہ کام میں نے اپنے ساتھ پیدا ہونے والے لاکھوں لوگوں سے بہتر کیا ہے اور یوں میرے مرنے کے بعد میرا نام اِس دنیا کے کسی کونے کھدرے میں ایسے شخص کے طور پر لکھا رہ جائے گا کہ جس نے خدا کی اِس تخلیق کی خوب صورتی میں اضافہ کیا اور اِس میں اپنے جیسے انسانوں کے لیے آسانیاں پیدا کیں۔" جان برنٹن ایک لمحے کے لیے رُکا۔ اُس کی آواز رُندھ گئی تھی مگر جلد ہی اُس نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔

"سنو ولیم! اگر اِس دوران میں مر جاؤں یا مجھے مار دیا جائے تو پوری کوشش کرنا کہ یہ پُل اور یہ ریلوے ٹریک میرے خوابوں کے مطابق تکمیل کو پہنچے۔" بات ابھی بمشکل مکمل ہوئی تھی اُن کے عقب میں آنے والی نسوانی چاپ نے انہیں چونکا دیا۔ دونوں نے بیک وقت پیچھے مڑ کر دیکھا تو بھاری بھرکم اوورکوٹ میں ملبوس ایما اُن کے قریب پہنچ چکی تھی۔ جان برنٹن نے حیران ہو کر ایما کو دیکھا جس کے لبوں پر ملگجی اندھیرے کے باوجود ملفوف مسکراہٹ صاف دکھائی دے رہی

تھی۔ جان کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر ایما نے ولیم کی طرف دیکھا۔ ولیم معاملے کی نوعیت سمجھتے ہوئے رسمی سی ہیلو ہائے کے بعد وہاں سے کھسک گیا۔ اگرچہ اِس وقت ایما کو سائٹ آفس میں دیکھ کر جان برنٹن کا رُواں رُواں شاداں ہو رہا تھا مگر اُس کی آنکھوں میں اُبھرا ہوا سوال ابھی تک باقی تھا۔

''آپ خیمے تک چلیں گے؟''

جان برنٹن آہستہ قدموں سے ایما کے ساتھ اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔ ''صبح تم میرے لیے خوش بختی کا پیام لے کر آئیں اور میں تمہارا شکریہ تک ادا نہ کر سکا۔'' جان برنٹن نے فلاسک سے ایک بار پھر وہسکی کا لمبا گھونٹ لے کر اپنے خشک ہوتے ہونٹ تر کرنے کی کوشش کی مگر اُس کی نگاہیں ایما کے چہرے سے زیادہ اُس کے مدھ بھرے لبوں پر ٹکی تھیں۔

''ضروری نہیں کہ میں ہر بار خوش قسمتی کی پیام بر کہلاؤں''..... ایما کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ جان کا چہرہ بھی کھلکھلانے کی کوشش میں ناکام ہو کر پھر سے سوال بن گیا۔ ''میں اِس وقت آپ کو ایک اہم مخبری دینے آئی ہوں۔''

''مخبری؟''..... جان برنٹن کا دماغ گھوم سا گیا۔ کیسے ممکن ہے کہ انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے میں کوئی مخبری ہو؟

ایما نے اپنے رس بھرے لبوں پر اُنگلی رکھ کر جان برنٹن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اُس کے بالکل قریب چلی آئی اتنی کہ اُس کے لب جان کے بائیں کان کے انتہائی قریب تھے۔ جان اِس نئی پیدا ہونے والی صورتِ حال سے مضطرب تھا۔ ''دریا کے کنارے سے بستی آدم واہن کے باہر تک ریلوے ٹریک کی فاؤنڈیشن کل شام تک مکمل نہ ہوئی تو یہ پراجیکٹ آپ کے پاس نہیں رہے گا۔'' ایما کے بولنے کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ جان کو سننے کے لیے پوری حسیات کو سماعت بنانا پڑا۔ مخبری ایسی تھی کہ اِس کا ردِعمل جان برنٹن کے اختیار میں نہ رہا۔ ''تو کس کو دیا جائے گا یہ پراجیکٹ؟''... ایما نے پریشان ہو کر انتہائی ناگواری سے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جان نے ضبط کرنے کے سے انداز میں ایما کی طرف اِس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ''کیا واقعی تم ایسا

سمجھتی ہو؟''۔ ایمانے اُس کی نگاہوں کا خفی پیغام دیکھ کر ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ جان کے پاس اظہار کی اور کوئی صورت باقی نہ رہی سوائے سر جھکا لینے کے۔

چند ساعتوں کے بعد جان نے سر اُٹھایا تو ایما چہرے پر چھائی پریشانی کے اثرات کے باوجود اُس کی طرف انہیں نگاہوں سے دیکھے جا رہی تھی کہ جیسے آج قبل از دوپہر اُسے دیکھا کیے تھی۔ جان برنٹن کے پورے جسم میں ایما کے ہونٹوں کی حلاوت حلول کرتی چلی گئی۔ ایما کے لبوں پر اب بھی طلبیدہ نوعیت کی پیاس تھی مگر باقی چہرہ اِس کیفیت میں اُس کا ساتھ دینے سے مسلسل انکار کیے چلا جا رہا تھا۔ جان برنٹن کا دل چاہا کہ اب کی بار وہ پہل کرے اور کل تک کی زندگی ایما کے لبوں سے اُدھار لے لے لیکن ایما کے لہجے کی بے مروتی اور بدن کے روکھے پَن نے جان کی پیش قدمی کے راستے میں غیر محسوس سی جھجک کو لا کھڑا کیا تھا۔ اِس سے پہلے کہ دریاؤں کو مسخر کرنے کا ہنر رکھنے والا چیف انجینئر جان برنٹن اپنی کمپنی کی ایک جونیئر آفیسر خاتون سے گفتگو آغاز کرنے کا حوصلہ مجتمع کر پاتا، وہ خیمے سے باہر جا چکی تھی۔

# ۱۳

جم کو معلوم تھا کہ اُس کی ذمے داری اگرچہ ابتدائی نوعیت کی ہے مگر اُس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اگرچہ اُس نے جان برنٹن کے احکامات کے مطابق حاضر ہو چکی لیبر کو آرام کرنے کو کہہ دیا تھا مگر خود اُسے کسی کل چین نہیں تھا۔ ایک طویل انتظار کے بعد جوں ہی گھڑی نے ایک بجایا اُس کی آنکھیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی دوربین سے چپک کر رہ گئیں۔ اُسے شدت سے انتظار تھا کہ ملتان کور کی فورس کب بستی کو اپنے گھیرے میں لے کر اُسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرے تو وہ پہلے سے تیار لکڑی کا تیرنے والا پل دریا میں اُتار دے کہ جس میں اِن دنوں پانی ویسے بھی اپنی سب سے نچلی سطح پر کہیں کہیں بہہ رہا تھا اور اِس کی تین چوتھائی سے زائد وسعت خشکی کا حصہ ہو چکی تھی۔ پانی اگر کہیں تھا تو محض آدم واہن کے پتن کے مقام پر جہاں ستلج کی چوڑائی کم اور گہرائی زیادہ ہو جایا کرتی تھی۔

جنوبی کنارے کے سائٹ آفس میں تین قسم کی تربیت یافتہ لیبر موجود تھی۔ ایک وہ جو خشکی پر ریلوے ٹریک بچھانے کے لیے پتھروں کی بھرائی والی فاؤنڈیشن تیار کرتی ہے اور دوسری وہ کہ جو اِس پر ریلوے ٹریک بچھاتی ہے جس میں لکڑی کے سلیپر ڈالنا، لوہے کی ریل کو آپس میں جوڑنے کے علاوہ فش پلیٹس کے ذریعے سلیپروں کے ساتھ مضبوطی سے فکس کرنا شامل ہوتے ہیں اور تیسری قسم کی وہ لیبر تھی جو دریاؤں میں ستون تعمیر کرنے اور اُن کی بنیادیں کھودنے میں مہارت

رکھتی تھی۔ جم نے جنوبی کنارے سے اِن تینوں اقسام کی لیبر کو گروپوں کی صورت میں ورکنگ ایریا تک پہنچانا تھا۔ جب کہ اسی قسم کی تربیت یافتہ لیبر اور تعمیراتی سامان شمالی سائٹ آفس میں آدم واہن کے مجوزہ ریلوے اسٹیشن تک پہنچایا جا چکا تھا۔ حکمت عملی یہ تھی کہ احکامات ملتے ہی لیبر نے بیک وقت اِدھر ستلج کے جنوبی کنارے اور اُدھر آدم واہن ریلوے اسٹیشن سے پتھر بچھانے کی صورت میں بنیادیں بنانے کا کام شروع کرنا تھا جب کہ پتھر صرف شمالی سمت سے فراہم کیا جانا تھا۔ اسی طرح دریا میں ستونوں کی تعمیر کے واسطے کنوئیں نما بنیادیں کھودنے کا کام صرف جنوبی کنارے سے ہونا تھا۔ مزدوروں کا ایک گروپ خاص طور پر اس لیے علیحدہ ترتیب دیا گیا تھا کہ جس نے بستی کے قبرستان کے علاقے کو سب سے پہلے کلیئر کر کے وہاں پانچ فُٹ اونچی پتھر کی فاؤنڈیشن جہاں تک ممکن ہو بچھا دینی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ مزید گزرے ہوں گے کہ آدم واہن بستی کی جانب سے بہت سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں جو کبھی واضح اور کبھی مدھم ہوتی چلی جاتی تھیں۔ اِن آوازوں کے تعاقب میں روشنی کے لہراتے ہوئے شعلے بھی تھے جو چاروں جانب کبھی دور، کبھی بہت دور اور کبھی نزدیک دکھائی دیتے تھے۔ یہ غالباً مشعلیں تھیں جو گھڑ سواروں کے ہاتھوں میں تھیں۔ ابھی تک کوئی اطلاع نہیں تھی کہ ملتان کورکی گورا فورس کو کسی مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا یا نہیں اور اگر مزاحمت ہوئی بھی تو اُس کی نوعیت کیا تھی اور نقصان کس فریق کا اور کتنا ہوا؟

جم کے نزدیک اب وہ مرحلہ آن پہنچا تھا کہ وہ چیف انجینئر جان برنٹن سے فوری طور پر اگلے قدم کی اجازت چاہتا کہ جس کے پاس حکام بالا کی جانب سے ٹیلی گرافک احکامات کا اب تک پہنچ جانا یقینی نہیں تو متوقع ضرور تھا۔ وہ تیزی سے جان کے خیمے کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی جان اُس کے راستے میں کھڑا دوربین آنکھوں پر لگائے بستی کے حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے جم! ٹارگٹ ایریا میں صورت حال کیا ہو گی؟''

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہ کھلونا چھوڑ کر ٹیلی گراف مشین کے پاس بیٹھے رہنا

چاہیے۔" ہم کے لہجے میں چھپا موہوم سا طنز جان برنٹن کے لیے نیا نہیں تھا اسی لیے اُس نے اسے خاطر میں لانا چھوڑ دیا تھا۔ "بات تو تم ٹھیک کرتے ہو لیکن کبھی کبھی۔" جان نے بھی اپنے خیمے کی طرف جاتے ہوئے تمام تر ذہنی تناؤ کے باوجود حساب چکتا کرنے کی کوشش کی۔ جواباً ہم محض ہلکا سا مسکرا دیا۔ خیمے میں داخل ہو کر وہ دونوں بظاہر ایک دوسرے سے لاتعلق ہو کر بیٹھ گئے۔ ٹیلی گراف مشین حالتِ سکوت میں تھی۔ مگر یہ اُن دونوں کے اندر کا خلجان تھا جو انہیں نارمل نہیں ہونے دے رہا تھا۔ کبھی کرسی پر پہلو بدلنا، کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگنا اور کبھی خیمے سے باہر نکل جانا۔ تناؤ تھا کہ بڑھتا چلا جا رہا تھا مگر کسی بھی متعلقہ دفتر سے کوئی خبر نہیں آ رہی تھی۔ اتنے میں خیمے کے دروازے کا پردہ ہلا اور خلافِ توقع ہیوج لیوون نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اُس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جو کہ عام طور پر ٹیلی گرافک پیغامات کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اِس لمحے ہیوج کا آنا اگرچہ جان برنٹن کو بہت کھلا تھا مگر اُس نے اپنے آپ کو نارمل رکھتے ہوئے غصے کا اتنا اظہار ضرور کیا کہ کاغذ کو اُس کے ہاتھ سے اُچک لیا۔

بہت مختصر تحریر تھی کہ آدم واہن کے مجوزہ ریلوے اسٹیشن کی سمت سے ریلوے ٹریک کی فاؤنڈیشن تیار کرنے والی لیبر کا پہلا گروپ فوج کی طرف سے کلیرنس ملنے کے بعد، فوج ہی کی نگرانی میں ٹارگٹ ایریا میں پہنچ کر کام شروع کر چکا تھا۔ "مگر یہ ٹیلی گرام یہاں میرے پاس آنے کے بجائے تمہارے پاس کیسے پہنچا؟" جان برنٹن کے لیے اپنا غصہ اور جھنجلاہٹ چھپانا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ ہیوج نے کچھ بولے بغیر ایک اور کاغذ جان کے ہاتھ میں تھما دیا جس پر ہیوج کے آفس کو لکھا گیا تھا کہ معلوم کیا جائے چیف انجینئر جان برنٹن کے آفس کی ٹیلی گراف مشین کیوں بند پڑی ہوئی ہے؟ جان نے کاغذ ایک طرف پھینکا اور اُچھل کر ٹیلی گراف والی میز کی عقبی سمت جھانکنا اور ٹٹولنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد ٹیلی گراف مشین کی تار اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اِسے سوئچ سے نکال دیا گیا تھا یا یہ کسی سبب خود ہی نکلا پڑا تھا۔ "میرے خلاف سازشیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں" یہ کہتے ہوئے جان نے بیک وقت ہیوج اور ہم کی طرف دیکھا۔ ہیوج واپس جا چکا تھا اور ہم اپنے تاثرات سے واقعی فکرمند لگ رہا تھا لیکن خاموش تھا۔ جوں ہی جان نے تار کو

واپس اپنی جگہ لگایا، ٹیلی گراف مشین نے فوری طور پر ٹِک ٹِک شروع کر دی۔ سردی کے باوجود جان کا ماتھا پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

جان نے سب سے پہلے اپنی طرف سے مختصر سا پیغام بھیج کر اپنی موجودگی کو ظاہر کیا اور پھر اُدھر سے آنے والے پیغام کے مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پہلا پیغام ہی وہی تھا کہ جس کا کئی دنوں سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ پیغام پڑھتے ہی جان برنٹن نے جم کو حکم دیا لکڑی کا تیرنے والا پُل فوری طور پر دریا کے اُس حصے پر پھیلا دیا جائے جہاں گہرا پانی موجود ہے اور اُس کے بعد ٹھیک تین بجے جنوبی سمت سے ریلوے ٹریک کی فاؤنڈیشن بنانے والی لیبر کے پہلے گروپ کو موقع پر پہنچا دیا جائے۔ ''اِس کا مطلب ہے کہ بستی کے شرپسندوں کی سرکوبی کی جا چکی ہے۔'' جانے سے پہلے جم کے اس جملے میں مکمل اطمینان جھلک رہا تھا۔ لیکن نجانے وہ کون سی وجوہات تھیں کہ جن کے سبب جان کے چہرے پر کھنچاؤ بدستور موجود تھا۔

## ۱۴

اُدھر بستی میں رات گئے پڑنے والی اُفتاد کی کوئی بھی توقع نہیں کر پا رہا تھا۔ گو کہ سیدے نے ٹھیکری پہرے پر اپنے چند ساتھیوں کو لگا رکھا تھا مگر اُن کی اکثریت بھی میلے کے اختتامی روز کے معاملات کو سمیٹنے کے سبب تھکی ماندہ جہاں جگہ ملی گھسی مُسی پڑی تھی۔ ہاں اتنا البتہ اُن سب کے درمیان طے تھا کہ جب کبھی بھی کسی انہونی صورتِ حال کا امکان بھی محسوس ہو تو مخصوص قسم کی سیٹی کی آواز کے ساتھ باقی سب کو خبردار کر دیا جائے تا کہ سیدے کی ہدایت لے کر مشترکہ کارروائی کی جا سکے۔ اِس قسم کی کارروائی کے واسطے ہر نوعیت کی حملہ آواری یا مزاحمت کے لیے الگ الگ سیٹیوں کی آوازیں مختص تھیں۔ اِس تحریک کی سربراہی اگرچہ سیدے کے پاس تھی مگر کسی بھی وجہ سے اُس کی غیر موجودگی میں تحریک کی کمان سکندرے ماچھی کے پاس آ جاتی تھی جو اپنی سفاکی اور بے ر حمانہ طبیعت کے لیے بستی کیا، بستی سے باہر بھی مشہور تھا۔ یوں تو تحریک کے ہر کارکن کے لیے ہر وقت خنجر سے مسلح رہنا لازمی تھا مگر اُنہیں حسبِ موقع دیگر ہتھیار استعمال کر لینے کی اجازت تھی۔

رات کے ایک بجے جب گورا فوج نے چاروں طرف سے بستی کو گھیر ڈالا تو سیدے کے صرف پانچ چھ ساتھی قبرستان کی بیرونی سمت اپنی اپنی جگہ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ خطرے کو بھانپتے ہی انہوں نے سیٹیاں بجانا شروع کی ہی تھیں کہ اُن کے سر پر پہنچ چکے گورے فوجیوں نے اُنہیں اُچک کر اپنے گھوڑوں پر ڈال لیا اور جن دو تین نے مدافعت کی اور خنجر نکالنے میں کامیاب ہو گئے اُن کی گردنوں کے منکے توڑ کر اُنہیں وہیں پھینک دیا گیا۔ اپنے ساتھیوں کی سیٹیوں کی

آوازیں سن کر تیس پینتیس کے قریب سیدے کے جنگجو ساتھی قبرستان کی جنوبی سمت جمع تو ہو چکے مگر انتظار میں تھے کب سکندر اماچھی یا سیدا اُن سے آ کر ملتے ہیں جن کا ابھی تک کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو حیرت اور پریشانی کے عالم میں دیکھے جا رہا تھا کہ کیا کریں اور کب کریں کیونکہ کوئی حکمتِ عملی بتانے والا ہی نہیں تھا۔ بار بار سیٹیاں مارنے کے باوجود نہ تو سیدے یا سکندرے میں سے کوئی آ رہا تھا اور نہ ہی اُن کے دیگر ساتھیوں میں سے کوئی اور۔ اِس سے پہلے کہ وہ اپنے طور پر کوئی قدم اُٹھا پاتے، گورا فوج کے گھڑ سوار دستوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ لگ بھگ پچاس کے قریب گھڑ سوار ہوں گے جنہوں نے بتدریج گھیرا تنگ کرتے ہوئے اُنہیں اِس طرح لپیٹے میں لیے رکھا کہ خنجر استعمال کرنا محال ہو گیا۔ بندوق نام کے ہتھیار کی ہیبت نے اِس طرح دہشت پھیلائی کہ سانس لینا ممکن نہ رہا اور اچھے بھلے بُرچھے جوان حواس باختہ ہو کر اندھیرے میں اپنے ہی ساتھیوں پر خنجروں کے اوچھے واروں سے ہلکان ہونے لگے۔ جس کسی نے گھیرا توڑنے کی کوشش کی وہ گورے سپاہیوں کے گھوڑوں کے سموں تلے کچلا گیا۔ کوئی اوپر کو اُچھلا تو گھڑ سوار کی بازو کی کہنی میں گردن پھنسوا کر اِس طرح کا کڑا کا نکلوایا کہ وہیں جھولتا رہ گیا اور پھر لاش نیچے آن گری۔

یہ میدان چند منٹوں میں ہی گورا فوج کے ہاتھ رہا اور سیدے کے ساتھیوں کی اکثریت اپنے سردار کی راہ دیکھتے دیکھتے جوانیاں مانے بغیر ہی بے موت ماری گئی۔ پوری بستی میں گورا فوج کا یہ سارا آپریشن محض دو مقامات کی مزاحمت کے بعد ختم ہو چکا تھا۔ آدھے گھنٹے سے بھی کم مدت میں ہیڈ آفس کو ''آل از ویل'' کی اطلاع بھجوا دی گئی تھی جس میں اتنی سی گنجائش ضرور رکھی گئی کہ مزاحمتی جتھے کا اُگوان سیدا اپنے قریبی ساتھی سکندرے ماچھی سمیت ابھی تک مردہ یا زخمیوں میں شناخت نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن پوری بستی آدم واہن عملی طور پر اِس وقت گورا فوج کی تحویل میں تھی۔ اس پیغام کے ساتھ ہی ہیڈ کوارٹر سے شمالی سائٹ آفس کو دو بجے پیش قدمی کرنے اور جنوبی کو تین بجے اپنی لیبر آگے بڑھانے کی ہدایت جاری کر دی گئی۔ بستی کی آپریشنل فورس کو حکم دیا گیا کہ وہ دونوں جھڑپوں میں مارے جانے والے مزاحمت کاروں کی لاشوں کو صبح ہونے کے بعد اُن کے

قرابت داروں کی موجودگی میں بستی کی شمال مغربی سمت مجوزہ نئے قبرستان میں دفنا دیا جائے لیکن سیدے اور سکندر راماچھی کو زندہ پکڑنے کے لیے فوج کے کڑے پہرے میں کل دن کی روشنی میں گھر گھر تلاشی لی جائے۔ یوں چند لمحوں کے بعد پوری بستی آدم واہن کی ہر ایک گلی اور ہر ایک موڑ پر گورے فوجی نے بتائی گئی پوزیشن سنبھال لی۔

شب کے دو بجے تو بستی کی شمالی سمت سے ریلوے ٹریک کی بنیاد رکھنے والی تربیت یافتہ لیبر کا پہلا دستہ روشن مشعلوں سمیت ظاہر ہوا کہ جس کی حفاظت کے لیے گورا فوج کا خصوصی دستہ موجود تھا۔ اُن کے عقب میں پتھروں سے لدی ہوئی ریڑھیاں تھیں اور ریڑھیوں کے پیچھے ریلوے لائن پر چلنے والے ٹھیلے جنہیں دو دوڑتے ہوئے مزدور دھکیلا کرتے تھے۔ تعمیراتی سامان سے لدے ہوئے یہ ٹھیلے وہاں تک جاتے جہاں تک ریلوے ٹریک بچھا ہوا ہوتا۔ اُس سے آگے یہ سامان مزدور ریڑھیوں پر لاد کر پہنچاتے کہ جہاں کام ہو رہا ہوتا۔ اِس گروپ کے منتظمین کو بتا دیا گیا تھا کہ انہوں نے صبح سات بجے سپیدہ سحر نمودار ہونے تک جہاں تک ممکن ہو مجوزہ ریلوے ٹریک پر پتھر بچھا دینا ہے لیکن قبرستان کے تین فرلانگ کے حصے کو اُس وقت تک نہیں چھیڑنا جب تک اگلی ہدایت اُن تک پہنچ نہ جائے۔ جب کہ شمالی سائٹ آفس والوں کو اطلاع تھی کہ انہوں نے ریلوے ٹریک کے راستے کو قبرستان سے پہلے تک سیدھا کرنے کے لیے تربیت یافتہ لیبر صبح تین بجے تک بھجوانی ہے اور اِس سے آگے اگلی ہدایت کا انتظار کرنا ہے۔ چنانچہ یوں ہی ہوا۔

صبح اذان ہوئی تو بستی کی مرکزی مسجد میں حسبِ معمول مولوی جارُاللہ نے امامت کرائی۔ مسجد میں نمازیوں کی کم تعداد دیکھ کر مولوی صاحب نے ہر گلی میں پیغام بھجوایا کہ جو لوگ مسجد میں نماز ادا کرنا چاہتے ہیں وہ بے دھڑک چلیں آئیں انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ پہلے پہل تو لوگ ہر گلی میں موجود گھڑ سوار گورے فوجیوں کو دیکھ کر ہراساں ہوئے اور دروازے بند کر کے واپس گھروں میں دبک گئے مگر جب دیکھا کہ وہ خود اُن کے گھر سے نکلنے اور مسجد جانے کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں تو دیکھتے ہی دیکھتے مسجد کھچا کھچ بھر گئی۔ سیدے کی بغاوت کی ٹوہ لینے اور اب تک پیدا ہو چکی صورت حال کی خبر لینے وہ لوگ بھی مسجد میں پہنچے ہوئے تھے جو عام طور پر جمعہ یا عید کی نماز

پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔

نماز کے بعد مولوی صاحب نے نہایت مدلل انداز میں لوگوں کو تحمل سے رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اُنہیں حاکموں کی اطاعت کا فریضہ یاد دلایا۔ اُن کے مطابق حاکم کی طرف سے کیا جانے والا ہر وہ کام لائق ستائش ہے کہ جس میں خلق کی بھلائی مضمر ہو۔ ایسے امور میں رُکاوٹ ڈالنا اور لوگوں کو اُس کے خلاف بھڑکانا کھلی بغاوت ہے، جس کی کوئی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ لوگوں کی وہ اکثریت جو سیدے اور اُس کے ساتھیوں کی مخالف رہی تھی، مولوی صاحب کی گفتگو سے بہت خوش ہوئی مگر اُن کے چہرے سوال بن کر رہ گئے کہ جو اِس سے قبل اُن کا فتویٰ اُنہی کی زبانی سُن چکے تھے۔ اُنہیں لگا کہ بستی کا کنٹرول گورا فوج کے ہاتھ میں نہیں بلکہ مولوی صاحب کے پاس آچکا ہے۔ مولوی صاحب نے اِن لوگوں کی نظریں بھانپتے ہوئے فوراً اپنے لہجے کو غم ناک کرلیا۔ "مجھے بہت افسوس ہے بستی کے بیس نوجوانوں کے مارے جانے کا۔ اب اگر میں بھی اُنہی کا ساتھ دیتا تو اِس وقت پوری بستی خون میں تیر رہی ہوتی۔ میں نے تو آپ لوگوں کی زندگیاں بچانے کے واسطے اپنے پرانے موقف سے رجوع کیا ہے۔"

جوں ہی بستی کے بیس جوانوں کی ہلاکت کی بات مولوی صاحب کے منہ سے نکلی مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر وہ شخص پریشانی اور سراسیمگی کے عالم میں اُٹھ کھڑا ہوا جس کے گھر کا کوئی نوجوان سیدے کی سنگت میں رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کا کوئی ردِعمل ظاہر کرتے مولوی صاحب نے اُنہیں نہایت بلند آواز میں بیٹھنے کو کہا۔ اِسی اثنا میں مسجد کی چھوٹی سی دیوار کے باہر گھڑ سوار گورے فوجیوں کی نقل و حرکت دکھائی دی۔ وہ سبھی لوگ جو دوبارہ بیٹھنے میں کسی تامل کا شکار تھے، فوراً بیٹھ گئے۔

"یہ وقت لڑنے مرنے کا نہیں، فہم و فراست دکھانے کا ہے۔ بستی کے جوانوں کے مرنے کا مجھے بھی اُتنا ہی دکھ ہے کہ جتنا اور کسی کو ہوسکتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک انہوں نے خودکشی کی ہے اس لیے اُن کا جنازہ بھی جائز نہیں۔ انگریزوں کی طاقت سے ٹکر لینا کہاں کی عقل مندی ہے، خودکشی ہی تو ہے۔ تم لوگ بھی کوئی عقل کرو، خودکشی نہ کرو..... میں بات کرتا ہوں اِن گورے

فوجیوں سے کہ سارے مرنے والے جوانوں کی لاشیں نئے قبرستان کے پاس رکھ دیں تا کہ اُن کے ورثا اُنہیں شناخت کر لیں اور تدفین ہو سکے۔ ہاں اور جیسے ہی پو پھٹتی اور دن نکلتا ہے تو تمام بالغ مرد پرانے قبرستان پہنچ کر اپنے وڈکوں کی قبروں سے اُن کی نشانیاں نکال کر نئے قبرستان میں عزت آبرو کے ساتھ دفنا دیں۔ بس ایک گھنٹہ ٹائم ہوگا، اُس کے بعد کسی کی بات نہیں سُنی جائے گی، مشینیں موقع پر آ چکی ہیں۔ پھر میں کیا بتاؤں؟ آگے خود سمجھ دار ہو۔ مولوی جارُ اللہ نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔ باقی رہے نام اللہ کا۔''

# ۱۵

''حرام زادی میں نہیں سیدے! حرام زادہ تو ہے..... اور سُن! یہ تیری بھول ہے کہ تم نے مجھے طلاق دے کر مجھ سے جان چھڑالی.... میری عدت تو آج سے شروع ہو رہی ہے جب کہ تیری زندگی آج سے ختم! مولوی بتاتا ہے کہ طلاق یافتہ عورت کا گھر والا عدت میں مرجائے تو طلاق باقی نہیں رہتی۔ حرامی کی اولاد سُن لے! میرے جس بدن کو تو نے پھٹو پھٹ کیا ہے، اِسی بدن سے، اِسی بدن سے میں قیامت تک تیری روح کو پھٹو پھٹ کرتی رہوں گی۔'' زمین پر پھینکے جانے کے بعد ریت پر پڑی سنگری چلاتی رہ گئی تھی لیکن اُس کی پوری بات سُنے بغیر سیدا تو انگریز فوج کا گھیرا توڑنے کی کوشش میں دور جا چکا تھا۔

ایک ساتھ اتنے زیادہ گھوڑوں نے ایک ہی سمت دوڑنا شروع کیا تو بستی کے مضافات کی ریتلی زمین نے گرد کو گرد باد بنا کر رات کی ملگجی تاریکی میں اور بھی دھوں اندھار کر دیا۔ گھوڑا بھگاتے ہوئے سیدے کی تعاقب میں آنکھیں کھول کر بیٹھی سنگری کی آنکھیں دھول سے اَٹیں تو مرچوں کی سی جلن جاگ اُٹھی۔ اُس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ گرد بیٹھنے کا انتظار کرتے ہوئے آنکھوں کو آنسوؤں سے دھوتی رہے۔ سنگری جب گھر پہنچی تو دن کا اُجالا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا مگر اُس کی ماں ملوکاں اُٹھ چکی اور حاجت روائی کے واسطے باہر جھاڑیوں میں جانے کے لیے اُس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

''کہاں گئی تھی تو! آج مجھ سے پہلے چلی گئی؟''..... مگر جیسے ہی اُس کی نگاہ سنگری کے سُتے ہوئے متورم چہرے پر پڑی تو وہیں خاموش ہوگئی۔ عجیب گومگو میں تھی کہ جوان بیٹی سے کیا پوچھے اور کیا نہ پوچھے۔ اُس کی بینا نگاہی نے بھانپ لیا تھا کہ سنگری کے باقی جسم کے ساتھ ساتھ اُس کی ٹانگوں کا توازن بھی درست نہیں ہے۔''تو کیا وہ رات سے باہر تھی یا ابھی فوری نوعیت کی حاجت کے سبب باہر جانے پر جھاڑیوں میں چھپا ہوا کوئی گیدڑ حملہ آور ہوگیا؟''.... سنگری کو ماں کی آنکھیں پھٹتی ہوئی پو کی روشنی میں بھی پھٹی پھٹی سی لگ رہی تھیں۔ اُس کی جھکی ہوئی پلکیں اور بھی جھک گئیں۔

''اماں! میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں جھاڑیوں تک۔'' ....

''ناں تو ہو آئی ہے تو رہنے دے، میں اکیلے چلی جاتی ہوں۔''

''میں چلتی ہوں.... تو نہ جا اکیلی۔'' سنگری ماں کے سوال کا پورا جواب دیے بغیر اُس کے ساتھ جانے کے لیے کھڑی ہوئی اور سہارے کے واسطے اُس کے بازو کو پکڑ لیا۔ ملوکاں نے چند قدم اُٹھائے تو دیکھا کہ سنگری سے قدم ملانا تو کیا قدم اُٹھانا ہی دوبھر ہو رہا ہے تو وہ پریشانی کے مارے رونی صورت بنا کر وہیں رُک گئی۔

''میں تجھ سے نہیں پوچھتی اور تو بھی بے شک نہ بتا لیکن جا اور جا کر لیٹ جا۔'' ملوکاں نے اُس سے اپنا بازو چھڑایا اور یہ جا وہ جا۔ سنگری وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈے تو اُس نے حلق میں اُنڈیل لیے۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ ماں اُس کی جسمانی کیفیت کو جان تو چکی ہے لیکن اسے اُس کا اپنا کیا دھرا سمجھ رہی ہے۔ پھر خیال آیا کہ جس طریقے سے اُسے سیدا اُٹھا کر لے گیا اور جس طور اُسے واپس پھینک گیا تو ماں کیسے سمجھے کہ اُس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ جسم کہاں کہاں سے زخمی ہے اور روح کہاں تک پامال ہے؟ لیکن وہ بتائے بھی تو کیوں کر؟ کیا ماں کے سامنے اُس کے داماد کا بھرم کھلنے پر اُس کے اپنے ذہنی چرکے سِل پائیں گے؟ اب تک تو صرف وہی اس عذاب سے گزر رہی ہے، بتانے پر ماں بھی اُسی عذاب کا شکار ہو جائے گی کہ جس کا نشانہ اس وقت صرف وہی ہے۔ ماں تو پہلے ہی اُس سے نالاں رہتی ہے کہ وہ سیدے سے ایسا ویسا

سلوک کیوں کرتی ہے، اب اگر یہ بات سُنے گی تو یہی کہے گی وہ خوامخواہ سیدے پر بہتان تراشی کر رہی ہے۔ لیکن کرے بھی تو کیا کرے! سیدے کی طرف سے کی گئی جسمانی زیادتی کی بات اگر چھپا بھی لی جائے تو وہ اُس کی طرف سے دی گئی طلاق کو کیسے چھپا پائے گی؟ خاص طور پر اگر وہ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تو۔ سنگری کا ذہن وہیں کھڑے کھڑے مسلسل قلابازیاں کھائے چلا جا رہا تھا اور اِن سوالوں کے اُلجھاؤ سے باہر نکلنے کا راستہ کہیں سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں اُس کی ماں بھی جھاڑیوں سے واپس آتی دکھائی دی۔ سنگری کو جوں کا توں اور وہیں کا وہیں گم سُم کھڑے دیکھا تو چہرے پر نقش ہوئے اُجڑے پن میں کچھ اور ویرانی بھی جُڑتی چلی گئی۔

ملوکاں اُس سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ اگر خود ہی سیدے کو نیچا دکھانے کے لیے کہیں کسی کے نیچے لیٹ کر آئی ہے تو اَب یہ پچھتاوے کا ناٹک کیسا مگر ایسا چاہنے کے باوجود اُس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ''بہت بُرا کیا ہے سنگری نے اگر ایسا کیا ہے تو''..... وہ منہ ہی منہ میں بڑ بڑاتی ہوئی سنگری کے قریب آئی، اَب کے کچھ غصے کے ساتھ اُس کا بازو کس کر پکڑا اور زبردستی کھینچنے کے سے انداز میں کچھ بھی بولے بغیر گھر کو گھسیٹ لائی اور کوٹھے میں چارپائی پر پھینک کر باہر سے کنڈی لگا دی۔ سنگری کی ماں کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار کر روئے اور چیخ چیخ کر لوگوں کو بتائے کہ اُس کی بیٹی اپنے گھر والے کو اُس کے ایک تھپڑ کا جواب دینے کے لیے خود ہی جا کر کسی راہ وَٹاؤ کے نیچے لیٹ گئی ہے اور اب چڑے پر چڑوا کر جھوٹ موٹ کے نخرے کیے جا رہی ہے۔ مگر پھر خیال آیا کہ بیٹی نے تو رات کے اندھیرے میں منہ کالا کیا سو کیا مگر وہ خود کیوں اُسے دن کے اُجالے میں تیل میں تلتی رہے؟ دنیا کا کیا ہے، اُس نے تو محض تماشا دیکھنا ہوتا ہے مگر یہ تو خود ہی دنیا کے سامنے تماشا بننے اور بنانے جا رہی تھی۔ اپنے جُھگے کو آگ لگا کر شریکوں کو آگ تپوانے والی بات ہوئی نا یہ۔ ملوکاں کا دل پسیجا تو اُٹھی اور اُٹھ کر اُس کوٹھے کے دروازے کی کُنڈی باہر سے کھول دی کہ جہاں کچھ دیر پہلے سنگری کو دھکیلا تھا۔

سنگری نے اندر وا اِی اندری ماں کے رویے کی دونوں کیفیتوں کو محسوس کیا تو اُس کے سارے بدن کا درد جاتا رہا۔ بس اب اگر کہیں سے ٹیس اُٹھ رہی تھی تو صرف دل سے اور دِل کے

معاملات سنگری کے لیے کچھ ایسے نہیں تھے کہ آج کے آج چکائے جاتے۔ اِس کے لیے اُسے سیدے کی واپسی کا انتظار کرنا تھا؛ زندہ یا لاش کی صورت۔ سردست سنگری کے لیے اتنا اطمینان کافی تھا کہ اُس کی ماں نے اُس سے کوئی بات پوچھے بغیر اُسے اِس حیثیت میں بھی قبول کر لیا تھا۔ سنگری ماں کی آنکھوں سے پڑھ چکی تھی کہ وہ اُس کی شب بھر کی غیر موجودگی اور پھر موجودہ حالت کو کیا نام دے رہی ہے۔ وہ سارا الزام اپنے سَر لینے کی قیمت پر بھی ماں کا یہ مغالطہ باقی رہنے دینا چاہتی تھی۔ جب کہ ماں نے یہ سوچ کر سنگری سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ اچھا ہے لحاظ کا پردہ اُن دونوں کے بیچ رہے تا کہ سیدے کو مٹی چٹوانے کے لیے اُس نے جو خود ذلتی کا راستہ اختیار کیا ہے، اُس پر اگلا قدم رکھنے سے پہلے ہزار بار سوچے اور اِس کی نوبت ہی نہ آئے۔ بات اگر چہ کیا سے کیا ہو چکی تھی مگر جب سنگری کو ہی اِس سے کچھ سروکار نہ رہا تو بدن دریدگی کی کیفیت میں بھی روح پر سکون ہوتی چلی گئی اور وہ نیند جو رات کے پہلے پہر ہی سے خوف کے کواڑوں کے پیچھے چھپ چکی تھی، ایک دم ہی کہیں سے آن ٹپکی اور سنگری کے لیے آنکھیں کھولے رکھنا مزید ممکن نہ رہا۔

# ۱۶

بستی آدم واہن میں ہونے والا آپریشن انگریز انتظامیہ کو لاحق تشویش کے برعکس انتہائی آسان ثابت ہوا۔ نہ کہیں کوئی غلغلہ اور نہ ہی کوئی ردِعمل یا ہنگامہ خیزی۔ یہاں کے ساکن جتنی خاموشی سے اپنے بائیس جوانوں کا قتل سہہ گئے اُتنا تو گوری سرکار نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سب کچھ اِس قدر سہولت سے ہوا کہ انتظامیہ اپنی حکمت عملی پر نازاں، آپریشنل فوج اپنی مہارت پر تفاخر میں مبتلا اور انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کے انجینئرز اپنے اندازوں پر اکڑتے پھر رہے تھے کہ دیکھا ہم نہ کہتے تھے اِن بدمعاشوں کو شروع ہی میں کچل دو، کچھ نہیں ہونے والا۔ خوامخواہ ہمارا ایک مہینے سے زائد کا عرصہ اِن جیسے لعنتی لوگوں سے ڈرتے ڈرتے ضائع کرادیا۔ لیکن ریلوے کے اَفسروں کی شیخیوں کے برعکس انتظامیہ اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی کہ وہ اگر آپریشن کو موخر کرتے رہنے کا حربہ استعمال نہ کرتی تو کبھی شرپسندوں کی قوت کو نفاق کے ذریعے نہ توڑ پاتی۔ یہ انتظامی حکمت عملی ہی تھی کہ جس کے تحت پیر زندہ کرامت کے میلے کے موقع کو باہر سے بھیجے گئے مولویوں، پروہتوں اور بھکشوؤں کی رائے سازی کے ذریعے اپنے حق میں پلٹا لیا گیا ورنہ سیدے اور اُس کے ساتھیوں کا پاگل پن کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اور کچھ نہ سہی محض ایک چھوٹی سی بستی میں سوڈیڑھ سو لوگوں کا قتل تاجِ برطانیہ کی حکمرانی کو داغ دار کر سکتا تھا۔

آپریشن کے بعد کی مدت میں انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کے چیف ریذیڈنٹ انجینئر جان برنٹن نے کمال تیزی سے ریلوے ٹریک کو مجوزہ آدم واہن ریلوے اسٹیشن سے شروع کرنے

کے بعد اُسے دریائے ستلج کے شمالی کنارے تک پہنچا دیا تھا۔ اِس دوران سب سے مشکل مرحلہ اُس اڑھائی تین فرلانگ جگہ پر ٹریک کی فاؤنڈیشن بنانا تھی کہ جہاں صدیوں پرانا قبرستان واقع تھا۔ اِس کی حساسیت سے قطع نظر انجینئرز کے لیے چیلنج اُسے بس اُسی روز مکمل کرنا تھا کہ جس روز صبح سویرے بستی والوں کو اپنے مُردوں کی باقیات نکالنے کا کہا گیا تھا۔ ملتان کی گوری انتظامیہ کا یہ قدم ریلوے کمپنی کے نزدیک ضرور قابلِ تحسین تھا کہ جس کے ذریعے بستی والوں کو فوج کے حکم کے بجائے وہاں کے ایک مولوی کے ذریعے ایسا کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کا امکانی ردِعمل مقامی مذہبی پیشوا کی باتوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔

صدیوں پرانے قبرستان سے اپنی کئی نسلوں کے اجداد کی باقیات کو اُن کی قبریں اُکھیڑ کر نکالنا اور کہیں دوسری جگہ پر پھر سے دفن کرنا بستی کے لوگوں کے لیے اگرچہ کسی طور قابلِ قبول نہیں تھا مگر مولوی صاحب کا حکم ٹالنا بھی کسی کے بس میں نہیں تھا۔ وہ روتے ہوئے دلوں کے ساتھ سورج نکلنے سے کم و بیش ایک گھنٹے پہلے قبرستان پہنچے۔ یہ اہالیانِ بستی سینے میں دبی آہوں اور سانسوں میں اَٹکی سسکیوں کے ساتھ دیے گئے وقت کے اندر اپنے اقربا کی لاشوں کی باقیات نکال کر بستی کے شمال مغربی کونے میں بنائے گئے نئے قبرستان میں لے جانے کے پابند تھے۔ اِس دوران بہت سے روح فرسا مناظر دیکھنے میں آئے جو اِس بستی پر گزرنے والے سانحات میں ایک ایسے المیے کا اضافہ کر رہے تھے جس نے یہاں کے مرد و زن کو کسی قسم کے اظہار کا حق دیے بغیر اندر سے چیر کر رکھ دیا تھا۔ انگریز آپریشنل فوج نے تو شاید اس المیے کا اثر نہ لیا ہو مگر ریلوے کے انجینئرز اور مقامی لیبر کے لیے یہ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح تھا۔ لوگ کہیں دور کھڑے مولوی جائز اللہ کی جانب سے کی جانے والی قرآن کی تلاوت کے دوران دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے اپنے پیاروں کی قبروں کو اس قدر احتیاط سے کھود رہے تھے کہ جیسے کدال مٹی پر نہیں بلکہ وہاں دفن انسانوں کے جسموں پر پڑ رہے ہوں۔ جوں جوں قبریں کھلتی گئیں قبرستان بھر میں شدید ترین تعفن پھیلتا چلا گیا۔ سڑاند کی بو اس قدر زیادہ تھی کہ سانس لینا تو دوبھر ہوا سو ہوا، قے روکنا بھی ناممکن ہو گیا۔ وہاں کھڑے رہنا مشکل ہوا تو ایسے میں تلاوت کرتا ہوا مولوی جائز اللہ بھی کہیں غائب ہو

گیا۔ کچھ دیر پہلے جہاں روتے ہوئے لوگوں نے کہرام برپا کر رکھا تھا اب وہاں ہر طرف سے اُبکائیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ریلوے ٹریک کا نشان دہی شدہ راستہ سیدھا کرنے اور آدم واہن کے مجوزہ ریلوے اسٹیشن کی سمت سے پتھر سپلائی کرنے والے اِن پہلے دستوں کے انچارج نے مناسب سمجھا کہ لیبر کی ہمت اور اخلاقیات کی سطح کو برقرار رکھنے کے لیے اُنہیں کچھ دیر کے لیے سائٹ سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور جب تک قبروں سے ہڈیاں اور بچے کھچے بال تک نہ سمیٹ لیے گئے، لیبر کو واپس نہ بُلایا گیا۔

راستہ صاف کرنے والی لیبر دوبارہ قبرستان پہنچی تو وہاں بستی سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص موجود نہیں تھا مگر ٹریک کے راستے میں چھ کچی قبریں اور ایک نیم پختہ تعویذ والی قدرے بڑی قبر ابھی تک موجود تھی۔ سرسری معلومات کی رو سے بستی کا کوئی بھی زندہ شخص اِن قبروں سے اپنا نسب جوڑنے کو تیار نہیں تھا اور نہ ہی اِن قبروں کو ہٹائے بغیر ریلوے ٹریک کی تعمیر ڈیزائن کے مطابق ممکن تھی۔ چنانچہ طے پایا کہ اِس بارے میں چیف ریذیڈنٹ انجینئر سے مشورہ کر لیا جائے۔ جان برنٹن تک بات پہنچی تو اُس نے فوری طور پر اپنا فیصلہ پہنچوا دیا کہ مزید کوئی وقت ضائع کیے بغیر ٹریک کے راستے میں آنے والی ہر قسم کی رکاوٹ کو ہر صورت میں دور کر دیا جائے۔ لہٰذا سائٹ پر موجود لیبر کو اِن قدیم ترین قبروں کی کھدائی پر لگا دیا گیا۔

جوں جوں کھدائی گہری ہوتی گئی، قبرستان کا ماحول معطر ہوتا چلا گیا۔ یہ ایسی خوشبو تھی کہ جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ موقع پر موجود لیبر اور اُن کے انچارج جو کچھ دیر پہلے تک تعفن کے مارے سانس نہیں لے پا رہے تھے اب شاداں حالت میں ایک دوسرے کو حیرت سے تکے جا رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ شاید قریب ہی کوئی عطر کی بڑی دوکان یا عطر کشید کرنے والا کوئی کارخانہ ہو کہ جس کی خوشبو ہوا کا رخ بدلنے پر اِس سمت کو معطر کیے جا رہی تھی۔ بہر حال جو بھی تھا اُس نے سبھی لوگوں کو تازہ دم کر دیا تھا۔

مگر جوں ہی یہ قبریں کھلیں تو کھدائی پر مامور لوگوں کے لیے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا منتظر تھا۔ حیرت کیا تھی، تجسس تھا، خوف تھا جس نے وہاں موجود لیبر کے سبھی لوگوں کو اپنی

گرفت میں لے لیا۔ اگرچہ یہ لوگ پیشہ وارانہ طور پر تربیت یافتہ تھے مگر تھے تو مقامی مسلمان جن میں قلیل تعداد ہندوؤں کی بھی تھی۔ اگر اُن کے سامنے صدیوں پرانے قبرستان کی قدیم قبریں کھدیں اور اُن میں چند بچی کھچی ہڈیوں کی بجائے ابھی ابھی لحد میں اُتاری گئیں لاشیں اِس طرح رکھی ہوں کہ بوسیدگی اور تحلیل کے عمل نے انہیں چھوا تک بھی نہ ہو تو اُن پر جو گزر سکتی تھی، گزر رہی تھی۔ اب یہ عقدہ بھی کھلا کہ جس خوشبو نے متعفن ماحول معطر کر رکھا تھا وہ کہیں کسی قریبی باغیچے، گلستان یا عطر بنانے کے کارخانے سے نہیں بلکہ اِن قبروں سے آ رہی تھی کہ جن کا کفن تک پُرانا کیا ہونا، میلا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہاں موجود لیبر پر طاری ہو چکی حیرت اور خوف کی کیفیت اب سراسیمگی میں بدل چکی تھی اور اُن میں سے کوئی بھی آگے بڑھ کر اِن لاشوں کو قبروں سے نکالنے کو تیار نہیں تھا۔ جب کہ گھڑ سوار انگریز آپریشنل فورس بھی ابھی تک سوائے قبرستان کے اِس حصے کو بدستور اپنے گھیرے میں رکھنے کے اور کوئی قدم نہیں اُٹھا رہی تھی۔

اِن حالات میں ایک بار پھر جان برنٹن سے رجوع کیا گیا۔ معاملے کی سائنسی یا حقیقی وجوہات سے قطع نظر سائٹ آفس میں ہونے والی میٹنگ میں اِس کی مذہبی حساسیت اور مضمرات ہی پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ بستی کی آبادی کے علم میں لائے بغیر اِن لاشوں کو احتیاط سے نکال کر دریا کے شمالی کنارے پر مجوزہ پُل کے مقام سے کچھ آگے اُس جگہ دفن کر دیا جائے جہاں سے دریا کے بہاؤ کو موڑ کر ستون تعمیر کرنے کے لیے خشک جگہ نکالنا مقصود تھا۔ چنانچہ ملتان اور بہاول پور کی مقامی انتظامیہ کو اعتماد میں لے کر ایسا ہی کیا گیا اور نہایت رازداری سے ساتوں لاشیں ریلوے ٹریک کی زد میں آنے والے مقام سے نکال کر کم و بیش ایک میل دور ستلج کے شمالی کنارے پر اوپر کی طرف دس فٹ سے زیادہ کی گہرائی میں دفنا کر اوپری سطح برابر کر دی گئی۔ حیران کن بات یہ بھی تھی کہ وہ خوشبو جس نے پورے علاقے کو معطر کر رکھا تھا، وہیں رہ گئی اور تدفین کی نئی جگہ پر کچھ بھی ایسا نہیں تھا کہ جسے خوشبو کا نام دیا جا سکتا۔ لیکن یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں تھا کہ جو آپریشن پر متعین گوروں کے لیے کسی توجہ کا باعث ہوتا۔

بستی آدم واہن سے متعلقہ یہ آخری مسئلہ تھا جو آپریشن کے روز چیف انجینئر جان برنٹن

اور اُس کی ٹیم کے سامنے رکھا گیا۔ اگر چہ اِس کے بعد کے مسائل اور معاملات ریلوے کمپنی کے تکنیکی نوعیت کے ہونے چاہیے تھے مگر جس سکون سے کمپنی کے معاملات آگے بڑھ رہے تھے وہ جان کے لیے پریشان کن تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جہاں باہر سے کوئی جارحیت یا مزاحمت نہیں ہوتی تو اندر سے جارحیت اور مزاحمت دونوں سر اُٹھانے لگتے ہیں۔ اُس نے اکثر دیکھا کہ کہیں سے بھی کسی خبر کا نہ ملنا اپنے اندر ہی سے کسی طوفان کی خبر دے رہا ہوتا ہے اور اِس پورے منظرنامے میں طوفان کا پیش خیمہ ایما کا پھر سے سائٹ آفس نہ آنا تھا۔ ایما سے آخری ملاقات میں اُس کی جانب سے کہے گئے انتہائی الفاظ اُسے حرف بحرف یاد تھے۔ گو کہ اُس کے کہنے کے مطابق وہ ایک ہی دن میں تمام متنازع ٹریک کی فاؤنڈیشن بنانے کا کام مکمل نہیں کرا سکا تھا مگر نہ تو یہ دستیاب لیبر کی استعداد سے میل کھاتا تھا اور نہ ہی پہلے سے طے شدہ شیڈول کے مطابق تھا۔ پھر بھی اُس نے طے شدہ طوالت سے کہیں زیادہ کام مکمل کر لیا تھا۔ اب بھی اگر وہ کمپنی کے ڈائریکٹرز کی توقعات پر پورا نہیں اترتا تو کیا کیا جا سکتا تھا۔

جان برٹن کے لیے ایما صرف ایک جہت ہی کی حامل نہ تھی۔ کمپنی کے پیشہ ورانہ معاملات سے زیادہ ذاتی طور پر وہ اُس کے لیے ایک جذباتی ڈھارس تھی۔ تو کیا ایما نے اپنے اِس منصب سے بھی منہ موڑ لیا؟ وہ حیران تھا کہ اگر وہ ایک قدم اُس کی جانب بڑھی تھی تو کیوں بڑھی اور اگر واپس مڑی تو کیوں مڑی؟ کیا اِس کے پس منظر میں بھی کوئی سازش کارفرما تھی؟ لیکن پھر خیال آتا کہ اگر یہ سب کچھ کسی سازش کے تحت کیا گیا ہوتا تو وہ اتنا بڑا رسک لے کر اُس روز محض اُسے متنبہ کرنے کے لیے نہ آتی۔ ’’لیکن وہ ایک عام سی عورت کے لیے اِس قدر بے چین کیوں ہے؟‘‘ خود سے کیے گئے اِس سوال کا جواب اُسے مل نہیں پا رہا تھا۔ فرصت کے لمحات میں اکثر اوقات اِس کا جواب نہ ملنا کئی اور سوالوں کو جنم دیتا چلا جاتا۔

’’اُسے تو اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں عورت کی کبھی طلب ہی نہیں رہی تھی۔ نہ ہی کسی عام عورت کی طلب اور نہ ہی کسی خاص کی۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر ایما ایک عام عورت ہوتے ہوئے اُس کے لیے مطلوب سے مطلوب تر کیسے ہوتی چلی جا رہی تھی؟ ایما میں وہ کیا خاص تھا کہ جس نے اُس

جیسے زن بیزار شخص کو اُس کا گرویدہ بنا دیا؟ کیا عورت کو بھی عام اور خاص کے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ کیا ہر عام عورت میں بھی کچھ ایسا خاص ضرور ہوتا ہے جو اُسے مطلوب بنائے رکھتا ہے اور ہر خاص عورت میں بھی کہیں نہ کہیں کچھ ایسا عام ضرور ہوتا ہے جو اُسے دل سے نکال کر قدموں میں جگہ دینے کے قابل بھی نہیں رہنے دیتا''...... جان برنٹن جیسے شخص کے پاس اِن میں سے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ اُس نے عورت اور پروفیشن کا کبھی تقابل ہی نہیں کیا تھا۔ وہ حیران ہوتا تھا اُن لوگوں پر جو عورت کے ذریعے پروفیشن میں عروج کی راہیں ڈھونڈتے ہی نہیں تھے بلکہ منزل پا لیتے تھے اور وہ لوگ بھی اُس کی زندگی میں بہت سے آئے کہ جن کی پیشہ ورانہ جبلت اور عروج کو محض عورت نے برباد کر کے رکھ دیا۔ ایسے لوگوں میں ایک وہ خود بھی تھا جس کی مَیری نام کی خاتون سے شادی ہمیشہ ایک مزاحمت کے طور پر اُس کی پیشہ ورانہ زندگی میں آڑے آتی رہی مگر وہ ایک ایسے شخص کے طور پر گھسٹ گھسٹ کر منزلیں عبور کرتا رہا جس کے ایک پاؤں میں لوہے کا وزنی گولا زنجیر کے ساتھ بندھا ہو۔ کبھی آزادی سے چلنا نصیب ہی نہ ہوا تا وقتیکہ وہ ہندوستان نہ چلا آیا۔ مگر یہاں بھی مَیری کی یاد اُس کے بیٹے ولیم آرتھر کی صورت سائے کی طرح اُس کے ساتھ موجود تھی۔ تو کیا ہے یہ عورت؟ جب کبھی زندگی مکمل سکون کی حالت میں ہو تو یہ کسی عذاب کی صورت فتنے جگانے آن ٹپکتی ہے اور جن دنوں زندگی خود عذاب ہو چکی ہو تو یہ راحت بن کر نئے سرے سے جینے کی آس جگا دیتی ہے۔ زندگی میں ہو تو جینے نہیں دیتی اور نہ ہو تو زندگی اِسی کی جستجو میں گزرتی ہے۔ جیسا کہ وہ ایما کو اب اپنی پسندیدہ شراب شیواز میں ڈھونڈتا رہتا تھا۔ جوں جوں جان برنٹن کے پراجیکٹ پر کام آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا، ایما کی جانب سے خاموشی اور ولیم سینٹ جان گالوے کا ابھی تک منظرنامے پر نہ آنا اُس کے اندیشوں کے گراف کو اوپر ہی اوپر لیے جا رہا تھا۔



# ۱۷

آدم واہن میں ہونے والے آپریشن نے محض ایک قبرستان اُکھیڑ کر بستی کے ہر گھر میں قبرستان بنادیا تھا۔ بستی میں امن کی خبریں رکھنے والوں کو گماں بھی نہ تھا کہ بیس لاشیں تو اُن جوانوں کی دفن ہوئیں جو گورے فوجیوں کی حملہ آوری کا نشانہ بنے لیکن اِن سے ہٹ کر بھی وہ کون سا گھر تھا کہ جس کے وڈکوں اور اقربا کی مدفون لاشیں ایک ذلت آمیز مہاجرت کا شکار نہ ہوئی ہوں۔ انگریز انتظامیہ کے حکم پر بستی کی شمال مغربی سمت میں ایک نیا قبرستان تو کسی تعمیلی پروانے کی طرح وجود میں آچکا تھا مگر وہاں از سرِ نو دفن کی گئی لاشوں کی باقیات، زیرِ زمین پھینک دیے جانے کے باوجود غیر مدفون ہی تھیں۔ کھلے آسمان کے نیچے بکھری ہوئی موت کی طرح۔ تصور ہی میں نہیں تھا کہ اُن کے اپنوں کے بعد از مرگ ٹھکانوں کی اِس طور بھی اکھاڑ پچھاڑ ہوسکتی ہے۔ یوں محسوس ہورہا تھا کہ بستی والے اپنی ماضی سے جبراً بے دخل کر کے اپنے زمانۂ حال میں پھینک دیے گئے ہیں۔ اُن کے آبا کی قبروں کی کشائی کیا ہوئی، بستی والوں کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی۔

وہ جو کبھی سیدے اور اُس کے ساتھیوں کی تحریک کے مخالف تھے، اب دبی زبانوں میں سیدے کا اتا پتا پوچھتے پھر رہے تھے کہ جس کی آپریشن والے دن سے کوئی خبر نہیں تھی۔ نہ تو وہ کہیں زندہ دیکھا گیا اور نہ ہی اُس کی لاش ملی۔ اگرچہ زخمیوں میں سے بھی دو جوان بعد میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے مگر باقی کے صحت مند ہو چکے جوانوں میں بھی نہ تو سیدے کا کوئی شمار تھا اور نہ ہی سکندرے

ماچھی کا۔ سکندرے کے بارے میں پہلے تو یہ خبر اُڑی تھی کہ وہ پتن کے قریب گورے فوجیوں کے ہاتھوں مارا گیا مگر وہ لاش بعد میں سیدے اور سکندر کے سنگتی مالو کی نکلی جو مڈبھیڑ میں زخمی ہو کر جان بچانے پتن کی طرف بھاگا مگر بچ نہ سکا کہ اُس کا پورا جسم ہی لیراں لبرے ہو گیا تھا۔ سیدے کے بارے میں بھی ہر روز نئی خبر اُڑتی۔ کبھی مارا گیا، کبھی بھاگ گیا اور کبھی زندہ پکڑا گیا۔ مگر اندر کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ ایک دن تو یہ خبر بھی ملی کہ انگریزوں سے جھڑپ کے نتیجے میں زخمی ہو کر اُس نے مولوی جائراللہ کے گھر پناہ لے لی ہے۔ بات مولوی صاحب تک پہنچی تو انہوں نے بستی کے لوگوں سے تو کوئی بات نہ کی مگر وہاں گشت پر پھرتے ہوئے فوجیوں کو بلا کر گھر کا کونہ کونہ ضرور دکھا دیا کہ کہیں اُن تک بات پہنچ گئی تو پھر دکھانا نہیں ہوگا بلکہ تلاشی ہوگی۔

بات پھر بھی یہاں تک نہ رُکی اور اب کہ یوں پھیلی کہ مولوی جائراللہ نے اپنے پاس چھپے ہوئے سیدے کو مخبری کر کے پکڑوا دیا ہے اور اِس کے بدلے میں مولوی صاحب کو بہت بڑا انعام ملنے والا ہے۔ یہ تو کسی کو معلوم نہ تھا کہ اِس افواہ کے پیچھے کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ مگر اتنا ضرور ہوا کہ مولوی صاحب کا دبدبہ جو پہلے ہی کم نہیں تھا، بڑھ کر دہشت میں بدل گیا اور بستی کے لوگ اُن سے یوں کنی کترانے لگے کہ جیسے مولوی صاحب اُن کا بھی سودا کر چکے ہیں اور اب محض مال پہنچانے جتنی دیر رہتی ہے۔ بہر حال بستی میں جو بھی ہوا اُس نے سیدے اور اُس کے سنگتیوں کو ہیرو بنا دیا۔ سیدا بستی کا ہیرو بنا تو اُس کے مخالفین خود بخود زیرو ہوتے چلے گئے۔ اِن زیرو ہو چکے مخالفین میں منگر بھی تھا جسے اب وہ لوگ بھی ماتھے پر بل ڈال کر دیکھتے تھے کہ جو آپریشن ہونے سے پہلے تک اُس کے طرف دار رہے تھے۔ بستی کے لوگوں کا یہ رویہ منگر کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُس نے انگریز سرکار کو کب کہا کہ ستلج کے اس مقام پر لوہے کا پُل بنا کر بستی کے قدیمی قبرستان سے لوہے کے شہتیر گزار دو؟ اُس کا قصور تو بس اتنا تھا کہ آنے والے وقت کو بھانپتے ہوئے بستی کے غریب لوگوں کو انگریز سرکار کا مقابلہ کرنے سے اِس لیے باز رکھا کہ گورا اپنا ارادہ پورا کر کے رہے گا اور یہ لوگ خوامخواہ بن موت مارے جائیں گے۔

منگر کو بستی کے لوگوں کی جذباتی ذہنیت سے کوئی شکوہ نہیں تھا، افسوس تھا تو سنگری اور

اُس کی ماں کے رویے کا۔ سنگری کی ماں نے تو گھر سے باہر نکل کر جھولی اُٹھا اُٹھا کر اُسے بد دعائیں تھیں کہ وہی اُس کے داماد کا قاتل ہے۔ چاہیے تو تھا کہ سنگری ماں کو سمجھاتی لیکن وہ اِس طرح خاموش رہی کہ جیسے اُس کی رائے بھی وہی ہو جو اُس کی ماں کی ہے۔ لیکن اِس کے باوجود منگر نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے سنگری کی ماں کی پھٹکار بھی سُنی، اُسے گلے سے بھی لگایا اور تسلی دی کہ سیدا یقیناً زندہ ہے اور بستی سے انگریز فوج کی چوکی اُٹھتے ہی کسی روز اُس کے سامنے آن کھڑا ہوگا، سنگری کی ڈولی لے جانے کے لیے۔ منگر نے ڈولی لے جانے والا جملہ خاص طور پر اِس لیے زور دے کر کہا کہ سنگری کا ردِ عمل اُس شام کے اتفاقی ٹاکرے کے پس منظر میں جان سکے جب پیر زندہ کرامت کے میلے کے آخری روز اُس نے سیدے کے نکاح میں ہوتے ہوئے بھی آنکھوں آنکھوں میں منگر کے لیے التفات کا تاثر اور اُس پر اپنی مسکراہٹیں نچھاور کی تھیں۔ لیکن اُس شام کے مہربان رویے سے قطعی الگ، منگر کی زبانی یہ جملہ سُن کر بھی وہ اپنے ماتمی حلیے میں اِس طرح لا تعلق دکھائی دی کہ جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔ منگر کو حیرت تو اتنی نہ ہوئی مگر یہ شک یقین میں بدلنے لگا کہ آپریشن سے قبل سیدا ضرور اُسے سنگری کے ذریعے بدنام کرا کر جان سے مارنا چاہتا تھا۔ لیکن اب تو اِس کھیل کا اُس وقت تک کوئی مصرف نہیں تھا کہ جب تک سیدا زندہ واپس نہیں آ جاتا۔

”کتنی بدقسمت ہے عورت اِس دھرتی کی کہ کسی مرد کی غیرت کے باڑے میں جنم لے کر آزادی اور چاہے جانے کے خواب دیکھتے ہوئے کبھی ہاری ہوئی جنگ کا تاوان بن کر قیمت چکاتی ہے اور کبھی اُس کی اگلی نسل کی بڑھوتری کے ڈھکوسلے میں بار بار دیواروں میں چنوائی جاتی ہے، انانیت کے نام پر مصلوب ہوتی ہے اور تلذذ کی آڑ میں تذلیل جھیلتی رہتی ہے۔“ منگر کے ذہن میں ہونے والی کھد بد نہ تو سنگری کا رویہ بدل سکی اور نہ ہی اُسے اپنے آنے والے دنوں کے لیے کوئی راستہ متعین کرنے کے لیے مطمئن کر سکی۔ ہاں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ سنگری کی ماں کی پھٹکار سہہ لینے سے اُس بے چاری کے دل کی بھڑاس نکل گئی اور منگر کے وہاں سے آتے ہوئے وہ اتنی متشدد نہیں لگ رہی تھی۔

منگر، سنگری کے گھر سے آنے کے بعد بھی اپنے خیالات سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ اُسے رہ رہ کر سنگری کا اُجڑا ہوا چہرہ اپنی جانب کھینچے چلا جا رہا تھا۔ نہ جانے اُسے کیوں یقین ہو چلا تھا کہ سیدا اب زندہ واپس بستی میں آنے والا نہیں۔ روپے میں سے پندرہ آنے تو یہی امکان تھا کہ وہ گورے فوجیوں کے حملے میں مارا جا چکا اور بستی کے دیگر کئی جوانوں کی طرح کسی گم نام گڑھے میں دبا دیا گیا ہے۔ اُسے سیدے کے زخمی ہونے یا مولوی جارُ اللہ کی پناہ میں ہونے اور پھر مخبری کی باتیں سب جھوٹ لگتی تھیں۔ اور وہ جو ایک آنہ امکان تھا اُس کے زندہ سلامت ہونے کا تو وہ بھی لا حاصل کہ زندہ ہوا بھی تو زندگی بھر بستی میں قدم نہیں رکھ سکے گا۔ کیونکہ انگریز کبھی بھی اپنے باغیوں کو سلامت نہیں چھوڑتے۔ ویسے بھی سُننے میں آیا تھا کہ سیدے اور سکندرے سمیت اُن کے کچھ ساتھیوں کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر انعام لگنے والا ہے۔ تو ایسے میں کون سمجھائے سنگری کو کہ وہ ایک اشتہاری باغی کے لیے اپنی زندگی خوار نہ کرتی پھرے اور کسی ڈھنگ کے بندے سے شادی کر کے بیٹھ جوانیاں مانے۔ لیکن اِن حالات میں کہ جب وہ بستی کی اکثریت کی خاموش ناپسندیدگی کا نشانہ بنا ہوا تھا، بہت مشکل تھا کہ سنگری یا اُس کی ماں کو حقیقت آشنا کیا جاتا۔ اُلٹا انہوں نے یہی سمجھ لینا تھا کہ سیدے کے لیے پیدا ہو چکی مشکلات میں اُس کا ہاتھ ہے۔ لہٰذا دانائی کا تقاضا تو یہی تھا کہ معاملات کو حالات کے بہاؤ پر چھوڑ دیا جائے لیکن بستی کے لوگوں کے جذبات سے کتنی دیر تک کٹ کر رہا جا سکتا تھا خاص طور پر جب وہ خود بھی دل گرفتہ ہو۔

انگریز سرکار کی اپنی ترقی اور حکومتی منصوبوں کی آڑ میں بستی کے قبرستان کی اکھاڑ پچھاڑ اور اُن کے آبا کی دفیات کی بے حرمتی کے سلسلے میں منگر کے بھی وہی جذبات تھے جو سیدے، سکندر یا اُن کے سنگتیوں کے تھے۔ ہاں اگر اختلاف تھا تو اِس مصیبت سے نمٹنے کے طریقہ کار پر۔ سیدا جوش ہی جوش تھا چاہے پوری بستی خون میں نہلا دی جائے جب کہ منگر سراپا جوش ہوتے ہوئے بھی ہوش کا دروازہ کھلا رکھے ہوئے تھا کہ کسی طور جانی نقصان سے بچا جا سکے۔ مگر جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ اگر چہ منگر اور بستی کے دوسرے ہوش مند لوگوں کا مشورہ نہیں مانا گیا تھا مگر پھر بھی اُسے سیدے اور سکندرے کے اُن بائیس ساتھیوں کے یوں ہونے والے دردناک انجام پر بہت افسوس تھا۔ جن

لوگوں کی لاشیں مل گئیں اور اُنہیں دفنا دیا گیا، اُن کے ورثا کو تو پھر بھی کسی طور صبر آ گیا تھا مگر وہ جن کی لاشیں ہی نہ مل سکیں اُن کے لواحقین روز جیتے اور روز مرتے ہی نہیں تھے بلکہ مسلسل مصلوب چلے آ رہے تھے۔ صبر کی کوئی صورت ہی نہیں رہی تھی۔ منگر نے واقعات کو اِس پس منظر میں جانچا تو اُسے بستی والوں کا ردِعمل فطری سا دکھائی دینے لگا لیکن اِس کے باوجود سنگری کا رویہ اِس چوکھٹے میں کہیں پورا نہیں پڑ رہا تھا۔ نجانے کیوں وہ منگر کو اِس معاملے سے الگ رکھنا چاہ رہی تھی یا الگ رکھے ہوئے تھی۔



# ۱۸

بستی آدم واہن میں کیے گئے آپریشن کو تین مہینے گزر چکے تھے۔ ریلوے لائن کو لودھراں اسٹیشن سے لاکر دریائے ستلج کے کنارے اُس مقام تک پہنچا دیا گیا تھا کہ جہاں سے اُسے ریلوے پُل سے جوڑا جانا تھا۔ جب کہ پُل کے لیے تعمیر ہونے والے ستون دریا کا رُخ عارضی طور پر موڑے جانے کے بعد بھی ابھی دریا کی خشک سطح سے سر باہر نہیں نکال پائے تھے۔ کوشش یہی تھی کہ سیلاب کا موسم شروع ہونے سے پہلے ہی اِن ستونوں کی بنیادیں بھر دی جائیں جنہیں سُوکھے دنوں کی پانی کی سطح سے سو فٹ کی گہرائی تک ہونا تھا۔ سینکڑوں مزدوروں کی بھرپور مشقت کے باوجود لگتا نہیں تھا کہ سیلاب کے دن شروع ہونے تک ایسا ممکن ہو سکے۔ مگر اطمینان کا پہلو یہ بھی تھا اُس سال پہاڑوں پر برف کم پڑنے کے سبب دریاؤں میں طغیانی کا امکان بھی کم تھا۔

اُدھر بستی میں بھی ہر آنے والے دن کے ساتھ سیدے اور سکندرے کی زندہ واپسی کے امکانات معدوم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ سیدے کے گھر میں چونکہ اُسے رونے والا کوئی نہیں تھا اِس لیے سوائے سنگری، سنگری کی ماں اور کچھ دور پار کے رشتے داروں کے اور کسی کو اُس کی یاد کا آنا بھی کوئی کرنے والا کام نہیں رہا تھا۔ کبھی یاد کیا بھی گیا تو محض اِس مفروضہ نما حوالے سے کہ اگر وہ زندہ سلامت واپس نہیں آیا تا تو بستی میں موجود اُس کے سالہہ نما مکان کا قبضہ کون لے گا جسے ابھی چند مہینے پہلے اُس نے روہی سے مٹی بچے بُلوا کر بڑی چاہت سے تیار کرایا تھا۔ سالہہ کیا تھی، گرمی

سردی سے محفوظ ایسی رہائش گاہ کہ جس کی اندرونی دیواریں چیکی مٹی سے اِس طرح لیپ ہوئیں کہ آئینہ بن گئیں۔ چھت کے لیے بھی ٹاہلی کے بالے اور بالوں کے بیچ سجے سرکنڈے اس طرح گُندھے گئے کہ طوفانی بارشوں میں بھی پانی کے قطرے تک کو اندر ٹپکنے کا راستہ نہ ملے۔ سیدے کا یہ مکان چونکہ ابھی گھر نہیں ہوا تھا اِس لیے مولوی جاڑ اللہ سے لے کر سیدے کے دور پار کے سوتر ساتوں تک کی نگاہیں اِسی پر جمی ہوئیں مگر ایسے میں سنگری کی ماں نے سمجھ داری کی اور ایک روز اپنا جندرہ لگا کر سالہہ پر قبضے کو یقینی بنالیا۔

اُدھر ایک اور جندرہ ابھی تک سنگری کے ہونٹوں پر بھی لگا ہوا تھا جو صرف کھاتے پیتے وقت کھلتا اور اُس کے بعد پھر وہی چپ۔ نہ تو کہیں آنا جانا اور نہ ہی کسی سے بولنا چالنا۔ جب بھی محسوس کرتی کہ ماں اب کوئی سلسلہ پوچھ گچھ کا چھیڑے گی تو اِدھر اُدھر ہو جاتی۔ کبھی کوئی امکان اِس سے سوا ہوتا تو آنکھیں موند کر لیٹ جاتی۔ ماں کو اتنا اطمینان ضرور تھا کہ اُس رات کے بعد سنگری نے مفت کی ملائی کسی کتے کے سامنے نہیں رکھی تھی۔ مگر جب چند روز پہلے سنگری کے جی کا متلانا اور کھانے پینے کے وقت قے کرتے رہنا اُس کا معمول ہونے لگا تو اُس نے بدہضمی کے علاج کے لیے شروع کرائی گئی سوچڑلون کی پھکی روک کر بیٹی کو گُت سے پکڑا اور بے محابا کئی گھونسے اُس کی پُشت پر یوں گھر کائے کہ شدتِ ضربات سے خود ہی ہانپنے لگی مگر سنگری نے اُف تک نہ کی۔

شک تو ملوکاں کو پہلے ہی تھا کہ جب گذشتہ دو مہینوں سے اُس نے ماہواری کے خون والی ٹاکیاں دھو کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے نہیں پھیلائی تھیں۔ مگر وہ چُپ رہی کہ شاید کوئی بندش نہ ہو گئی ہو لیکن اتنا تو اُس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کسی کتے کا بیج اپنے پیٹ میں رکھوا کر آ جائے گی اور وہ بھی محض اپنے نکاح میں آئے ہوئے گھر والے کو نیچا دکھانے کے لیے۔ لہٰذا تقاضا یہی تھا کہ سیدے کی واپسی سے پہلے سنگری کو اُسی جسمانی حیثیت میں واپس لایا جائے کہ جیسی وہ سیدے کے غائب ہونے سے پہلے تھی۔ جلتے چولہے کی گرم راکھ میں چھوہارے بھون کر کھلانا، پینے کے پانی کے گھڑے اپنی گلی کی کھوئی کے بجائے مسجد والے کنوئیں سے بھروانا اور دن میں کئی بار پُرساگ کے ذریعے کوٹھے پر چڑھانا جیسے ٹوٹکوں نے حمل گرائے جانے کی کوئی علامت ظاہر نہ کی

تو ملوکاں چُپ ہو رہی لیکن بالو دائی کی گھر میں آمد نے ایک بار پھر اُسے شُبے سے یقین کی طرف گھما دیا کہ جو محض سنگری کی چال دیکھ کر اُس کی ماں سے شکوہ کر بیٹھی کہ یہ کیا؟ کب کر دیا مُکلا وا بیٹی کا اور وہ بھی میٹھے چاول کھلائے بغیر!

سنگری کی ماں کا سُتا ہوا چہرہ اور بھی نچڑ کر رہ گیا۔ بالو کی نگاہ اُس کے چہرے پر پڑی تو گڑبڑا گئی اور پھر اپنی ناسمجھ میں آنے والی خفت مٹانے کے لیے خود ہی کہنے لگی کہ آج اگر سیدا ہوتا تو سنگری کا پاؤں بھاری دیکھ کر کتنا خوش ہوتا۔ بالو دائی کی اِس مزید وضاحت نے سنگری کی ماں کو اور بھی چکرا کر رکھ دیا لیکن اِس کے باوجود تنک کر بولی ''کیوں کیا ہوا سیدے کو؟ آئے گا اور ایک دن ضرور آئے گا واپس اپنے گھر! اور یہ کیا تو باتیں کیے جا رہی ہے پاؤں بھاری ہونے کی؟ جب ویلا وقت آئے گا تو بچہ بھی ہو جائے گا، بس ذرا مُکلا وا تو ہو جانے دے۔''

''تو کیا ابھی مُکلا وا نہیں ہوا سنگری کا؟''..... بالو دائی نے بے یقینی انداز میں پہلے سنگری کی ماں کو دیکھا اور پھر اِدھر اُدھر صحن میں سنگری کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ بالو نے ایک بار پھر سنگری کی ماں کے چہرے پر نظریں جمائیں تو اُس نے پلٹ کر کچھ اِس ناگواری سے اُسے دیکھا کہ بالو کو اپنی نظریں ہٹانا پڑیں۔

''تیری مالش کر دوں؟''

''نہیں اب تو جا ..... سنگری کی ماں کا لہجہ انتہائی روکھا تھا۔

''سنگری کو تیل لگا کر اُس کی جوئیں دیکھ لوں!''

''نہیں ہیں سنگری کو جوئیں اور نہ ہی آج تیل لگانا ہے ....... ابھی پرسوں ہی تو لگایا ہے.... تو بس جا۔'' بالو دائی بُرا سا منہ بنا کر اُٹھی اور ایک بار پھر سنگری کو نگاہوں ہی نگاہوں میں اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئی۔ اُس کے جاتے ہی ملوکاں تڑپ کر اُٹھی اور سیدھی پچھواڑے میں پہنچی جہاں سنگری اُکڑوں بیٹھ کر اُبکائیاں کیے جا رہی تھی۔ نجانے اتنا غصہ اُس میں کہاں سے آیا کہ اپنے آپ ہی میں نہ رہی اور اُبکائیاں کرتی سنگری کی پُشت پر اتنے زور کا ٹھڈا مارا کہ وہ منہ کے بَل جا گری۔ پہلے تو سنگری کو کچھ سمجھ نہ آئی کہ اُس کے ساتھ ہوا کیا ہے

مگر جیسے اپنا مٹی میں لتھڑا ہوا چہرہ گھما کر پیچھے دیکھا تو اُس کی ماں ایک ہاتھ سے اپنے منہ کو دبائے زاروقطار روئے جارہی تھی غالباً اس خوف سے کہ اُس کی آہ و بکا گھر کے باہر تک پہنچی تو قصے کہانیوں کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔ سنگری نے اپنی ماں کو اِس حالت میں دیکھا تو سمجھ گئی کہ اس غم اور اس قدر غصے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے لہٰذا دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے اُٹھی اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ نہ تو آنکھوں میں آنسو اور نہ ہی چہرے پر پشیمانی۔

ملوکاں کو سنگری کی ڈھٹائی نے اور تڑپا دیا۔ اب بیٹی پر مزید غصہ نکالنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا لہٰذا سامنے پڑا ہوا لکڑی کا تھاپا اُٹھایا اور اُٹھا کر اپنے سر پر مارنے لگی۔ سنگری نے دیکھا تو جھٹ سے لپک کر تھاپا اُس کے ہاتھ سے جھپٹا اور ایک طرف پھینک کر بے بسی کی حد تک خود اذیتی پر اتری ہوئی ماں کو سینے سے لگا لیا۔ بیٹی سینے سے لگی تو روتے روتے ملوکاں کی ہچکیاں بندھ گئیں مگر سنگری اپنی خشک آنکھوں کے ساتھ اُلٹا اُسے دلاسہ دیے جا رہی تھی۔ چند لمحے گزرے تو ملوکاں نے ایک دم بیٹی کا ہاتھ ایک طرف جھٹکا اور اُس کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کا چہرہ اگرچہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا مگر غصے کی لہر ابھی اُتری نہیں تھی۔

''تو بتاتی کیوں نہیں کہ کس کُتے کا بیج اپنے پیٹ میں لیے پھرتی ہے؟ تجھے شرم نہیں آئی یوں اپنے آپ کو برباد کرتے ہوئے! تو سمجھ رہی ہے ناں کہ اِس طرح تو نے سیدے سے اپنی بے عزتی کا بدلہ چکا لیا؛ اَری حرام زادی! وہ تو تیرے گھر والا تھا، وہ جان سے بھی مار دے تو عورت بخشی گئی مگر جس کے سامنے تو نے چڈے کھولے، اپنا تنگیج دکھایا، وہ تیرا کیا لگتا تھا؟ گھاٹے میں تو تُو رہی، تیرا سب کچھ تو وہ لے گیا اور تجھے دے گیا ایک گُلر یا گُلری تیرے پیٹ میں کہ جیسے جیسے وہ باہر نکلتا آئے گا، تیرے منہ پر بدنامی کا بُجا پھرتا جائے گا، پھر تو دیتی رہنا صفائیاں مگر تیری کسی بات پر کسی نے بھی یقین نہیں کرنا۔ سب سے پہلے تیرے خلاف فتویٰ اُسی مولوی جاراللہ نے دینا ہے جس نے تیرا نکاح پڑھایا تھا بچپن میں سیدے کے ساتھ۔''

''میرا نکاح مولوی جاراللہ نے پڑھایا تھا سیدے کے ساتھ؟''

''اور کیا..... وہی تو ہے مولویوں کا ڈاڈ کا شروع سے۔''

یہ سنتے ہی سنگری کی آنکھوں سے معدوم ہوئی چمک ایک بار پر جاگ اُٹھی۔

''اماں میرے پیٹ میں جو بھی ہے اُسی کا تو ہے۔''

''لعنت ہو تجھ پر حرام زادی..... اپنے باپ کی عمر کے نیک شخص پر الزام لگا رہی ہے۔ یاد رکھ اُس نے سُن لیا تو تیرے ٹوٹے کر دے گا اور اُس کے سُننے سے پہلے میں تیرا گلا دبا کر مار دوں گی گُتے یدھی۔'' ملوکاں نے اُسے دونوں ہاتھوں سے بُجّے دینے شروع کر رکھے تھے۔ جب کہ سنگری یوں مزے لے لے کر بات کیے جا رہی تھی جیسے بات نہیں بلکہ چیڑھ والے سوہن حلوے کی ڈلی چبائے جا رہی ہو۔''اور اگر وہ مان لے کہ یہ سب کچھ اُسی کا ہے تو؟''

''کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہے؛ ترس آتا ہے مجھے تم پر! ایک طرف مولوی جارُ اللہ کہ جس کے پیچھے پوری بستی کی حمایت ہے تو دوسری طرف سیدا ہے؛ انگریزوں کا باغی! دونوں کے ہاتھ تیری ایک ایک لات آ گئی تو چیر کر رکھ دیں گے تجھے۔''

''سیدا زندہ ہوگا تو آئے گا۔'' سنگری مسکراتی ہوئی منہ ہی منہ میں بڑبڑائے جا رہی تھی۔

''اب کیا کہہ رہی ہے؟ اونچا بول!'' ...... ملوکاں کا دماغ گھومنے لگا تھا۔

''کچھ نہیں کہہ رہی..... بس مجھے لے چل مولوی کے پاس۔'' ملوکاں نے بیٹی کی زبانی پھر یہ بات سُنی تو سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

## ۱۹

جان برنٹن آج دوپہر سے مسلسل تجسس آمیز حیرت میں مبتلا چلا آ رہا تھا اور اِس کا سبب کچھ اور نہیں بلکہ بہاول پور آفس سے موصول ہونے والا ایک ٹیلی گرام کہ جس میں اُسے شام پانچ بجے مس ایما سے مل لینے کا کہا گیا تھا۔ دفتری ضوابط کے برعکس اِس پیغام میں پیغام بھجوانے والی اتھارٹی کا نام ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ جوابی پیغام کے ذریعے مطلوبہ معلومات لے لی جائیں مگر پھر یہ سوچ کر کہ کہیں مس ایما نے خود ہی ایسی پردہ داری کا اہتمام نہ کیا ہو، وہ خاموش رہا۔ لیکن اضطراب اِس کے باوجود ختم نہ ہو سکا۔ بظاہر تو یہی لگ رہا تھا کہ اُسے کسی دفتری معاملے پر مشاورت یا استفسار کے لیے بلایا گیا ہے۔ لیکن ایسا ہونا اِس لیے ممکن نہیں تھا کہ ایما ایک جونیئر آفیسر تھی اور اپنی اِس حیثیت کے سبب جان برنٹن سے اِس نوعیت کی ملاقات کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ بفرضِ محال اگر ایسا ہونے جا بھی رہا تھا تو خلافِ ضابطہ تھا جس پر اُسے یقیناً احتجاج کرنا چاہیے تھا لیکن اِن تحفظات کے ہوتے ہوئے اگر وہ اُن کا برملا اظہار نہیں کر پا رہا تھا تو اُس کی وجہ بھی خود ایما ہی رہی تھی جس سے اِس بہانے ملاقات کا امکان ہی نہیں بلکہ یقین تھا۔

اِس اضطراب کا منفی سبب ولیم سینٹ جان گالوے کی جانب سے کیا جانے والا کوئی ممکنہ خفیہ وار بھی ہو سکتا تھا کہ جس کی جانب ایما اُس سے ہونے والی آخری ملاقات میں اشارہ کر چکی تھی۔ اگر یہ واقعی ایک سنجیدہ دفتری ملاقات کا بلاوا تھا تو کیا اُسے حق حاصل تھا کہ وہ اتنی بڑی

ریلوے کمپنی کا چیف انجینئر ہوتے ہوئے اپنے آپ کو تضحیک کے لیے ایک جونیئر آفیسر کے روبرو محض اِس لیے پیش ہونے دے کہ وہ حالتِ زِش میں اُس کے اُبلتے ہوئے بوسے سے لطف اندوز ہو چکا تھا۔ اُس کا دل چاہا کہ ایما سے ٹیلی گرافک رابطہ کر کے اِس بُلاوے کا سبب ہی پوچھ لے مگر پہاڑوں کا سینہ چیر کر ریلوے لائن بچھانے کا ماضی رکھنے والے اِس ماہر انجینئر کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ وہ جواباً کچھ ایسے استفسار کے لیے سلسلہِ جنبانی کر سکے۔

پانچ بجنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے اور ایما کا دفتر سائٹ آفس سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر تھا لہٰذا جان برنٹن نے اپنے اضطراب پر کاٹھی ڈالنے کے لیے شیواز کی بوتل نکالی اور دیکھتے ہی دیکھتے دو پیگ اندر اُنڈیل لیے۔ طبیعت میں تھوڑا سا ٹھہراؤ آتے ہی اُسے سگار کی طلب ہوئی تو اُس نے چوبی الماری کا طاق کھولا اور اندر رکھے کتابی سائز کے ڈبے میں سے ایک سگار نکال کر سُلگانے کے بعد تیزی سے کئی لمبے کش لیے اور اپنے خیمے سے باہر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے ذہن میں مچی ہوئی ابہام کی ہڑبونگ تمباکو کی نکوٹین تھپکانا شروع کر چکی تھی۔ دریائے ستلج کا جنوبی کنارہ اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ چڑھتے ہوئے ستلج کا جھاگ بنا کر بہتا ہوا پانی بھی اُسے اپنی ہی طرح مضطرب لگا۔ شاید ستلج کی بھی کوئی ایما ہو جس کا پُراسرار بُلاوا اُسے مسلسل ہیجان کی نذر کیے جا رہا ہو مگر وہ خود تو اترتا ہوا دریا ہے تو پھر دونوں میں طغیانی ایک جیسی کیوں؟ ''یہ ایمائیں بھی کیا کرشماتی مخلوق ہیں! پاس ہوں تو اُبال تک نہیں آتا اور دور ہوں تو اضطراب، کھولاؤ اور ہیجان جان تک نہیں چھوڑتے۔''

اُس نے بہتے ہوئے پانی کے تلاطم سے نگاہ ہٹائی تو مزدوری پر آئے ہوئے انسانوں کی لمبی قطار اُسے پُل کے لیے ستون سازی کے کام میں مصروف دکھائی دی جیسا کہ چیونٹیاں اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے اِس طرح جُتی ہوں؟ جیسے دنیا میں کسی اور کے کرنے کے لیے کوئی کام ہی نہیں رہا۔ ''کاش کوئی زمانہ تو ایسا آئے کہ یہ سارے کام مشینیں سنبھال لیں، برسوں کے کام دنوں میں ہونے لگیں اور انسانوں کے عضلات کو صدیوں سے چیرتی چلی آ رہی مشقت کے جبر سے نجات ملے۔'' جان برنٹن نے آنکھیں بند کر لیں۔ سگار کے ہر کش کے ساتھ پھیپھڑوں

میں جاتی نکوٹین نے پورے بدن میں پھیل کر اپنے سوا ہر نقش کھرچنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اِس مصنوعی سرور کی جگمگاہٹ، تنک تابی میں بدلنا شروع ہوئی تو جان کی آنکھوں کے خود بخود کھلنے کے ساتھ ہی وہی پہلے والا اضطراب، وہی بے چینی پھر سے لوٹنا شروع ہو چکی تھی۔ وہ کرسی سے اُٹھا اور خیمے میں چلا آیا۔ لیکن خیمے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے ٹھٹھکنا پڑا کیونکہ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ اُس کے خیمے کی عقبی سمت اُس کا بیٹا ولیم آرتھر اور ہیوج لُیو وِن مانک دونوں اکٹھے کھڑے سرگوشیوں کے سے انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

''میرا بیٹا اور اُس کے ساتھ میرے دشمن ولیم گالوے کا خاص ایجنٹ ہیوج؟ اِس قدر ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر؟''.... جان برنٹن کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے کچھ لمحے توقف کیا کہ اُن کی گفتگو سُن سکے یا اُس کا اندازہ لگا سکے مگر ہر دو معاملات میں ناکام رہا۔
''میرا بیٹا اگر میرے مخالفین کے ساتھ دوستی کر سکتا ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' جان برنٹن شدید دل گرفتگی کی حالت میں خیمے میں داخل ہوا۔ اُس کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا سوائے شیواز کی بوتل کے۔ اب کے اُس نے بوتل پکڑی اور اپنے آپ کو بکھرنے سے بچانے کے لیے اُسے منہ سے لگانا چاہا مگر لبوں تک لا کر رک گیا۔ ادھر اُدھر نگاہ دوڑا کر گلاس اُٹھایا اور اُس میں ڈبل پیگ کی مقدار اِس طرح اُنڈیلی جیسے براہِ راست اپنے گلے میں اُنڈیل رہا ہو۔

جان برنٹن کو محسوس ہوا کہ اُسے ذلیل کیے جانے کا عمل شروع کیا جا چکا ہے کہ جس کا پہلا قدم ایک جونیئر آفیسر کے روبرو اُس کے پیش ہونے کا بُلاوا ہے۔ اُس نے چاہا کہ ایما کے سامنے پیش ہونے سے بہتر ہے کہ یہیں سے اپنا استعفیٰ ٹیلی گرام کے ذریعے بھجوا دے۔ اُس نے ذہن میں دو چار احتجاجیہ جملے ترتیب دیے اور ٹیلی گراف مشین کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ کر اپنے حواس مجتمع کرنے لگا۔ پھر خیال آیا کہ یہ پراجیکٹ تو اُس کا عشق ہے، کیا وہ اپنے عشق کو رقیبوں کے حوالے کر کے بھاگنا چاہتا ہے؟ ایک دم اُسے گالوے، ہیوج اور اپنا بیٹا ولیم تلواریں سونتے اپنے سامنے آتے دکھائی دیے جب کہ وہ خالی ہاتھ تھا۔ اُسے یوں لگا کہ جیسے کسی نے پیچھے سے آ کر اُس کے ہاتھ میں بھی تلوار دے دی ہو۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا مگر وہاں سوائے خامشی کے

اندھیرے کے کچھ بھی نہیں تھا۔ جوں ہی اُس کے ہاتھ میں تلوار آئی سامنے کھڑے ہوئے وہ تینوں رقیب تحلیل ہوتے چلے گئے اور اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

جان برنٹن نے اپنا سر جھٹکا تو ایک بار پھر وہ بھی خالی ہاتھ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تخیلاتی طلسم کچھ دیر اور رہتا مگر سائیس کی آواز نے بگھی تیار ہونے کا پیغام دے کر اُسے چونکا دیا۔ خیمے میں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ اُس نے نقرئی زنجیر سے ''مگر بٹن'' کے ساتھ بندھی ہوئی گھڑی کو کوٹ کی جیب سے نکال کر دیکھا تو چار بجنے کو تھے۔ پھر اُس نے آئینے میں اپنا آپ دیکھا، کچھ بنایا کچھ سنوارا اور پھر سر پر ہیٹ اور ہاتھ میں چھڑی لے کر خیمے سے باہر نکل گیا جہاں بگھی اور اُس کے ساتھ دو حفاظتی گھڑ سوار اُس کے منتظر تھے۔ بگھی پر بیٹھتے ہوئے جان کا دل چاہا کہ اپنے خیمے کی عقبی سمت ایک بار پھر سے دیکھتا جائے مگر اُس نے نگاہیں راستے پر گاڑ دیں۔ وہ ایک بڑی ذلت کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ مگر جوں ہی وہ سائٹ کیمپ کے صدر دروازے سے نکلا اُس کی نگاہ خاردار تاروں کے ساتھ بیٹھی ہوئی مقامی لباس میں ملبوس ایک لڑکی پر پڑی جو اُس کی بگھی کو دیکھتے ہوئے کھڑی ہوگئی تھی۔ لڑکی اپنی جسمانی وضع سے حاملہ لگ رہی تھی۔ جان پر نگاہ پڑتے ہی لڑکی نے اُسے فوجی انداز میں سلام کرنے کے ساتھ ساتھ مسکرانے کی کوشش کی مگر اُس سے مسکرایا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔

''اس کو کہاں دیکھا ہے؟''.... جان برنٹن نے ذہن پر خاصا زور دیا مگر یادداشت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ البتہ اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ جانی پہچانی تھی۔ شاید وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر اُس کی بگھی اُتنی تیزی سے اُس سے دور ہوتی چلی گئی۔

''کہاں دیکھا ہے اِسے؟''

یہ سوال بار بار جان برنٹن کے ذہن میں کھلبلی مچائے چلا جا رہا تھا مگر یہ ذہن ہی تھا جو اُس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ شاید اِس کا سبب یہ بھی تھا کہ اُس کے ذہن کے ایک گوشے میں ولیم سینٹ گالوے اپنی شیطانی صفات کے ساتھ مہم جوئی کے لیے موجود تھا تو دوسری جانب سراپا التفات و کرم مِس ایما کہ جسے ممکنہ طور پر اُس کے احتساب کا فریضہ سونپ دیا گیا تھا۔ وہ دیکھنے کو

منتظر تھا کہ وہ لب جن سے اُسے نئی زندگی جینے کا حوصلہ ملا تھا اُن سے زِش آلود جملے کیسے بیاں ہوتے ہیں؟ اِن سب سے الگ تیسرے گوشے کا مکیں اُس کا بیٹا ولیم تھا جسے اُس نے اپنے بدترین مقابل ومخالف گالوے کے دائیں بازو ہیوج کے ساتھ سرگوشیاں کرتے دیکھا تھا۔ تو کیا اُس کا اپنا خوں، اُس کا اپنا بیٹا بھی گرتے ہوئے باپ کو اُٹھانے کے بجائے کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے گا؟

''میں تو اُسے بڑے مان کے ساتھ لایا تھا کہ وہ میرا دست وبازو بنے گا مگر نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنی ماں کا حساب چکتا کرنے میرے ساتھ آیا ہے۔ مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میرا خیال غلط ہو! شاید ایسا نہ ہو۔ وہ میرے مفادات کی نگہبانی ہی کر رہا ہو۔ اور اب دماغ کے چوتھے کونے میں یہ کون لڑکی آن دھمکی کہ جسے میں جانتا تک نہیں مگر اُس کی صورت کہتی ہے کہ میں اُس سے آشنا ہوں۔''

# ۲۰

ملوکاں بیٹی کے ساتھ مولوی جارُاللہ کے ہاں پہنچی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی جب کہ سنگری کے ہاں اتنا اعتماد نجانے کہاں سے آ گیا کہ وہ سینہ تانے اُس سے آگے آگے چل رہی تھی۔ مولوی صاحب اپنے حجرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اندر سنگری داخل ہوئی تو مولوی چونک گیا کہ یہ حور جنت میں گئے بغیر کہاں سے راستہ کھوٹا کر کے اِدھر آن گھسی ہے مگر جیسے ہی اُس کے پیچھے پیچھے ملوکاں داخل ہوئی تو پہچان گیا کہ یہ حور اور کوئی نہیں سنگری ہے، سیدے کی منکوحہ۔ ایک لمحہ پہلے وہ جتنا چوڑا ہوا تھا اُتنی ہی جلدی واپس سمٹ گیا۔ اِس سے پہلے مولوی ملوکاں سے کچھ پوچھتا سنگری سیدھا اُس کے سامنے جا بیٹھی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی کہ آپ سے کچھ بات کرنی ہے علیحدگی میں۔

مولوی جارُاللہ نے ایک نگاہ سنگری کے چہرے پر ڈالی تو گڑبڑا گیا۔ وہ براہ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی ایک ایسے پیغامیہ خط کے ساتھ کہ جو صرف مردانہ ڈاک خانے تک پہنچتا ہے۔ مولوی صاحب گھبرا گیا اور آنکھیں چرا کر سوالیہ انداز میں ملوکاں کی طرف دیکھنے لگا۔ جواباً ملوکاں کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ مولوی صاحب نے ایک بار پھر سنگری کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی تو وہ بدستور اُسی انداز میں مسکراتے ہوئے اپنے خط کی پہنچ کی رسید مانگ رہی تھی جب کہ وہ رسید دینے سے باوجوہ گریزاں تھا۔ نگاہیں تیسری بار ملیں تو مولوی جارُاللہ حوصلہ ہار

بیٹھا، اُٹھا اور حجرے کے عقبی سمت کے دروازے سے باہر نکل گیا کہ جس طرف کچھ موڑھے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن اُس کے بیٹھنے سے پہلے ہی اُس موڑھے پر سنگری بیٹھ گئی جس کے روبرو وہ کھڑا تھا۔ سنگری کے بیٹھ جانے کے باوجود مولوی صاحب بیٹھا نہیں، ہچکچاتا رہا لیکن سنگری نے بے تکلفی سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے والے موڑھے پر بٹھا دیا۔ مُلا کتنی دیر تک اپنے ہاتھ کو اور پھر سنگری کو دیکھتا رہا جو جوں کی توں آنکھوں میں آنکھیں پھنسا کر اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

''مولوی صاحب! سچ سچ بتائیں، کیا میرا نکاح بچپن میں سیدے کے ساتھ آپ نے پڑھایا تھا؟''

''ہاں ہاں..... میں نے پڑھایا تھا۔''

''کیا میں نے اِس نکاح کو قبول کیا تھا؟'' ..... سنگری کی آنکھیں اب بھی مولوی جاڑاللہ کی آنکھوں میں تھیں لیکن اب کے اُس نے مولوی صاحب کا بایاں ہاتھ بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''ہاں..... تمہارے والدین نے......!''

''سنگری نے مولوی صاحب کا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے دبا دیا۔ ''سیدا تو مر کھپ گیا۔ قبر کا نام نشان بھی نہیں، تو میں کیا کروں........ میں تو آپ سے نکاح کرنا چاہتی ہوں، آج، بلکہ اِسی وقت.... تو بتائیں ناں! کیا میرا نکاح ہوا تھا سیدے کے ساتھ یا صرف دعائے خیر ہوئی تھی؟'
'سنگری نے مولوی صاحب کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ساٹھ برس سے اوپر ہو چلے مولوی صاحب کے دونوں ہاتھ کپکپانا شروع ہو چکے تھے۔ بس ایک لمحے کے لیے مولوی جاڑاللہ نے کچھ سوچا اور پھر دونوں ہاتھ سنگری کی گرفت سے چھڑوا لیے۔

''تُف ... تو تو چاہتی کیا ہے؟ ý ý ... مُلا کو سنگری کی آنکھوں سے ٹپکتی شہوت آمیز وحشت کا سامنا کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''بتایا تو ہے کہ آپ مجھ سے نکاح کر لیں، ابھی اِسی وقت.... اور کیا؟''

''میں کیوں کروں نکاح تمہارے ساتھ؟ تمہاری عمر کی تو میری ڈوتریاں پوتریاں ہیں،

مجھے لحاظ آتا ہے۔''

''آہا..... اُس وقت کیوں نہیں آتا لحاظ جب آتے جاتے میرے بُت کی ایک ایک بوٹی تاڑتے رہتے ہو کہ کہاں کہاں ماس زیادہ ہے اور کہاں کم۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ حرام کرنے میں لحاظ نہیں آتا اور حق حلال کرنے میں خوف بھی آنے لگتا ہے اور لحاظ بھی۔'' سنگری نے اونچی آواز میں ایک دم مُلا کو کھری کھری سُنائیں اور موڑھے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔''میں بتاتی ہوں سب کو جا کر کہ میرے ساتھ زبر زنا کر کے مولوی نے مجھے گھن کر دیا ہے۔'' سنگری تو اب مزید تاخیر کیے بغیر آپ سے تم اور تم سے تو پر آ چکی تھی۔

مولوی جارُاللہ عجیب مخمصے میں تھا۔ اُس نے سوچا تک نہیں تھا کہ کبھی ایک اٹھارہ اُنیس برس کی لڑکی محض اپنی حد سے بڑھی ہوئی چترائی کے سبب اُسے یوں نچا کر رکھ دے گی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اِس عمر کی کوئی لڑکی اپنے سے تین گنا عمر کے ایسے بندے پر زنا کی تہمت لگانے کی دھمکی بھی دے سکتی ہے کہ جس نے خود ایک دنیا کو آگے لگایا ہوا ہو۔ کیا کسی دشمن نے اُسے خراب خوار کرنے کے لیے کوئی چال چلی ہے یا یہ لڑکی خود کسی اور کے وار سے بچنے کے لیے کوئی مضبوط سہارا ڈھونڈ رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو اُس نے سوچا کہ ماں بیٹی کو جوتے لگا کر چلتا کرے مگر کیسے؟ وہ اُس کی قینچی سے زیادہ تیز زبان کو کیسے روک پائے گا؟ کہتی تو ویسے وہ بھی ٹھیک ہی تھی کہ کبھی کبھار آتے جاتے جس کسی کی نگاہ ایک بار اُس پر پڑ جاتی تو پھر ہٹانا مشکل ہو جاتی۔ ہر کوئی یہی سوچتا کہ سیدا مقدر کا بڑا تیز ہے کہ اتنی حسین لڑکی کو بچپن سے قابو کیے پھر رہا ہے۔ مگر سیدا کہاں مقدر کا دھنی! وہ تو نامراد گیا دنیا سے۔ قسمت کا دھنی تو تو ہے کہ جس کے بوڑھے دروازے کی چوکھٹ پر وہ کمسن حسینہ سوالی بن کر آئی بیٹھی ہے۔ اللہ جانے کہ اُس کا دماغ خراب ہے یا مقدر۔ جب تک چلتا ہے تو کیوں نہ مفت کی اس نعمت کا لطف اُٹھایا جائے۔ کفرانِ نعمت کی صورت میں بغیر باپ کے پلنے والی یہ لڑکی جو سیدے جیسے بدمعاش کے نکاح میں رہی ہو اُسے خراب کرنے کے لیے کہیں سے بھی گھن ہو کر اُس کے خلاف بک سکتی ہے۔ وہ نکاح چاہتی ہے نا! بس ایک بار نکاح ہو جائے پھر دیکھتے ہیں کہ کیا اُکھاڑتی ہے میرا! دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہی مُلا اپنے آپ کو

ہشاش بشاش لگنے لگا تھا۔

''کون بد بخت کہتا ہے کہ تمہارا نکاح ہوا تھا سیدے کے ساتھ؟ بچپن کا نکاح بھی کوئی نکاح ہوتا ہے۔ وہ تو صرف دعائے خیر تھی اور اُس کی کیا حیثیت! تم آزاد ہو جہاں مرضی آئے شادی کرو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا.... بے شک مجھ سے کرلو ýÿ ý... جملے کا آخری حصہ مولوی صاحب نے اتنے آہستہ سے کہا کہ صرف سنگری نے سُنا اور مسکراتے ہوئے دوبارہ موڑھے پر بیٹھ گئی۔

''تو بلائیں نکاح پڑھانے والے کو''... سنگری کے لہجہ میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔

''ہمارا نکاح کون پڑھائے گا... ہم خود ہی پڑھیں گے''... مولوی صاحب کے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ آواز بھی تھرتھرانے لگی تھی۔

''میں اماں کو بُلاتی ہوں''

''اور میں دو گواہوں کو.... باہر بیٹھے ہوں گے جندوا اور وسایا''

وہ دونوں ابھی موڑھوں سے اُٹھ بھی نہیں پائے تھے کہ حجرے میں شور سُنائی دیا۔ مولوی صاحب کے چہرے کا رنگ بس اُسی آن میں متغیر ہو گیا جب کہ سنگری اُتنی ہی پر سکون تھی کہ جتنی یہاں آتے وقت تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اپنی حس سماعت کہیں باہر بھول کر وہ یہاں صرف اپنی بات کہنے کو بیٹھی ہو، سننے کے لیے نہیں۔ شور کچھ زیادہ ہونے لگا تو اچانک حجرے کا عقبی دروازہ کھلا اور مُنگر بوکھلائے ہوئے انداز میں اُن کے سامنے آ گیا جس کے ساتھ مگر ایک قدم پیچھے اُتنی ہی گھبرائی ہوئی ملوکاں بھی موجود تھی۔ مُنگر نے مولوی صاحب کے ساتھ سنگری کو دیکھا تو کچھ اور بھی بوکھلا گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دونوں ماں بیٹیاں مولوی صاحب کے پاس کیا کرنے آئی ہوئی ہیں اِس طرح کہ ماں اگر باہر حجرے میں بیٹھی تھی تو بیٹی حجرے کے پچھواڑے میں اکیلی تھی مولوی کے ساتھ۔ مولوی صاحب نے مُنگر کو دیکھا اور مُنگر نے اُن دونوں کو۔ عجب صورتِ حال کا سامنا تھا مولوی جارُ اللہ اور مُنگر، دونوں کو۔ ایک گھبرایا ہوا اور دوسرا بوکھلایا ہوا مگر اُن دونوں کے چہروں پر ایک جیسے سوال ہی سوال تحریر ہوتے چلے جا رہے تھے جب کہ ملوکاں کی نگاہیں کبھی سنگری کے

چہرے پر اور کبھی مولوی صاحب کی گھبراہٹ پر۔ منگر کا وہاں اس طرح اچانک چلے آنا بھی سنگری کے اعتماد کو متزلزل نہ کر سکا۔ وہ اُس کی آمد سے یوں لاتعلق رہی کہ جیسے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔

''مولوی صاحب! سکندرے کی لاش مل گئی ہے.... اُدھر پتن سے کچھ پیچھے، سرکنڈوں میں پھنسی ہوئی۔ کسی نے کلہاڑی سے کاٹ کر دریا میں پھینک دیا ہے''.... منگر ایک ہی سانس میں ساری بات بتا کر ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ لیکن یہ خبر لاتعلق سی دکھنے والی سنگری پر تو جیسے بجلی بن کر گری۔ اَب چہرہ متغیر ہونے کی باری اُس کی تھی جب کہ مولوی جاڑاللہ کے لیے بھی یہ جھٹکا سہنا کسی طور پر سہل نہیں تھا۔

''سکندرا زندہ تھا اب تک یا لاش کافی پرانی ہے؟''.... مولوی صاحب نے اپنا حوصلہ کافی حد تک مجتمع کر لیا تھا۔

''نہیں پرانی نہیں..... بس ایک آدھ دن پہلے کی ہوگی!''

''اِس کا مطلب یہ ہوا کہ سیدا بھی زندہ ہے اب تک''.... یہ جملہ جہاں مولوی جاڑاللہ کے منہ سے آواز بن کر نکلا وہیں ایک چابک بن کر سنگری کی سوچ کی تہوں تک اترتا چلا گیا۔ لیکن ملوکاں نے تو اِس طرح سوچا ہی نہیں تھا۔ جیسے ہی اُس کو صورتِ حال کی نزاکت کا علم ہوا تو وہ آگے بڑھی اور منگر کی موجودگی کا احساس کیے بغیر ہی ہاتھ جوڑ کر مولوی صاحب اور سنگری کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''یہ دیکھو! کچھ تو خیال کرو میرے چٹے چونڈے کا اور باز آ جاؤ شادی کرنے سے خدا کے واسطے۔''

''کیا شادی؟ کس کی شادی؟ کس سے شادی؟''..... ملوکاں کی اَرداس نے منگر کو کچھ اور حواس باختہ کر دیا جو پہلے ہی وہاں موجود کرداروں کے غیر فطری اجتماع کے سبب بوکھلایا ہوا تھا۔ منگر کے سوالوں نے چند لمحوں کے لیے ماحول پر سکوت طاری کر دیا۔ اُس کے علاوہ وہاں موجود تینوں کرداروں کی غیر ضروری خاموشی نے منگر کی بوکھلاہٹ کو جنون میں بدلنا چاہا تو سنگری پھٹ پڑی۔ ''تمھیں کیا تکلیف ہے؟ میں شادی کر رہی ہوں مولوی صاحب سے اپنی رضا اور اپنی مرضی

ہے۔''

''لیکن تم تو سیدے کے حق میں ہو! کیسے ہو گا نکاح پر نکاح؟..... سنگسار کر دیں گے بستی والے تمہیں!''.... منگر بولنے سے زیادہ کھولنے پر آ گیا تھا۔

''اُو منگر! میری بات سُن.... تمہیں کس نے بتایا کہ اِس کا نکاح سیدے کے ساتھ ہوا تھا؟''..... مولوی جارُاللہ ماحول کا مزاج دیکھ کر بظاہر نہایت اطمینان کے ساتھ دوبارہ موڑھے پر بیٹھ چکا تھا۔

''مجھے تو میرے وَڈکوں نے بتایا تھا لیکن ایک مجھے کیا ساری بستی کو پتہ ہے کہ سنگری اور سیدے کا نکاح ہوا تھا نِکے لا.....''یوں لگ رہا تھا کہ جیسے منگر گر بڑا گیا ہو۔''اُو ماسی! تو بتاتی کیوں نہیں کہ سنگری کا نکاح سیدے کے ساتھ ہوا تھا؟''

''اِسی مولوی صاحب نے تو پڑھایا تھا نکاح میری سنگری کا اور اب مکر رہا ہے چٹی چمڑی دیکھ کر۔'' ملوکاں کو جیسے ہی منگر کی حمایت ملی وہ تو پھٹ پڑی۔ اِن حالات میں مولوی جارُاللہ کہاں چُپ رہنے والا تھا، سُو منہ کو غصے سے لال پیلا کرتے ہوئے موڑھے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اُو بے شرمو! شرم نہیں آتی مجھ پر الزام لگاتے جس سے بات کرتے ہوئے انگریز بھی ڈرتا ہے، کئی بار سوچتا ہے کہ مولوی صاحب سے بات کرے یا نہ کرے۔ عقل کے اندھو! بھلا نکاح کوئی نِکے لا کا بھی ہوتا ہے؟ میں کیوں کرتا بھلا یہ شریعت کے خلاف کام۔ مجھے بلایا گیا تھا دعائے خیر کے لیے لہٰذا سنگری اور سیدے کی دعائے خیر کے بعد واپس آ گیا۔ اب اگر تم دعائے خیر کو بھی نکاح بنا لو تو تمہاری مرضی..... یہ چھوٹا موٹا ناداں تم لوگوں کی بکواس سے نکاح نہیں بن جائے گا۔'' مُلا اب تو بالکل ہی ہتھے سے اُکھڑ رہا تھا۔

''تو اب تک اسے نکاح کیوں کہا جاتا رہا ہے؟''..... منگر اب بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا اور نہ ہی حوصلہ چھوڑنے کو۔''یہ تو تم لوگوں کی جہالت ہے ورنہ میں نے کب کہا ہے کہ یہ نکاح ہے۔ صرف ناداں ڈالنے سے کوئی کسی کا بدّھلِ نہیں ہو جاتا، میرے نزدیک سنگری بالکل ہی آزاد

ہے چاہے جہاں نکاح کرے، سیدے کا انتظار کرے یا کسی اور سے کرے۔'' مولوی صاحب اپنی صورت اور روپے، دونوں سے بیزار دکھائی دینے لگا تھا۔

''میں نے کہاں جانا ہے مولوی صاحب! شادی کروں گی تو آپ سے ورنہ کسی سے نہیں۔ اب اگر سیدا بھی آ جائے تو میں اُس کے منہ پر بھی نہ تھوکوں۔'' سنگری یہ کہہ کر مولوی صاحب کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور فاتحانہ انداز میں منگر اور ماں دونوں کو دیکھنے لگی جو حیرت اور تاسف کے ملے جلے جذبات سے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے مگر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک سوال کے ساتھ کہ اب کیا کیا جائے۔ منگر کو ملوکاں کے چہرے سے کوئی جواب نہ ملا تو نگاہیں جھکا کر کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا مگر جب سوچنے سے بھی کچھ بن نہ پڑا تو ایک دم پینترا بدل کر بولا ''ٹھیک ہے مولوی صاحب! اگر سنگری کی یہی مرضی ہے اور سیدے سے اُس کا نکاح بھی نہیں ہوا تو ہم کون ہوتے ہیں اُدھ میں آنے والے، کر لیں بے شک آپ نکاح۔'' ملوکاں جو ابھی تک منگر کی حمایت پر آسرا کیے جا رہی تھی، فوراً ہی تلملا اُٹھی لیکن منگر نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ ''لیکن ایک بات ہے مولوی صاحب!''

مولوی جارُاللہ جو منگر کے چہرے کے تاثرات سے اُس کی چال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اُس کے سوال پر خاموش رہا لیکن اپنے چہرے سے کچھ ایسا تاثر دیا کہ جیسے کہہ رہا ہو تو میری چھوڑ، اپنی بات مکمل کر۔''

''مولوی صاحب! سنگری بے شک یتیم ہے لیکن ہے تو ہمارا خون۔ مان لیا کہ اُس کا نکاح سیدے کے ساتھ نہیں ہوا تھا لیکن اب آپ کے ساتھ بھی رُخصتی ایسے نکھد روں کی طرح تو نہیں ہو سکتی۔ آپ بھی عزت والے ہیں، نانا دادا ہو چکے ہیں، اِس لیے ایسا کریں کہ آج رہنے دیں اور آنے والی خمیس چار عزت دار آدمی لا کر نکاح بھی کر لیں اور رخصتی بھی۔ یہ نہ ہو کہ لوگ آپ کو بھی تو ئے توئے کریں۔'' منگر نے تو لوہا گرم کیے بغیر ہی چوٹ لگا دی تھی مگر مولوی ڈِتن بھی کہاں کچی گولیاں کھیلے ہوا تھا، سمجھ گیا کہ یہ حرامی وقت لینا چاہ رہا ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سیدے تک یہ بات پہنچا دے تا کہ پھر سیدا جانے یا خود مولوی۔

''نہ پُتر آنداں خیس نہ'' ...... مولوی نے دور ہی سے ہاتھ کو بُجا نما اشارے میں نفی کی صورت ہلا دیا۔'' نکاح اور رخصتی دونوں کل ہوں گے اور عصر کی جماعت سے پہلے اور اگر یہ قبول نہیں تو ابھی کرتا ہوں نکاح، ایک گواہ تو ہی سہی!'' ..... مولوی کی بات سُن کر سنگری اور منگر دونوں نے اپنے اپنے چہروں کے متلون مگر معکوس جذبات کے تحت مولوی صاحب سے کچھ کہنا چاہا مگر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں کو چُپ رہنے کو کہا اور کسی کی بات سنے بغیر اُٹھ کر زنان خانے کی طرف چلا گیا۔ اِدھر سنگری کو ایک لمحے کی تاخیر میں بھی اپنی بربادی دکھائی دے رہی تھی جب کہ منگر اور ملوکاں کو اگر اِس مصیبت سے نجات کی توقع کسی صورت تھی تو صرف اور صرف حتیٰ المقدور تاخیر میں۔ مفادات کا یہی وہ یکساں نکتہ تھا کہ جو اُن دونوں کو قریب سے قریب تر کیے جا رہا تھا۔

# ۲۱

جان برنٹن کا کمپنی کے سائٹ آفس سے بہاول پور مین آفس تک کا سفر نہایت ناخوش گوار گزرا۔ مخمصے، اُلجھنیں، خوف، بے یقینی، مایوسی اور ہزیمت اِس طرح جُز کر اُترے کہ اُن کے احساس سے جان چھڑانا ہی مشکل ہو گیا۔ رہی سہی کسر اُس لڑکی کی سوال کرتی ہوئی آنکھوں نے پوری کر دی جو سائٹ آفس کے صدر دروازے کے باہر خاردار تاروں سے لگی بیٹھی تھی۔ جان کے ذہن میں گرد دھال برپا کرتے تفکرات نے جہاں اُس کی یادداشت پر چکنی مٹی کا پوچا پھیر رکھا تھا وہیں اُس کی فہم سے جُڑی بھی حسیات کو اِس طرح رگیدا ہوا تھا کہ سمجھ میں آنے والے اِشارے بھی ناسمجھی کی نذر ہو رہے تھے۔ معاملات کے اِسی اُدھیڑ بن میں وہ اپنے آپ کو اُدھیڑتا ہوا ایما کے دفتر پہنچا تو پانچ بجنے میں دس منٹ رہتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ تاخیر سے آنا بُری بات اور طے شدہ وقت سے پہلے آجانا اُسی سے بھی کہیں زیادہ بُری بات ہے مگر پھر بھی اپنی ایک جونیئر آفیسر اور وہ بھی ایما جیسی مہربان خاتون کو دس منٹ پہلے اپنی آمد کی اطلاع کرا دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن یہ دس منٹ اُس کے اعصاب پر جس طرح بھاری پڑے اُس کا جان برنٹن کو اندازہ ہی نہیں تھا۔ ایما کو اپنی آمد کا پیغام بھجوانے کے باوجود اُس کے آفس کے باہر بیٹھ کر بلاوے کے انتظار کو برداشت کرنا اچھا بھلا دل گردے کا کام تھا۔ اِس انتظار نے جان برنٹن کی انانیت کا محض دس منٹ میں بھرکس نکال کر رکھ دیا۔ جو کام ولیم جان گیلوے جیسے اُس کے کھلے دشمن نہیں کر پائے تھے وہی کام محض اپنے

تبدیل شدہ رویے سے اُس ہستی نے کر دکھایا کہ جو قبل ازیں اُس کے لیے نئی زندگی کا سندیسہ بن کر ظاہر ہوئی تھی۔

ٹھیک پانچ بجے جب جان برنٹن کی ایک ایک نس نس بار بار چٹخنے کے عمل سے گزرنے کے بعد اپنی حسیات سے لاتعلق ہو چکی تھیں، ایما اپنے کمرے کے دروازے پر ظاہر ہوئی اور اُسے اندر آنے کو کہا۔ جان برنٹن نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے ایما سمیت اپنے اطراف میں ایک ایک چیز کو دیکھا اور پھر دیکھنے کے بعد کرسی سے اُٹھنے کی کوشش تو مگر اُٹھا نہ گیا۔ اِس دوران ایما پھر سے اندر جا چکی تھی۔ اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی لاتعلقی نے جان برنٹن کو مزید بے جان کر دیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ اب اِس کمپنی میں اُس کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اُس نے حواس مجتمع کرنے کے لیے گردن کرسی کی پُشت پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ بس ایک لمحے میں اُس کا تمام کیریئر اُس کی آنکھوں میں گھوم کر رہ گیا۔ کہاں ایک نوجوان اور پر جوش انجینئر کہ جسے ایک طویل عرصے تک ریلوے کے شعبے کا اثاثہ قرار دیا جاتا رہا اور کہاں یہ وقت کہ وہ اُس کمپنی میں بھی بے وقعت ہو کر رہ گیا ہے جو اُسے بھاری معاوضے پر سنڈی ریلوے کمپنی کے خاتمے سے پہلے ہی اپنے ہاں عزت اور احترام سے لے آئی تھی اور کوٹری سے ملتان تک ریلوے ٹریک بچھانے ایسا بڑا پروجیکٹ اُس کے حوالے کر دیا تھا۔ اُس کی پیشہ ورانہ دیانت اور اپنے کام سے لگن ہمیشہ مثالی سمجھی جاتی رہی۔ ریلوے کی تاریخ میں اُس کے محیر العقول کارنامے تربیتی نصاب کا حصہ بن چکے تھے اور یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہو گیا تھا۔ اُسے قدم قدم پر اپنی ذات کی نفی کرنا پڑی تھی۔ اپنی محبوب بیوی اور بیٹے تک کو نظر انداز کرنا پڑا جس کا نتیجہ ازدواجی زندگی کی شکستگی، بیوی کی بے راہ روی اور باپ بیٹے میں مستقل منافرت کی صورت ہی نکلنا تھا۔ جان برنٹن کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس نے کتنا کھویا اور کتنا پایا۔ کیا جو کچھ پہلے ''پانا'' دکھائی دیتا تھا کیا کہیں وہ مستقل ''کھونا'' تو نہیں تھا۔ وہ خود کو کسی فاتح بادشاہ کا ایسا گھوڑا سجھائی دینے لگا تھا جس نے بہت بڑے بڑے معرکوں میں بادشاہ کو اپنی طاقت اور رفتار سے فتح نصیب کیا مگر اب اُسے از کار رفتہ سمجھ کر مقتل کی طرف دھکیلنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہو۔

''آپ خیریت سے تو ہیں مسٹر جان!.......''

جان نے آنکھیں کھولیں تو سامنے ایک بار پھر ایما کھڑی ہوئی تھی۔اب کے اُس کے چہرے پر جان برنٹن کے لیے ہمدردی کے جذبات تھے۔اُس نے جھک کر اپنا دایاں ہاتھ جان کے بائیں ہاتھ میں دے دیا تا کہ وہ وہ اُس کے سہارے کرسی سے اُٹھ سکے۔

''میں ٹھیک ہوں مِس ایما..... بس تھوڑی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا..... شاید نیند کی کمی کی وجہ سے.....'' یہ کہتے ہوئے جان کرسی سے اِس طرح اُٹھا جیسے بالکل ہشاش بشاش اور تر و تازہ رہا ہو۔ایما نے بھی اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے علیحدہ کر لیا اور وہ دونوں تقریباً ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اندر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔خلافِ توقع دفتری میز کرسی کی طرف بڑھنے کے بجائے ایما نے اُسے کونے میں رکھے فورسیٹر صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جہاں رسمی ملاقات کے بجائے غیر رسمی یا نیم ذاتی نوعیت کی ملاقاتیں کی جاتی ہیں۔جان برنٹن کی آنکھوں میں در آنے والی حیرت اُس کے چہرے پر پھیل چکی تھی۔اُس نے بے یقینی کے سے انداز میں ایما کی طرف دیکھا مگر وہ اُس کی طرف پشت کیے الماری میں سے کچھ کاغذ نکالنے میں لگی ہوئی تھی۔جان کو لگا کہ اُسے وہی کچھ کہا گیا ہے کہ جو اُس نے سُنا ہے لہٰذا وہ سامنے رکھے ہوئے ایک سنگل سیٹر پر براجمان ہو گیا۔اُسے اپنے اندر خود اعتمادی جاگتی ہوئی محسوس ہونے لگی لیکن اِس کا جاگنا شراب کے ایک پیگ یا سگار کے انتہائی گہرے کش سے مشروط ہوتا جا رہا تھا مگر کیا کرتا کہ اِن دونوں نعمتوں کا حصول کم از کم اِس وقت اُس کی دسترس میں نہیں رہا تھا۔

جیسے ہی ایما اُس کی طرف مُڑی جان برنٹن کو خوش گوار حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔اُس کے ایک ہاتھ میں فائل اور دوسرے ہاتھ میں شراب کی چھوٹی فلاسک تھی۔ایما اُس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر ہلکا سا مسکرا دی۔''خالی نہیں ہے..... آپ کا گزارا ہو جائے گا مسٹر جان!''

''ایما! تم ہمیشہ میرے لیے اُس وقت کچھ ایسا کر دیتی ہو کہ جب میں اُس کا تصور بھی نہیں کر پا رہا ہوتا، نجات دہندہ ہو تم میری..... جب میرے پاس جینے کو آس بھی نہیں بچ رہتی تم پھر سے میرے اندر زندگی اُنڈیل دیتی ہو۔'' جان برنٹن ایما کے ہاتھ میں شراب کی فلاسک دیکھ کر کھل

اُٹھا تھا۔ ایک لمحے کو وہ بھول گیا کہ کس لیے یہاں بُلایا گیا تھا یا اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ایما کوئی جواب دیے بغیر مسکراتی ہوئی اُس کے پاس آئی اور فلاسک کا ڈھکن کھول کر اُسے جان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جان سراپا سپاس اور سراپا تشکر۔ جلدی سے فلاسک کو منہ سے لگایا اور دو بڑے بڑے گھونٹ اپنے حلق میں اُنڈیل کر آنکھیں نیم وا کرتے ہوئے شراب کی کڑواہٹ کا لطف لینے لگا۔ ایما اُس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ دو گھونٹ اور اندر گئے تو ایک پژمردہ اور مضمحل جان برنٹن کی جگہ زندگی اور ذہنی توانائیوں سے بھرپور چہلیں کرتے ہوئے ایک ایسے شخص نے لے لی کہ جسے مایوسی اور پریشانی چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔

''ایما! سچ بتاؤں..... تمہارے پاس آتے ہوئے میں بہت خوف زدہ تھا....'' جان کی یہ بات سُن کر ایما کے ماتھے پر بَل اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن وہ اِس سے بے خبر شراب کے ہر گھونٹ سے پوری پوری لذت کشید کرنے کے بعد اُسے اپنے حلق کی راہ دکھا رہا تھا۔

''وہ کیوں؟.....'' اِس کیوں کا جواب جانتے ہوئے بھی ایما کو کسی نہ کسی طور جان سے مخاطب ہونا تو تھا۔ ''وہ اِس لیے کہ تمہیں اگر تمہارا جونیئر آفیسر جو مین آفس میں بیٹھا ہو، دفتری اوقات ختم ہوتے وقت اپنے پاس طلب کرے تو اِس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں خیر نہیں!.....''

''ہاں یہ تو ہے..... خیر واقعی نہیں!......'' ایما کے چہرے پر پل بھر ہی میں شرارت آمیز تاثرات پھیل گئے لیکن جان برنٹن ایک دم خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے ایما کی جانب دیکھنے لگا۔ ایما بدستور اُسے ویسے ہی شرارتی نگاہوں سے دیکھے جا رہی تھی۔ جان نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ہولے ہولے فلاسک کا ڈھکنا بند کرنا شروع کر دیا۔ اُسے لگا کہ ایما چوہے بلی کا کھیل کھیلتے ہوئے اُس کے اعصاب ٹوٹنے کا انتظار کر رہی ہے تاکہ جب وہ اُس کے فائر کیے جانے کی خبر دے تو وہ ایک مردہ گدھے کی طرح شراب کے تالاب میں تیر رہا ہو۔ گام گام چڑھنے والا سرور ایک پل میں ہوا ہو چکا تھا۔ ایما کے چہرے پر شرارت کی جگہ اضطراب، تذبذب اور بے یقینی کی پرچھائیاں چھا گئیں۔ جان برنٹن پل بھر میں ماحول سے لاتعلق ہو کر فرش کو گھورے جا رہا تھا۔ ایما

حیران تھی کہ اتنے بڑے ریل انجینئر کے اعصاب کو کیا ہوا کہ وہ اُس کے ارادوں کا ساتھ دینے سے انکاری ہو گئے۔ ابھی ایک کھلکھلاتا ہوا توانا شخص محض ایک جملے کی زد میں آتے ہی راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ اُسے جان برنٹن پر ترس آنے لگا۔ ''یہ وہ شخص تھا کہ جس نے سنڈی ریلوے کمپنی کو پاتال سے اُٹھا کر عروج کی انتہاؤں تک پہنچا دیا۔ کیا یہی وہ پروفیشنل ہے کہ جو اپنے حریفوں کو خاک چٹائے رکھتا تھا؟ وہ بے مثل ریلوے انجینئر جس نے اُن مقامات تک ریل کی پٹڑی کامیابی سے بچھا دی جہاں خچر کو لے جانا بھی جوکھم سے بڑھ کر تھا۔ وہ جس کے سامنے اُس کے بدترین دشمن بھی کھل کر سانس لیتے ہوئے خائف رہتے تھے۔ تو اب کیا ہو گیا؟ کیوں ٹوٹ کر رہ گیا وہ؟ کہاں گئی اُس کی اَنا، کیا ہوا اُس کا رعب اور کیسے مٹا اُس کا دبدبہ؟'' ایما کا دل بھر آیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر جان کے ہاتھ سے فلاسک لیا اور اُس کا ڈھکن کھول کر کئی گھونٹوں کا ایک گھونٹ بھر لیا۔ ایک بار پھر جان برنٹن کے سُتے ہوئے ہونٹ اُس کے سامنے تھے لیکن اب کے یہ ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہوتے رہ گئے۔

ایما نے سر کو زور سے جھٹکا اور کھڑکی پر پڑا ہوا دبیز پردہ ایک دم سارے کا سارا کھینچ دیا۔ باہر شام ہو چکی تھی۔ سورج غروب ہونے کے بعد اُس کی سُرخی بھی اندھیرے کے روبرو اپنی بقا کی آخری جنگ ہار چلی تھی۔ جان اُسے بے جان نگاہوں سے یوں تکے جا رہا تھا جیسے وہ کوئی جادو کی گڑیا کرتب دکھانے کے لیے اسٹیج پر اپنے معاملات کو ترتیب دے رہی ہو۔ ایما کو جان کا یوں اپنی طرف دیکھنا اس طرح لگا کہ جسے ''دیکھا نہ جائے'' کہا جاتا ہے۔ وہ اُس کے قریب آئی، ایک بار پھر اُس کا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں تھاما اور اُسے صوفے سے اُٹھا کر دفتر کے کمرے سے باہر اسی عمارت کے عقبی سمت لے کر جانے لگی کہ جہاں انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کے افسروں کی رہائش گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ دفتر سے باہر نکلتے ہی ایما نے جان کا ہاتھ تو چھوڑ دیا مگر وہ مسمرائز انداز میں کسی استفسار کے بغیر اُس کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ چند قدم کے بعد ہی پہلا بیچلر بنگلہ ایما کا تھا جس کے لکڑی کے پھاٹک نما دروازے کے قریب ہی ایک مقامی نوجوان نہایت مؤدب انداز میں غالباً چوکی داری کے لیے موجود تھا۔ ایما کو دیکھتے ہی اُس نے سلام کیا اور اڑھائی تین فٹ اونچا

پھاٹک اتنا ہی کھول دیا کہ جس سے سہولت کے ساتھ گزرا جا سکے۔

اندر جانے کے لیے جان برنٹن کا متذبذب انداز دیکھ کر ایما نے ایک بار پھر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بنگلے کا تعمیر شدہ حصہ پھاٹک سے تقریباً سو گز دور رہا ہوگا کہ جس کے درمیانی راستے کے دونوں طرف نہایت نفاست سے تراشے گئے گھاس کے تختے اور تختوں کے کناروں پر گُل داؤدی اور گلاب کے پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر ہاتھ چھوڑ دینے کے بعد جان برنٹن ایما کے ساتھ چل تو رہا تھا مگر ایک قدم پیچھے رہ کر۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُسے دفتری تقاضوں کے مطابق رسمی طور پر بُلانے کے بعد اب ذاتی حیثیت میں غیر رسمی طور پر کیوں پیش آیا جا رہا ہے۔ اِس بُلاوے کا وقت، بُلانے والی کی حیثیت اور پھر یوں بنگلے پر لے جایا جانا سبھی حیران کن عوامل تھے جن سے سوائے کنفیوژن کے اور کچھ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

اُدھر ایما بھی مسلسل سوچے جا رہی تھی کہ وہ جان برنٹن کو کیسے اُس جولانی والی کیفیت میں واپس لائے جو یہاں آتے ہی دو چار گھونٹ پینے کے فوراً بعد اُس پر طاری ہوئی تھی۔ ایما کو اِس بات کا بھی افسوس تھا کہ اُس کے محض ایک غیر محتاط جملہ بولنے کے سبب جان برنٹن کو دوبارہ اپنے یاسیت والے خول میں بند ہونا پڑا تھا۔ اُسے ایک فکر یہ بھی تھی کہ وہ تمام تر ناخوش گوار دفتری معاملات جو اُس نے جان برنٹن کے علم میں لانے تھے اب کیونکر اُسے بتا سکے گی۔ نجانے کیوں وہ نہیں چاہتی تھی کہ جان جیسا باکمال انجینئر دفتری سازشوں کا شکار ہو۔ اُسے اپنی حدود کا بھی علم تھا اور اُس معاملے کی حساسیت کا بھی جس میں وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا آپ اُلجھا بیٹھی تھی۔ بہرحال اُسے ریشم کے اِس اُلجھے ہوئے گچھے میں سے کسی ایسے تار پر اُنگلی رکھنا تھی سلجھاؤ کی ایسی تدبیر کے لیے جس سے نہ تو اُس کے وقار پر حرف آئے اور نہ ہی جان برنٹن کا کیریئر داغ دار ہو۔

اِسی شش و پنج میں وہ اُسے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے درمیان بنی ہوئی ایک مستطیل شکل کی لابی میں لے کر آ گئی جہاں سے دونوں کمروں کا داخلی راستہ ہو کر گزرتا تھا۔ اِس لابی میں ایک دیوان، دو آرم کرسیاں اور درمیان میں خوب صورت آبنوسی میز رکھی ہوئی تھی جو اپنی قدامت کی وجہ سے ماحول کو پُر وقار بنا رہی تھی۔ اِس لابی نما کمرے میں اگرچہ موم بتیوں کی وافر تعداد روشنی

کیے ہوئے تھی مگر خاصے کی چیز وہ کیروسین لیمپ تھا جس کی حال ہی میں ہونے والی ایجاد نے متمول گھرانوں کو روشنی کی نئی چمک دمک سے متعارف کرا دیا تھا۔ ایما کے کہنے سے پہلے ہی جان دھپ کر کے ایک آرمز کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ اُس کا سرور متوقع بے یقینی صورتِ حال کے اندیشوں کی وجہ سے ہوا ہو چکا تھا۔ سگار اور شراب کی شدید طلب کے سبب روشنیوں کی افزونی اُسے چڑ چڑا کیے چلی جا رہی تھی۔ ایما نے اُس کے چہرے پر چھایا ہوا اضمحال دیکھ کر کیروسین لیمپ بجھا دیا اور سوائے ایک موم بتی دان کے دوسرے دو اُٹھا کر ڈرائنگ روم میں رکھ دیے۔ جان نے آنکھیں موند لیں اِس انداز میں کہ جیسے اب اُسے کسی بھی قسم کے نتائج کی پروا نہ رہی ہو۔

کچھ دیر کے بعد ایما ایک ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی جس پر شراب کی بوتل اور دو خوب صورت گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جان کے جسم میں شراب کی شدتِ طلب اِس قدر تھی اُس نے اپنی قوتِ شامہ کے سبب کمرے میں بند بوتل کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن کمرے میں ایما جس لباس میں داخل ہوئی تھی اُسے دیکھ کر شراب کی طلب ثانوی درجے پر جا چکی تھی۔ مختصر ترین انڈر گارمنٹس پر انتہائی باریک کپڑے کی ڈھیلی ڈھالی سیاہ نائٹی اور نائٹی کے اندر سے چھلکتا ہوا اُس کا گلابی بدن۔ ایما نے شرم آگیں انداز میں مسکراتے ہوئے جان کی طرف دیکھا اور میز پر جھک کر پیگ بنانے لگی۔ اُسے بخوبی محسوس ہو رہا تھا کہ جان کی ناک اگر چہ شراب کی شامہ پیمائی میں مصروف تھی تو اُس کی آنکھیں مسلسل اُس کے بدن کے نشیبوں سے زیادہ فرازوں کو ٹٹولے جا رہی تھیں۔ ایما نے پیگ جان کے ہاتھ میں تھمایا تو اُس کی انگلیوں میں پیدا ہو چکی کپکپی ایما کو اپنی نسوانی حیثیت کی برتری کا احساس دلا چکی تھی جس کا سرور بھری بوتل کے روبرو بھی ہیچ تھا۔

جان بے تابی سے ایما کے پیگ اُٹھانے کا منتظر تھا مگر اُسے شراب کے گھونٹ سے زیادہ سرور آگیں، جان کی آنکھوں میں چھائی ہوئی وہ تحسین محسوس ہو رہی تھی جو اُس کے جسم کی رنگینیوں کے حضور مسلسل سراپا سپاس تھی۔ وہ اِس کیفیت سے باہر نہیں آنا چاہتی تھی مگر جان اُس کے ساتھ پیمانہ ٹکرانے کی رسم ادا کرنے کا منتظر تھا۔ چنانچہ پیمانے ٹکرائے بھی گئے اور لبوں تک بھی آتے رہے

مگر جوں جوں جان کی آنکھوں میں شراب اترتی چلی گئی توں توں ایما کم پیے بھی مدہوشی میں بیدار اور بیداری میں مدہوش ہوتی گئی۔ اِس کے برعکس جان بے تحاشا پینے کے باوجود ایک ایسے عالم سرشاری میں تھا کہ جہاں مرد کا ذہن حیاتی توانائی اور تلذذ کی معراج کو چھو رہا ہوتا ہے۔ جان سوچ رہا تھا کہ مردوں کے مقابل خواتین کی نہایت قلیل تعداد شراب کو اپنے معمولات میں شامل کرتی ہے۔ شاید اِس کی ایک وجہ یہ رہی ہو کہ پیمانے میں پڑی ہوئی شراب معدے میں اُنڈیلے جانے کے باوجود بھی کسی جنسی طور پر فعال عورت کو تسکین، طمانیت اور شہوانی تشفی کی اُس سطح تک نہیں پہنچا پاتی جو بن پیے بھی محض مرد کی آنکھوں میں اُس وقت جھانک کر حاصل کی جاسکتی ہے کہ جب وہ پی کر اُس کے اعضائے نمایاں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اور نمایاں کیے جا رہا ہوتا ہے۔ جسمانی طور پر باکمال عورت کمال تحسین کی اِس کیفیت کے احساس کو شراب پینے پر ترجیح دیتی ہے جب کہ پیتی صرف وہی ہے کہ جس کے ہاں کمال میں کوئی کمی رہی جاتی ہے یا کمال گزر چکا ہوتا ہے۔

پانچ پیگ کے بعد جان برنٹن بھرپور شعوری بیداری میں آچکا تھا۔ اِس احساس نے ہی اُس کے اندر پھر سے وہی خدشات جگانے شروع کر دیے جو یہاں آتے وقت اُس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ اب کہ اُس نے ایک الگ انداز میں ایما کی طرف دیکھا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور اب یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا کسی کو خبر نہیں کہ مس ایما اُسے اپنے بنگلے پر لے کر آئی ہے اور اُس کی بھرپور مدارت کیے جا رہی ہے؟ کیا اُسے کسی نئی مصیبت میں پھنسانا تو مقصود نہیں؟ کیا اُس پر اب اخلاقی گراوٹ یا کسی معزز خاتون کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کا الزام لگنے والا ہے؟ یہ سوچ کر ہی ایک بار پھر اُس کا نشہ غارت ہو گیا۔ اُس نے مشکوک نگاہوں سے ایما کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

''شاید تمھیں سگار کی طلب ہو رہی ہے مسٹر جان!... یہ کہہ کر اُس نے جان برنٹن کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور ساتھ رکھی تپائی سے سگار باکس اُٹھایا اور اُس کی طرف بڑھا دیا۔ سگار دیکھ کر جان نے ایک لمبی سانس لی اور سگار کو اُٹھا کر سونگھا اور پھر دانتوں تلے دبا کر سلگانے لگا۔ سگار نے دھواں دینا شروع کیا تو اُس کے پہلے ہی کش نے وہ تمام سرور اُس کی رگوں میں پھر

سے اُتار دیا جو چند لمحے پہلے اِدھر اُدھر غتر بود ہو گیا تھا۔ جان کو پر سکون ہوتے دیکھ کر ایما نے ایک ڈبل پیگ بنایا اور خود کو اُس سطح پر لانے کی کوشش کرنے لگی کہ جہاں اِس سے پہلے بن پیے پہنچی ہوئی تھی۔ اِس لمحے جان برنٹن ایما سے اُسی بوسے کی توقع کر رہا تھا کہ جس نے اُس کے رگ و پے میں زندگی کو امید کی صورت کاشت کر دیا تھا مگر اِس کے برعکس جوں ہی اُس کی آنکھوں میں ملہار اُتری اُس نے جان کی ملبوس پنڈلیاں اُٹھا کر اپنی رانوں پر رکھ لیں۔ جان نے حیران ہو کر اپنی پنڈلیاں ایما کی رانوں سے اُٹھانا چاہیں مگر اُس نے ایک مہربان مسکراہٹ اپنے لبوں پر بکھیر کر اُنہیں اتنی مضبوطی سے جکڑ لیا کہ اب اُنہیں چھڑانے کی مزید کوشش کرنا غیر مہذب حرکت ہوتی۔ جیسے ہی ایما کو احساس ہوا کہ جان برنٹن نے بوٹوں سمیت اپنی ٹانگیں اُس کی رانوں پر دراز کرنا ذہنی طور پر قبول کر لیا ہے وہ وہ اُس کے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگی۔ جان ایک بار پھر کسمسایا کہ جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا کر رہی ہو مگر ایما نے اب کے اُس کے ٹخنوں اور پنڈلی کی درمیانی جگہ پر اپنی کہنی ٹکا دی۔ اگر جان نے دبیز جرابیں نہ پہن رکھی ہوتیں تو یقیناً اُسے کونی کی چبھن کا احساس ہوتا مگر جوں ہی اُس نے اپنی کسمساہٹ بند کی ایما کونی ہٹانے کے ساتھ ساتھ اُس ایک بوٹ اتار چکی تھی۔ دوسرا بوٹ اُترا تو وہ اُس کے موزے اُتارنے لگی۔ اس بار جان کے چہرے پر معدوم ہوتی حیرت کے ساتھ ساتھ سکون آمیز مسکراہٹ پھیلنے لگی تو ایما نے بظاہر عجیب سی حرکت کی کہ اُس کے دن بھر کی تھکن سے چور پیروں پر جگہ جگہ اپنے ہونٹ مَس کرنے لگی۔

''کیا کر رہی ہو ایما... یہ میلے ہیں، اِن میں دن بھر کی بِساند ہو گی!....'' جان آخرکار بول ہی پڑا۔ اُس کے چہرے پر مصنوعی خفگی تو موجود تھی مگر اُس کے پیچھے چھپی ہوئی خواہش چھپائے نہیں چھپ رہی تھی کہ وہ یوں ہی اُس کے پاؤں کیا پورا بدن چومتی رہے۔ ایما نے جان کی خفگی کو امر متوقع جان کر اُس کے پاؤں اپنے سینے سے اِس طرح لگا لیے کہ وہاں کی بھری بھری گدازگی، کوندے کی طرح لپکی اور بدن کے ایک ایک مسام میں حدت پھیلاتی چلی گئی۔ جان نے آنکھیں موندتے ہوئے اپنی ٹھوڑی اونچی کر کے سر کو آرام کرسی سے اس طرح ٹِکایا کہ اُس کی ہلکی ہلکی جھریاں طلوع کرتی ہوئی گردن اُبھر کر سامنے آ گئی۔ وہ مست ہو رہا تھا۔ اُس کے چیخ چکے اعصاب

پر دن بھر چابک برساتی ہوئی شراب اور دھونی دیتے ہوئے سگار، دونوں کی طلب کو ایما کے بدن کے لمس نے ٹھوکروں میں اُڑا کر رکھ دیا تھا۔ اُس نے جان کے دونوں پیروں کے انگوٹھے آپس میں ملا کر اُن پر اِس طرح اپنے ہونٹ رکھے کہ اُس کی زبان اُن کو مَس کرتی رہے۔ جان برنٹن ایک بار پھر تڑپا، کسمسایا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اُس کی مزاحمت ختم ہوتے ہی ایما نے اُس کے پاؤں اپنے چہرے پر ملنے اور جگہ جگہ سے چومنے شروع کر دیے۔

''تمہارے تھکے ہوئے مایوس بدن سے اُٹھنے والی بو مجھے پاگل کر دیتی ہے اور جب تم شدید جذباتی شکستگی کے عالم میں شراب پیتے ہو، سگار پیتے ہو تو یہ بو تمہارے اطراف میں قیامت ڈھانے لگتی ہے کچھ اِس طرح کہ میری جیسی ٹھنڈی عورت بھی تمہاری قربت کے لیے تڑپ اُٹھتی ہے.... تمہیں یاد ہوگا وہ میرا پہلا بوسہ!..... تمہارے کپڑوں میں، تمہارے آفس میں، تمہارے خیمے میں، ہر جگہ اِسی بو کا راج ہے اور میں تمہارے گرد اِسی جسمانی بو کے ساتھ ساتھ طواف کرتی رہتی ہوں، اپنے رال ٹپکاتے، تنے ہوئے جسم کے ساتھ۔'' ایما پر طاری ہونے والا جنون اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا جس کے اترنے کے لیے جان کے بدن کا اُدھڑنا ضروری تھا سُو وہ حسب خواہش اُدھڑتا چلا گیا۔ مگر اُدھڑتے اُدھڑتے جان برنٹن کو جب کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا اُسے یہ ضرور یاد آرہا تھا کہ اُس کی یہی جسمانی بُو مَیری کے لیے ہمیشہ ناخوش گوار اور اُن کے درمیان نفاق کا بنیادی سبب ثابت ہوئی تھی۔ جان خود سے شرمسار ہونے لگا کہ ایما کی تمام حدود سے متجاوز پرستش کے کرشماتی لمحات میں بھی مَیری کا اُس کی ذات کی نفی کرنا، کہاں سے در آیا؟

# ۲۲

بستی آدم واہن میں آج دو ہنگام برپا تھے۔ ایک سرِ عام اور دوسرا چاردیواری کے اندرو اندر۔ جب سے سکندرے کی لاش ملنے کی خبر پھیلی تھی، پوری بستی میں ایک غلغلہ بپا تھا۔ سکندرے کی موت کے افسوس سے زیادہ لوگوں کو اس بات کا خوف تھا کہ اگر اتنے مہینوں تک سکندرا زندہ رہ سکتا ہے تو سیدا کیوں نہیں۔ ہو نہ ہو وہ بھی کہیں آس پاس موجود ہے اور انگریز سرکار کو ڈانون ڈالنے پہنچا سو پہنچا۔ بستی کی شمالی سمت والی سیکورٹی چوکی جو چند دن پہلے اُٹھالی گئی تھی، آج پھر سے قائم ہو چکی تھی۔ گورے حاکموں نے سکندرے کی لاش سے کیا ڈرنا تھا، اُس کا تو قانون ضابطے کے مطابق بندوبست کر دیا گیا مگر اصل خدشات سیدے کے بارے میں تھے کہ جو پھر سے سر اُٹھانے لگے تھے۔ اُدھر سکندرے کے گھر والوں کو صرف لاش شناخت کرنے کی حد تک اجازت ملی تھی، اِس سے زیادہ نہیں۔ وہ تو اُسے ویسے ہی رو دھو بیٹھے تھے مگر اب اُسے اِس حالت میں دیکھنے کا موقع بھی ملا تو جتنے منہ اُتنی باتیں۔ کوئی کہتا کہ پرانی دبی ہوئی لاش کسی طور تیر کر اوپر آگئی تھی۔ کوئی کہتا کہ لاش کسی اور کی ہے جسے خوامخواہ سکندرا بنا دیا گیا ہے۔ کسی کے نزدیک مرے ہوئے سکندرے کی موت کا دوبارہ ناٹک کیا گیا ہے محض سیدے کو پھنسانے کے لیے کہ گاری لگے اور پکڑا جائے۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اُس نے سکندرے بے چارے کی موت کو اِس طرح تماشہ بنایا کہ تمام تر غلغلے کے باوجود اُس کی لاش کا ملنا، اُس کے لواحقین کے نزدیک کوئی تازہ خبر نہ بن سکا۔

چار دیواری کے اندر آیا ہوا طوفان سنگری کے گھر کی کچی دیواروں کے اندر ہی بگولے کی طرح گھومے جا رہا تھا۔ وہ جب سے مولوی صاحب کے گھر سے واپس لوٹی تھی، اُس کی جان پہلے تو ماں ملوکاں اور منگر نے عذاب کیے رکھی کہ اگر نکاح پر نکاح جیسا منہ کالا کرنا ہی ہے تو وہ بوڑھا ٹھیکر مولوی کیوں؟ کوئی اپنا سنگی، مُلیر مسات کیوں نہیں؟ اُس نے چپ سادھی تو پہلے اُن دونوں نے اِدھر اُدھر کے کئی رشتے داروں کے نام گنوائے مگر تان آخر میں منگر پر ٹوٹی۔ منگر کا نام تجویز ہوا تو سنگری نے صاف صاف کہہ دیا کہ شادی کرے گی تو مولوی سے ورنہ زہر کھا لے گی، کوئی کنواں حرام کر گی یا کہیں منہ کر جائے گی۔ منگر نے بھی نفرت اور ہٹ دھرمی کا یہ عالم دیکھا تو طیش میں آ کر اُسے پِتا بیٹھا کہ مرد کی بچی ہے تو اِن تینوں میں سے کوئی ایک کام کر کے دکھا دے۔ سنگری کو رہ رہ کر غصہ اپنی ماں پر آ رہا تھا کہ آج وہ کیوں اور کیسے منگر پر مہربان ہو بیٹھی ہے؟ یہ مُشٹنڈا جو کبھی اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، آج آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا اور وہ بھی اُس کی بیٹی کی خوشی اور خواہشات کی قیمت پر۔

اگرچہ سنگری کے پاس اِس بے جوڑ رشتے کو جوڑنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور نہ ہی اُس کی خواہش اور رضا کوئی ایسی مضبوط دلیل تھے جن کے سبب ملوکاں اور منگر کے انکار کو پسپا کیا جا سکتا لیکن جو صورتِ حال بن چکی تھی اُس میں قوی تر حربہ اگر کوئی سنگری کامیابی سے استعمال کیے جا رہی تھی وہ ہونے والے ''دولہا'' کا انتخاب تھا۔ سنگری کے بازو مروڑنا یا اُسے زندہ در گور کرنا تو کسی کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا، مسئلہ تھا تو مولوی جارُ اللہ، اُسے کون روکے، اُسے کون سنبھالے اور اُس کے منہ میں گھونسلا بنا کر بیٹھی لو ی کبوتری کو باہر کون نکالے؟ یہی وہ دلیل تھی کہ جس کے سامنے ملوکاں کا ہر حربہ ناکام ہو رہا تھا اِس کے باجود کہ اُس نے منگر کا سہارا صرف مولوی کو پچھاڑنے کے لیے لے رکھا تھا۔ اب اُسے کون بتاتا کہ اپنی آفت گری اور سماجی سراسیمگی کے لحاظ سے منگر، مولوی صاحب کے مقابل تو کیا اُسے چھو کر بھی نہیں گزرتا تھا اور یہ بات سنگری اور ملوکاں دونوں اچھی طرح جانتی تھیں۔ مگر پھر بھی سنگری کو باز رکھنے کے سلسلے میں جب اُن دونوں کا کوئی حربہ کام نہ آیا تو ملوکاں کے اشارے پر منگر اپنی ماں سمیت بستی کی دو تین بڑی بوڑھیاں لے کر آ گیا۔

وہ بھی حیران تھیں کی اِس چھوہر کو ہو کیا گیا ہے؟ کیوں اپنی جان کی دشمن ہوئی پھرتی ہے؟ اُن سب کا یہ خیال ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ سیدے سے اُس کا نکاح ہوا تھا، کوئی رشتہ یا کوئی ناواں شاواں نہیں۔ مولوی اگر نکاح کو نہیں مانتا اور نکاح پر نکاح کرنا چاہتا ہے تو خود خدا کو جواب دے گا۔ نئے پنگوڑے کے جھولے اور چٹی چمڑی کے لالچ نے اگر اِس عمر میں آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے تو اگلے جہان خود دوزخ کی آگ میں اُلٹا لٹکا ہوا ہوگا۔ حیرت تو ہمیں اس چھوہر پر ہو رہی ہے، یہ تو چنگی بھلی ہے، سیانی دیانی ہے، اِسے کیا آن پڑی ہے کہ ایک بوڑھے کھوسٹ کے واسطے اپنی جوانی، ایمان اور زندگی، سبھی کچھ برباد کرتی پھرے۔ یہ جانتی نہیں سیدے کو۔ وہ آیا تو دونوں کو کاٹ کر رکھ دے گا، اسے بھی اور مولوی کو بھی۔

اُدھر سکندرے کی لاش ملنے کے بعد بھی سنگری کو تل برابر بھی یقین نہیں تھا کہ سیدا زندہ ہے۔ نکاح پر نکاح کی بات ہی کیا۔ اگر کوئی نکاح ہوا بھی تھا تو مرنے سے پہلے سیدا خود اُسے طلاق دے چکا اور اب تو عدت کی مدت بھی پوری چکی۔ فرض کیا سیدا اگر زندہ بھی ہے تو بستی میں کبھی زندہ نہیں آ سکے گا۔ ویسے ہی آئے گا کہ جیسے سکندرا آیا ہے۔ اِن حالات میں کہ جب مولوی جارُاللہ جیسا تگڑا آدمی اُس کی مُٹھی میں تھا، اُسے کیا پروا کسی کی لہٰذا سنگری نے اپنے تئیں طے کیا وہ چپ رہے گی چاہے حالات جو بھی ہوں۔ لیکن حالات وہ نہ رہے کہ جیسے اُس نے تصور کیے ہوئے تھے۔ کیونکہ دوسرا دن چڑھنے سے پہلے ہی سنگری جب رفع حاجت کے لیے باہر جانے لگی تو محسوس ہوا کہ گھر میں صرف وہ اور اُس کی ماں ہی نہیں بلکہ خاصے مرد لوگ آئے ہوئے ہیں۔ یہ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کہاں ٹھہرے تھے؟ کچھ بھی معلوم نہیں تھا، اگر وہاں کچھ تھا تو بس کسی کے موجود ہونے کا احساس۔

سنگری کو پہلی بار اپنے گھر سے اور گھر والوں سے خوف آنے لگا تھا۔ سورج نکلنے میں اگرچہ کچھ دیر تھی لیکن سپیدہ سحر ہوتے ہوئے بھی جہاں وہ گھر میں نہیں رہ پا رہی تھی وہیں باہر جانے سے بھی گھبرا رہی تھی۔

"کہیں سیدا تو واپس نہیں آ گیا؟"..... سیدے کی واپسی کا سوچنا بھی اُس کی

روح فنا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کی نگرانی کی جا رہی ہو یا وہ اپنے ہی گھر میں قید کر دی گئی ہو۔ اِس جاں لیوا احساس سے جان چھڑانے کے لیے اُس نے گھر کا داخلی دروازہ کھول کر باہر جانا چاہا مگر دو قدم اُٹھاتے ہی اُس پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔ اپنی اِس کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے سنگری کو اپنے آپ سے بھی شرمندگی ہو رہی تھی۔ کیا یہ وہی سنگری ہے کہ جو اَب تک کی زندگی میں اپنی مرضی کرتی آئی ہے؟ کسی مرد کو ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ آنکھ اُٹھا کر بھی اُس کی طرف دیکھ لے۔ ''تو کیا اِس کی وجہ سیدے سے اُس کا رشتہ تھا؟ کیا وہ اُسی کے بَل پر اتراتی تھی؟ اب جب کہ سیدا نہ رہا تو اُسے ایک اور سیدے نما شخص کے سہارے کی ضرورت پیش آ رہی تھی کہ جو سماجی طور پر تگڑا اور زمانے کو آگے لگا کر رکھتا ہو۔ تو کیا زندہ رہنے کے لیے اُسے ہمیشہ ایک سیدے کی ضرورت رہے گی؟ مگر یہ جو سیدے کی واپسی کا احساس ہے، اِس نے اب کے اُسے خوف زدہ کیوں کر رکھا ہے؟ کیا اِس لیے کہ سیدا خود اپنی حیثیت کھو کر محض ایک کینچوے کی طرح چھپتا پھر رہا ہے؟ تو وہ ایک کینچوے سے کیوں ڈرے جسے ہر قدم پر انگریز سپاہ اپنے تعاقب میں دکھائی دیتی ہے؟ تو کیا منگر بھی اُس کے نزدیک ایک کینچوا تھا؟ کینچوا ہی تو تھا جب کہ سنگری کو تو سانپ چاہیے تھا، مُشکی، پھن پھیلائے پھنکارتا ہوا جس کے ایک شُوکے سے لوگوں کے پیشاب نکل جائیں یا کوئی اُڑنے والا سانپ کہ اُڑ کر سیدھا ماتھے پر وار کرے اور اُلٹا دے۔ وہ ایسے ہی سانپوں پر سواری کرنا چاہتی تھی اور جانتی بھی تھی۔ اب سیدے جیسا مُشکی اُس کی کوکھ میں اپنا بیج اُتار گیا ہے تو زمانے سے اُس کی حفاظت کے لیے بھی تو ایک اور سانپ چاہیے۔ لیکن یہ آدم وا ہن بستی؟ لگتا تھا کہ آدم نما ڈھکوسلے ہی رہ گئے اور باقی ساری مخلوق کہیں جھوک لڈا گئی۔ ایسے میں وہ مولوی جیسے اژدہے پر سواری نہ کرے تو کیا کرے۔ پلپلے جثّے کا لحیم شحیم اژدہا۔ اُڑ کر ماتھے پر نہیں کاٹ سکتا، مُشکی کی طرح چمکدار پھن نہیں پھیلا سکتا مگر اِدھر اُدھر سے منہ مارنے والے خرگوش، کرلے اور مینڈک تو زندہ نگل ہی سکتا ہے۔ اُس کے کاٹنے سے کسی کی جان نکلے نہ نکلے مگر دیکھنے والے کا پاخانہ تو نکل سکتا ہے۔

پاخانے کا ذہن میں آتے ہی سنگری کی حاجت بھی پیٹ سے نکل کر سر چڑھ کر بولنے لگی

اور وہ خوف جو کچھ دیر پہلے اُس کے قدموں کا احاطہ کیے ہوئے تھا اُس کے تیز تیز قدموں کی دھول بن گیا جو کچھ فاصلے پر اُ گی جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نہ تو کوئی بیرونی دروازہ کھولنے پر گھر کے باہر ملا اور نہ ہی راستے میں، سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ سنگری کا رہا سہا خوف بھی ختم ہو چکا تو وہ اطمینان سے ایک بڑی جھاڑی کی اوٹ میں سکون سے بیٹھ گئی۔ لیکن یہ سکون لمحاتی ثابت ہوا اور اُسے بیٹھتے ہی ایک دم کھڑا ہونا پڑا۔ یوں لگا کہ اِس حالت میں بھی اُسے دیکھا جا رہا ہے۔ اب خوف سے زیادہ تشویش کی حالت میں اُس نے فوری طور پر قریبی جھاڑیوں کو اِدھر اُدھر کر کے دیکھا مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا مگر پھر بھی دیکھتی آنکھوں کا احساس تھا کہ ختم ہونے کو نہیں رہا تھا حتیٰ کہ حاجت خوف پر غالب آگئی۔

فراغت کے بعد گھر واپس آتے ہوئے سنگری نے دیکھا کہ منگر بھی مخالف سمت کی جھاڑیوں سے نکل کر اُدھر ہی کو آ رہا ہے۔ سنگری نے بظاہر اُس کی آمد سے لاتعلقی اختیار کرتے ہوئے اپنی رفتار بڑھا دی مگر وہ چند لمحوں ہی میں اُس کے سر پر آن پہنچا۔

''سنگری میری بات سنو!''..... سنگری نے سُنی اَن سُنی کر کے نکلنا چاہا تو منگر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سنگری کو یوں لگا کہ بہت سارے لجلجے سے کیچوے اُس کے ہاتھ سے چمٹ گئے ہوں۔ اُس کا جی متلایا تو ابکائیاں سی آنے لگیں۔ سنگری کی یہ کیفیت دیکھ کر منگر نے بھی فوراً ہاتھ چھوڑ دیا۔ کیچوؤں کے چمٹنے کا احساس ختم ہوا تو سنگری لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اُس کی طبیعت ٹھیک ہوتے دیکھ کر منگر اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''خدا کے واسطے ضد بازی میں اپنے آپ کو تباہ نہ کرو..... تم نہیں جانتی کہ تم کرنے کیا جا رہی ہو..... وہ مولوی تمہیں کھا جائے گا..... بند کر کے رکھے گا پنجرے میں اور تڑپنے بھی نہیں دے گا..... دیکھو! میں تمہارا دشمن نہیں..... سینگا ہوں تمہارا... رَل کھیلا ہوا ہوں..... دِل میں رکھوں گا یہاں بی بی زادی بنا کر۔'' سنگری سُنی اِن سُنی کر کے جانے لگی تو وہ ایک بار پھر اُس کے سامنے آ گیا۔

''سنگری! وقت ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے..... ایک بات تمہاری ہم مانتے ہیں ایک

ہماری تم مان لو.... تمہارا نکاح نہ ہونا ہم مانتے ہیں اور میرے ساتھ شادی تم مان لو!'' بات ختم کرتے کرتے بے یقینی اتنی بڑھی کہ منگر کا منہ لٹک کر رہ گیا۔ سنگری نے اُس کی شکل دیکھی تو ترس کھانے کے بجائے اُلٹا طیش میں آ گئی۔

''لڑکیاں منت ترلوں سے آتی ہیں اور نہ شرط شرائط رکھنے سے.... لڑکیوں کو فتح کرنا پڑتا ہے اِس طرح کہ تاج مرد کے سر پر ہو اور تخت پر وہ بیٹھے.... لڑکیاں پُوچھ ہلانے والے کتوں کے پیچھے نہیں جاتیں وہ تو جاتی ہیں اُن کے پیچھے جو گردن میں دانت گاڑیں اور سارے بدن سے روح نکال لیں.... تمہیں تو چَج سے چھوہر کا ہاتھ پکڑنا بھی نہیں آتا کہ اُسے کلائی سے جکڑ کر پکڑا جاتا ہے یا اُس کے ہاتھ کو اپنی پُولی پُولی اُنگلیوں سے کسی کیچوے کی طرح! یہ جو عورت ذات ہے ناں یہ طاقت سے آتی ہے، طاقت سے رہتی ہے اور کمزوری بن کر طاقت پر راج کرتی ہے اِس طرح کہ ہر طاقت ور، مزید طاقت کی خواہش میں دولت سے بھی پہلے عورت کی طرف جھپٹتا ہے اور دولت کو اُسی کے قدموں میں نچھاور کیے رہتا ہے... تم کیا جانو اصیل عورت کا سواد، جاؤ اور جا کر کسی ہیجڑے کے سامنے منت ترلے کرو!''

سنگری کی باتیں سُن کر دانت کچکچاتے منگر نے اُلٹے ہاتھ کا جھاپا اتنے زور سے اُس کے منہ پر دیا کہ وہ ٹیڑھا ہو کر رہ گیا۔ سنگری منگر سے اِس قسم کے ردِعمل کی توقع نہیں کر پا رہی تھی اِس لیے گرتے گرتے بچی کہ منگر نے دایاں ہاتھ ٹھیک اُس جگہ اُس کی کلائی میں ڈالا کہ جہاں کی بات سنگری نے کی تھی اور پھر اُسے تقریباً گھسیٹتا ہوا اُس کے گھر کی طرف لے چلا۔ گھر پہنچا تو ملوکاں دروازے میں کھڑی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی منگر نے خود ہی واویلا مچا دیا کہ صبح صبح باہر جانے کے بہانے کسی کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی اور وہ بہت مشکل سے اُسے پکڑ لایا ہے۔ یہ سُننا تھا کہ ملوکاں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہتھڑ بنائے اور دو تین سنگری کے کندھوں کے درمیان پُشت پر رسید کر دیے۔

سنگری جو ساری حقیقت ماں کو بتانا چاہ رہی تھی، ہتھڑ کھا کر دوہری ہوتی چلی گئی۔ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ ماں نے ماں ہوتے ہوئے بھی نہ تو کچھ اُس سے پوچھا اور نہ ہی بتانے کا موقع

دیا، اُلٹا منگر کے سامنے اُس کا گنڈا کوٹ کے رکھ دیا۔ اب بھلا کچھ بتائے بھی تو کیا بتائے اور بتا بھی دے تو یقین کس نے کرنا ہے؟ ایسے میں اُسے اپنا باپ بھی یاد آیا اور سیدا بھی۔ کاش اُن میں سے کوئی تو ہوتا۔ اُس کا باپ سنگری کے بچپنے میں جب اُس کی ماں کو مارتا تھا تو پہلے اپنے ہونے کا مان دیتا اور پھر مارتا تو اُس کی وجہ بھی ہوتی تھی۔ اِسی طرح سیدے نے بھی پہلے اُسے مان دیا اور پھر جب مارا تو اُس کی وجہ تھی۔ یہ منگر جیسے چوہے کہاں سے آگئے کہ عورت کو مان مریادا دیے بغیر ہی بلاوجہ اُس پر ہاتھ اُٹھانے لگے؟

سنگری نے رونا چاہا مگر اُسے رونا نہیں آتا تھا۔ اُس کا دل چاہا کہ چیخے چلائے مگر اُسے چیخنا چلانا نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے کوشش کی منگر کو گردن سے پکڑ کر نیچے گرائے اور اُس کی پسلیاں چٹخا کر رکھ دے مگر یہ سوچ کر رُک گئی کہ اِس میں اُس کیچوے کا کیا قصور۔ اگر وہ مار کھانے لائق ہے تو پہلی باری اُس کی ماں کی آتی ہے جس نے اپنی بیٹی پر مرضی چلانے کے لیے منگر جیسے ہیجڑوں کو گھر گھسنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ لیکن وہ ماں پر ہاتھ کیسے اُٹھائے؟ ابھی وہ اِسی کشمکش میں تھی کہ کسی نے اُسے پیچھے سے دھکا دے کر کمرے سے باہر رکھی چارپائی پر گرا دیا۔ سنگری نے پلٹ کر دیکھا تو وہ منگر تھا۔ ہاں اور نہ میں پھنسی سنگری کو تو موقع مل گیا کہ وہ جھپٹے اور منگر کا منہ نوچ لے۔ مگر اُس سے پہلے ہی منگر نے اُسے بازو سے پکڑا اور دوبارہ گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لے گیا جہاں رکھے ایک بڑے ماچے پر گرا کر تیزی سے باہر نکلا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ ابھی وہ کنڈی لگا کر پلٹا ہی تھا کہ گھر کے کھلے داخلی دروازے سے بارہ تیرہ لوگ ایک دم اندر داخل ہوئے جن کے آگے آگے مولوی جارُ اللہ اور شالی چوکی کا داروغہ اور ساتھ میں بستی کے کچھ وَڈے اور وَڈکوں کے پیچھے چوکی کے تین سرکاری کارندے بھی تھے۔ اُن کے دیکھتے ہی منگر اور ملوکاں کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ داروغہ نے اندر آتے ہی سنگری کا پوچھا تو ڈرتی، جھجکتی ملوکاں نے داروغہ کی قہر بار آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے آگے بڑھ کر دروزے کی کنڈی کھول دی۔ سنگری باہر نکلی تو اُس کا حال دیکھ کر وہ سب کچھ کھل گیا جو اس سے پہلے چھپا کر رکھا جا رہا تھا۔ منگر کو دو چار تھپڑ پڑے تو گھر کے پچھواڑے میں چھپے ہوئے اُس کے تین ساتھی بھی داروغے کے ہتھے چڑھ گئے۔ مگر اس کے باوجود ملوکاں نے چاہا

کہ واویلا کرے کہ مولوی صاحب لڑکی کو بہکا کر نکاح پر نکاح کرنے جارہا ہے مگر داروغے کی شکل اور ہیبت دیکھ کر حوصلہ نہ پڑا تو ایک کونے میں بیٹھ کر پہلے بسورنے اور پھر رونے پر آ گئی۔

اب اِن حالات میں، اِن لوگوں کو مزید مہلت دینا مولوی صاحب کے لیے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا سو اُس نے وہیں کھڑے کھڑے اعلان کیا کہ وہ بارات لے کر نکاح کے لیے پہنچا ہوا ہے لہٰذا نکاح بھی فی الفور ہوگا اور رُخصتی بھی آج کے ابھی۔ مولوی صاحب کا اشارہ پاتے ہی اُن کے ہمراہ آئے ہوئے باراتیوں نے صحن میں پڑے ہوئے ماچے سیدھے کرنے شروع کر دیے کہ وہاں ترتیب سے بیٹھا جا سکے۔ جب کہ نکاح کی بات سُنتے ہی ایک کونے میں بیٹھی ٹسوے بہاتی ملوکاں آخری حربے کے طور پر اُٹھ کھڑی ہوئی کہ سیدے کے جیتے جی وہ نکاح پر نکاح نہیں ہونے دے گی۔

''اُو مائی! مویا سمجھ سیدے کو..... مر کھپ گیا کب کا وہ..... سیدے کی بات کرے گی تو بات انگریز سرکار تک جائے گی اور اگر بات انگریز سرکار تک گئی تو پھر تو تو گئی کالے پانی، باقی کی عمر چکی پینے □ý □ý □..... داروغہ گرجا تو ملوکاں کو سانس لینا مشکل ہو گیا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی اور منہ کھلا ہوا۔ سہم کر دیوار سے لگ گئی۔ ملوکاں کی یہ حالت دیکھی تو داروغہ تھوڑا سا ڈھیلا پڑا۔

''بس سیدے کا نام نہ لے..... اور تیرا کوئی معاملہ ہے تو بتا..... انصاف ہوگا تیرے ساتھ!'' ..... مگر ملوکاں کوئی جواب دینے کے بجائے وہیں کچی زمین پر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے باراتیوں نے سامنے والی چارپائی پر مولوی صاحب کو بٹھا دیا اور دور کھڑی سنگری کو بلا کر اُس کے ساتھ بیٹھنے کو کہا تاکہ نکاح سب کے سامنے پڑھا جا سکے۔ لیکن مولوی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے سنگری کو پردہ کرنے اور اندر اُسی کمرے میں جانے کو کہا کہ جہاں سے کچھ دیر پہلے اُسے نکالا گیا تھا۔

''اِس طرح سب کے سامنے عورت اور مرد کا نکاح کرنا غیر پسندیدہ کہا گیا ہے۔ نکاح بے شک ایک نشست میں ہوگا لیکن ہوگا علیحدہ علیحدہ پردے میں... داروغہ صاحب اور قبلہ حافظ صاحب! آپ دونوں اندر کمرے میں جائیں گے اور دلہن کی آزاد مرضی سے پوچھ کر لائیں گے کہ

اُسے میرے ساتھ عقد مسنونہ قبول ہے کہ نہیں؟.... یہ بھی پوچھیں گے کہ کہیں کوئی زور زبردستی تو نہیں ہورہی اور کوئی نکاح پر نکاح تو نہیں پڑھایا جارہا۔''

اندر کمرے میں جانے سے پہلے داروغہ نے ملوکاں کو بلایا اور حافظ صاحب کے ساتھ ساتھ اُسے بھی کمرے میں لے گیا جہاں سنگری دوپٹے کا گھونگھٹ نکالے چار پائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی اُس سے مطلوبہ استفسار ہوا اُس نے بلاتوقف صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی زور زبردستی کے بغیر اور اپنی آزاد مرضی سے مولوی صاحب کے ساتھ نکاح قبول کرتی ہے۔ داروغہ اور حافظ صاحب کمرے سے واپس چلے گئے تو سنگری کی چار پائی کے ساتھ کھڑی ملوکاں کی آنکھوں سے آنسو چپ چاپ چھلک پڑے۔ یہ آنسو دُکھ کے تھے، ناکامی کے یا بے بسی کے مگر بہتے ہی چلے جارہے تھے۔ سنگری نے ماں کو یوں چپ چاپ آنسو بہاتے دیکھا تو اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کے گلے لگ کر خود بھی زاروقطار رونے لگی۔ نجانے اُس کے آنسو خوشی کے تھے، کامیابی کے یا زور آوری کے مگر پھر بھی بہے چلے جارہے تھے۔

# ۲۳

جان برنٹن کی آنکھ کہیں رات کے پچھلے پہر کھلی تو اُسے شعور کی حدود میں آنے کے لیے چند لمحے مزید چاہیے تھے۔ لیکن یہ لمحے اتنی سرعت سے گزرے کہ اُس کی آنکھ کھلنے اور پھر ہڑبڑا کر اُٹھنے کا درمیانی عرصہ عمر کے اِس حصے میں بھی خاصا قلیل سا لگا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ اُس کا مزید بستر میں رہنا اُس کے لیے کئی قسم کے مسائل پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اگرچہ اُس کے اپنے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی تو بہت گہری نیند میں غرقاب ایما بھی حدِ نظر تک برہنہ ہی تھی۔ وہ تیزی سے بستر میں سے نکلا اور نیم روشن سے بھی نچلے درجے کی روشنی میں اپنے کپڑے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کپڑے نہیں ملے تو اُس نے ہاتھ میں آئے ایک بیڈشیٹ نما پارچے کو بدن کے گرد لپیٹ لیا۔ برہنگی کا احساس کچھ کم ہوا تو اُس کی جان میں جان آئی۔ مگر جان کے لیے اُس شام اور پھر شب کے واقعات کو اُن کی منطقی ترتیب میں یاد کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُسے اتنا یاد تھا کہ وہ ایک آرمز کُرسی پر لیٹا ہوا تھا مگر جہاں سے جاگا ہے یہ تو باقاعدہ بیڈ تھا اور یہ وہ کمرہ بھی نہیں تھا۔ تو وہ اُس آرمز چیئرز والے کمرے سے اِس بیڈروم میں کیسے آیا؟ کچھ بھی تو یاد نہیں آرہا تھا۔

اُس نے وقت کا اندازہ لگانے کے لیے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اُس کے ایک طاقچے میں لگے ہوئے چھوٹے شیشے سے باہر کا منظر دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں بھی اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اُسے اپنی طبیعت کی تازگی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اچھا بھلا سو چکا

ہے اور رات اگر ہے تو کہیں آخری انگڑائیوں میں ہوگی۔ دفعتاً اُسے احساس ہوا کہ اُس کا مثانہ پھٹنے کے قریب قریب پہنچا چاہتا ہے اور شاید اُس کے نیند سے بیدار ہونے کی فوری وجہ بھی یہی رہی ہوگی۔ پیشاب کی حاجت ایک دم تمام محسوسات اور خدشات پر غالب آچکی تھی۔ اُس نے ایما کو جگانا چاہا مگر پھر خیال آیا کہ شام سے آغاز ہو چکی واردات کا حصہ بننے سے پہلے وہ ایک بار حاجت کے لیے ٹائلٹ میں گیا تھا کہ جو آرمز چیئرز والے کمرے سے ملحقہ برآمدے میں تھا۔ تو کیا اُس کا یوں اکیلا وہاں تک جانا مناسب ہوگا؟ لیکن پیشاب کی شدت ہر نوعیت کے مناسب اور نامناسب سے ماورا ہو چلی تھی۔ وہ بیڈروم کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو خود کو اُسی آرمز چیئرز والے کمرے میں پایا جہاں نہ صرف ایک کیروسین لیمپ بھی جل رہا تھا بلکہ ماحول بھی دیکھا بھالا سا لگ رہا تھا۔ یہاں سے آگے ٹائلٹ تک جانا اُس کے لیے اچھا بھلا سہل ہو گیا تھا۔

جان برٹن ٹائلٹ سے واپس آیا تو ایما بھی ساڑھی کی مانند سفید بیڈشیٹ اپنے بدن سے لپیٹے آرمز چیئرز والے کمرے میں کھڑی اُس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ جان کو دیکھتے ہی ایما کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جب کہ جان کھسیانا سا اُس سے نگاہیں چراتا ہوا واپس اُسی کرسی پر بیٹھ گیا جہاں شام کو بیٹھا رہا تھا۔ ایما جان کی اِس کیفیت کا مزہ لیتے ہوئے آہستہ خرامی سے اُس کے قریب چلی آئی۔ کیروسین لیمپ کی کم ہوتی ہوئی لو میں ایما جان کے قریب آ کر اُس کے چہرے کو فریفتگی کے سے انداز میں دیکھنے لگی۔ جان نے بھی اپنی آنکھیں ایما کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

''ایما! یہ سب کیا ہے..... میں اِس کھیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایک ایسے شخص سے جس سے کمپنی کی ٹاپ مینجمنٹ نالاں ہو اور امکانی طور پر اُسے فائر کرنے جاری ہو، تمہارا یہ التفات کیا معانی رکھتا ہے؟''

''نہ تو اِس وقت آپ سے کمپنی کی ٹاپ مینجمنٹ نالاں ہے اور نہ آپ کو فائر کرنے جا رہی ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں اور نہ بدگماں..... اگر کچھ ایسا تھا بھی تو میری کوششوں سے اب اُس کی شدت میں کمی واقع ہو چکی ہے۔''

''آخر تم ہی کیوں مجھے بچاتی پھرتی ہو ایسے میں کہ جب میرا بیٹا بھی ذہنی طور پر مخالف

کیمپ کے لوگوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے.... اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ میری آج کی اس شب بسری کے بعد کمپنی کے لوگ کیا کیا باتیں نہیں کریں گے۔ میں تو ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ دفتری بُلاوے کے ذریعے مجھے کیا کہا جانے والا تھا اور اُس سب کے بجائے تم نے مجھے اپنا مہمان کیسے بنالیا، کیوں بنا لیا؟'' جان برنٹن پر ایک بار ہیجانی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ گزرتی ہوئی رات کے ابتدائی پہر کا تلذذ اُس کے ذہن سے محو ہو چلا تھا۔ جان کی طلب کو محسوس کرتے ہوئے ایما اُٹھی اور سگار باکس اُس کے سامنے رکھی تپائی پر اس طرح سرکایا کہ اُس کی نگاہ پڑ سکے۔ جان کی نگاہ سگار پر پڑی تو اُس کے چہرے کا تناؤ فوری طور پر کم ہوتا دکھائی دینے لگا۔ اُس نے تشکر آمیز نگاہوں سے ایما کی طرف دیکھا جو اپنے جسم پر لپٹی ہوئی چادر کو پھر سے درست کر رہی تھی۔

''کیا وقت ہوا ہوگا؟''.... جان نے سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

''غالباً رات کے تین....'' ایما نے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر جواب دیا اور کمرے سے باہر جانے لگی۔

''میں بھوک محسوس کر رہا ہوں.....'' جان کا بولنا اُس کی ظاہری کیفیت کا ساتھ نہیں دے رہا تھا جب کہ اُس کی نگاہیں ایما کے بدن پر ٹکی ہوئی تھیں کہ جو چادر میں لپٹ کر نمایاں جگہوں سے نمایاں تر ہو گیا تھا۔

''بھوک تو لگے گی کیونکہ ہم نے رات سے کچھ نہیں کھایا.... میں کچن میں جا رہی ہوں، کچھ لے کر آتی ہوں۔'' ایما کچن میں جانے کے لیے مڑی مگر اِس دوران بھی جان کی نگاہیں اُس کے تعاقب میں تھیں۔ ایما جاتے جاتے رُکی، پیچھے مڑ کر جان کو دیکھا اور ہنستے ہوئے ڈانٹ کر بولی ''ایسے نہ دیکھا کریں مجھے..... میں کچھ نہیں کر پاؤں گی۔''

ایما کے جانے کے بعد بھی جان کی نگاہیں کچھ دیر کے لیے اُسی سمت ٹکی رہیں جس طرف وہ گئی تھی۔ سگار کے طویل کش نے اُسے ذہنی اضمحلال سے تو نکال لیا لیکن ایما کی پُراسراریت اُس کے لیے ابھی تک معمہ تھی۔ گذشتہ کئی مہینوں سے اُسے اتنی ذہنی اذیت کا سامنا رہا تھا جس کے بعد سود و زیاں اب اُس کے لیے کچھ زیادہ اہم نہیں رہے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ تذبذب میں

نہیں رہنا چاہتا تھا بلکہ ''جو بھی ہونا ہے اب ہو جائے'' کے مرحلے تک آن پہنچا تھا۔ نجانے کیوں اُسے آنے والی صبح کسی تبدیلی کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ ایما کا یوں مہربان ہونا بلا سبب نہیں تھا جب کہ اُس کا ملازمت سے فارغ کیا جانا یقیناً بلا سبب ہوگا، اِسی لیے تو ایما کی صورت کوئی سبب پیدا کیا جا رہا تھا۔ ''تو وہ کیا کرے؟ اِس مصیبت سے کیسے نکلے کہ جس میں وہ پھنس چکا تھا؟''

جان نے اُٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ موسم بہار کی رات کے اِس خنک پہر نے اُس کے پھیپھڑوں کو آکسیجن سے بھرا تو ذہن نے اُس کے سامنے سب سے بڑا سوال دھر دیا کہ آخر وہ پریشان کس سبب ہے؟ جوں جوں وہ اِس سوال پر غور کرتا گیا اُس کی پریشانی توں توں معدوم ہوتی چلی گئی۔ اُس کی سب سے بڑی پریشانی تو امپریس پُل کی تعمیر کے پراجیکٹ کا اُس سے چھن جانا تھا۔ اُسے خوف تھا کہ انجینئر گالوے اُس کی جگہ لینے کو بے تاب ہے۔ لیکن اگر یہ پراجیکٹ اُس سے واپس لے کر گالوے کو دے دیا جاتا ہے تو پھر کیا ہو گیا؟ ایسے میں کہ جب اپنی منفرد پیشہ ورانہ حیثیت کے باعث اُسے ایک دن کے لیے بھی بے روزگاری کا خدشہ نہیں تو پھر پریشانی کس بات کی؟ لیکن پریشانی پھر بھی تھی۔ اِس پراجیکٹ اور اِس پُل کے ساتھ اُس کی جذباتی وابستگی تھی جس کی تکمیل ایک پراجیکٹ کی تکمیل سے زیادہ اُس کے خوابوں کی تعبیر کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ یہ ریلوے لائن اور پُل اُس کی زندگی میں مَیری کا متبادل بن کر آئے تھے۔ مَیری اُس کی محبوب بیوی اور اُس کے بیٹے ولیم کی ماں۔ اگرچہ مَیری کو کبھی بھی اُس سے محبت نہیں رہی تھی مگر اُس کی مسلسل بے اعتنائی ہی جان کے دل میں اُس کے لیے محبت کو اور بھی فراواں کرتی رہی تاوقتیکہ وہ سِنڈی ریلوے کمپنی کا چیف انجینئر بن کر اِنڈیا نہ آ گیا۔ یہاں کوٹری سے ملتان تک ریلوے لائن بچھانے کے جنون نے مَیری کی یاد کو اُس کے ذہن ہی سے نہیں بلکہ دل سے بھی کھرچ دیا حتیٰ کہ ولیم کو اپنے سامنے دیکھ کر بھی مَیری کبھی یاد تک نہ آئی اور اگر کبھی آئی بھی تو محبت کی باقیات کی مانند جس میں نہ کوئی خوشبو اور نہ ہی کوئی رنگ۔

اچانک ایک خیال جان برنٹن کے ذہن کی کسی نچلی تہہ میں سرسرایا۔ ''کیا ایما اُس کی زندگی میں امپریس برج کی محبت کی متبادل کے طور پر تو داخل نہیں ہو رہی؟''۔ اُس نے ماضی میں

جھانک کر دیکھا تو لگا کہ مُیری سے محبت کا متبادل سنڈی ریلوے کمپنی کا پراجیکٹ بن کر آیا تھا۔ اِس پراجیکٹ کو اُس نے عشق کے طور پر لیا مگر جب سنڈی ریلوے کا پراجیکٹ مکمل ہوا تو محسوس ہوا کہ اُس کی پیشہ ورانہ دنیا اندھیر ہونے والی ہے مگر اِسی اثنا میں ایک اور کھڑکی کھلی اور اُسے اِنڈس ویلی ریلوے کے پراجیکٹ کا چیف انجینئر بنا دیا گیا۔ اب کوٹری سے ملتان ریلوے ٹریک کا بچھایا جانا اور دریائے ستلج پر امپیریل پُل کی تعمیر اُس کی زندگی کا متبادل عشق ٹھہرے۔ مگر ہر بار جوں ہی اُس کی زندگی میں نئے قدموں کی چاپ سنائی دی اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کا اپنے ''موجود'' سے ناتا ٹوٹنے والا ہے۔ تو کیا ایما کا زندگی میں یوں دھڑلے سے گھس بیٹھنا، ادھورے امپیریل برِج سے اُس کے چل چلاؤ کا کوئی بِگل ہے جو بج اُٹھا ہے؟

اتنے میں ایما کھانے کے لوازمات کا ٹرے ہاتھوں میں اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ بدن سے لپٹی چادر اُتار کر اُس نے مختصر سا لباس پہن لیا تھا۔ ''کچھ ہلکا پھلکا بنا لائی ہوں''۔ جان نے کھانے کے ٹرے کے بجائے اُس کے کپڑوں کی طرف تنقیدی نگاہوں سے اِس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ''بنا لائی ہو یا پہن آئی ہو؟'' ایما اُس کی نگاہوں کا مطلب جان گئی تبھی تو ٹرے کو تپائی پر رکھتے ہوئے مسکرا دی۔ ''ضروری تھا..... کیونکہ مجھے دیکھتے ہوئے آپ کی نگاہیں بہت حریص ہو جاتی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے جان کے پاس آئی اور اُس کے کندھے سے سر ٹکا کر باہر کی طرف دیکھنے لگی جہاں آخری راتوں کے چاند کی چاندنی پھیلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ خنک ہوا ایما کے چہرے سے ٹکرائی تو کیروسین لیمپ کی روشنی میں بھی اُس کا چہرہ ملائمت، چھلکانے لگا۔ جان کی گردن کے نچلے حصے سے ایما کی ناک مس ہوئی تو اُس کے بدن کی مخصوص بو؟ نے اُسے پھر سے بہکانا شروع کر دیا۔ وہ کسمسائی اور اپنا ایک بازو جان کندھے کے اوپر رکھ کر اُس سے چمٹنے لگی۔ کچھ دیر تو وہ یوں ہی رہی مگر بجھا ہوا سگار ہونٹوں میں دبائے جان کی طرف سے کسی قسم کی تحریک نہ پا کر ایک طرف ہو گئی اور اپنا چہرہ کھلی کھڑکی کی طرف کرتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ جان نے ایما کی اِس کیفیت کو سمجھتے ہوئے مناسب جانا کہ اُس کی پشت کو بوسہ دے کر اپنے احترام کا اظہار کرے۔

کچھ توقف کے بعد جان نے کھلی کھڑکی کو بند کیا اور واپس آ کر کرسی پر نیم دراز ہونے سے پہلے اپنے بجھے ہوئے سگار کو سلگانے لگا۔ ایما بھی تپائی پر رکھی ٹرے کی طرف آئی اور جان کے لیے پلیٹ میں کباب نکالنے لگی۔ جان کو ایک بار پھر اپنے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے ایما نے محسوس کر لیا کہ وہ ابھی تک انہی مخصوص کے بیچ معلق ہے کہ جہاں وہ اُسے چھوڑ کر کچن کی طرف گئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ واہموں کے گرداب میں چکراتے ہوئے جان کو اُس پر اعتماد کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اُسے لگا کہ وقت آ گیا ہے کہ وہ جان کو اعتماد میں لے۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھی اور جان کی کرسی کے بازو پر بیٹھ کر اپنا بایاں بازو اُس کے گلے میں ڈال کر آنکھیں اُس کی آنکھوں پر مرکوز کر لیں۔

''آپ کے خدشات درست تھے کہ انجینئر ولیم سینٹ جان گالوے آپ کو فائر کرانے کے بعد امپیریل برج کا پراجیکٹ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔ اُس نے کمپنی کی مینجمنٹ کے سامنے ثابت کر دیا ہے کہ میٹر گیج (metre gauge) جیسے فرسودہ ریلوے ٹریک کے مقابلے میں براڈ گیج (broad gauge) ریلوے ٹریک کو بچھا کر بھی کم خرچ میں بہتر پُل بنایا جا سکتا ہے۔ براڈ گیج میں ریلوے ٹریک کی چوڑائی ساڑھے پانچ فُٹ ہو گی اور وہ کم و بیش ایک صدی تک انڈیا میں ریلوے کی ضروریات پوری کرتا رہے گا۔''

''گالوے جھوٹ بولتا ہے''..... جان برنٹن ایک دم کھولتا ہوا کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ براڈ گیج ریلوے ٹریک کی ابھی کم از کم ایک صدی تک انڈیا کو ضرورت نہیں ہے اور کس نے کہہ دیا کہ اُس پر خرچہ میٹر ٹریک سے کم آتا ہے.... دگنا آتا ہے دُگنا۔ وہ مینجمنٹ کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تاریخ کے صفحات میں میرا یعنی جان برنٹن کا نام کھرچ کر اپنا نام لکھوا دے ''ولیم سینٹ جان گالوے''۔ لیکن میں بتاؤں گا مینجمنٹ کو کہ وہ کمپنی سے دھوکا کر رہا ہے، یقیناً وہ بعد میں اضافی تخمینہ دے کر کمپنی کو دیوالیہ کرا دے گا۔''

ایما نے وہیں بیٹھے بیٹھے جان کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ سے دبا کر چہرے پر ایسی مسکراہٹ لائی جیسے کہہ رہی ہو کہ حوصلہ کرو اور حوصلہ رکھو۔ ''گالوے کا پلان واقعی کم خرچ ہے جان!'' ایما جان

برنٹن کو مخاطب کرنے میں پہلی بار آپ سے تم پر آ گئی تھی۔ جان نے غصے میں آ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو ایما نے دونوں ہاتھ کھڑے کر کے اُسے چپ رہنے کی درخواست کی۔ ''پُل بنانے کے لیے اُس نے اُجرتی مزدوروں کی جگہ مقامی لوگوں کو مختلف جرائم میں ملوث کرنے کا الزام لگا کر اُن سے جبری مشقت لینے کی تجویز دی ہے۔''

''لیکن یہ تو صریحاً ظلم ہے''..... جان برنٹن ایک بار پھر کھول اُٹھا۔

''امپیریلزم کی کوئی اخلاقیات نہیں ہوتی مسٹر جان!''...... ایما اُٹھی اور جان برنٹن کے سامنے آ کر اپنے دونوں بازو اُس کے کندھوں پر رکھ دیے اور سر اُٹھا کر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ ''سُنو جان برنٹن! مہان انجینئر ولیم سینٹ جان گالوے کی یہ مہم جوئی سر دست میں نے اُلٹا دی ہے۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ ایک جونیئر آفیسر نے اتنا بڑا کام کیسے کر لیا؟ بس اتنا سمجھ لو کہ یہ کام مجھ سے تمہارے بدن کی خوشبو نے کرا لیا ہے۔ انڈس ویلی ریلوے تمہیں ایک موقع دینے جا رہی ہے کہ تم کس طرح اپنی پیشہ ورانہ اہلیت کمپنی کے حق میں استعمال کرتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں ''کمپنی کے حق میں'' کا مطلب معلوم ہوگا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس پراجیکٹ پر تمہیں اپنا نام چاہیے یا گالوے کا۔''

''اگر یہ سب طے ہو چکا تھا تو مجھے کیوں بلایا گیا۔''

''اس لیے بلایا گیا کہ تمہیں تمہارے بارے میں کوئی اپنا بتائے''

جان برنٹن نے حیران ہو کر ایما کی جانب اِس طرح دیکھا کہ جیسے کچھ سمجھ نہیں پا رہا جب کہ ایما کا چہرہ اپنے آپ ہی دہکنے لگا تھا۔ جان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اُس کی آنکھوں کا سرمئی رنگ اور بھی گہرا ہو چلا تھا۔

''مجھے یہ مشکل کام اِس لیے سونپا گیا کہ انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کی پوری مینجمنٹ جان چکی ہے کہ میں اور تم بہت جلد شادی کرنے والے ہیں...... کل یعنی جو آج ہو چکی.... اتوار صبح گیارہ بجے بہاول پور کے چرچ میں۔''

# ۲۴

سنگری کی مولوی صاحب سے شادی کو چھ مہینے گزرے تو اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ باقی چھ ماہے بچوں سے یکسر منفرد وضع کا، تگڑا اور تنومند۔ مولوی صاحب کی مردانگی کے ہر سُو چرچے کہ پہلے ہی ہلّے میں بیچاری ملوک چھوہر کو گھسن کر بٹھایا اور بیج اتنا خالص کہ پیٹ میں چھ ماہ سے زیادہ اُٹھا رکھنا اُس کے لیے ممکن ہی نہ رہا۔ بچے کی پیدائش کے بعد مولوی صاحب نے اُس کا نام عطاء اُللہ رکھنا چاہا مگر یہاں بھی سنگری کی ضد آڑے آ گئی اور نام رکھا گیا امانت۔

کئی دنوں تک مولوی صاحب کے ہاں مٹھایاں بھی چلتی رہیں اور دم کروانے والی بے اولاد عورتوں کا تانتا الگ سے بندھا رہا۔ مولوی صاحب کے کئی ہم عمر یار دوست بھی باتوں باتوں میں اُس سے اِس کارکردگی کا راز معلوم کرنے کی کوشش کرتے تو وہ مسکرا دیتا اور اُنہیں اپنی خوراک کی اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ اوپر والے سے لو لگانے کا مشورہ دیتا۔ اُس کے ملنے ملانے والے احباب اور اہل علاقہ تو اُس کی خوشی میں برابر کے شریک تھے مگر نجانے کیوں زنان خانے میں جاتے ہی اُس کی پہلی تینوں بیویاں اُس کے سامنے آتے ہی آپس میں سر جوڑ کر عجیب انداز میں مُچکنا شروع کر دیتیں۔ مولوی صاحب کو اُن کی چمکتی آنکھوں اور طنزیہ ہنسی کا سامنا کرنا مشکل ہو جاتا تو وہ زنان خانے سے باہر نکل آتا۔ اُس کی واحد پناہ گاہ اُس کا حجرہ تھا کہ جہاں بستی کے لوگ اپنی اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈنے اُس کے پاس چلے آتے۔ سنگری کے لیے الگ سے بنوایا گیا

چھوٹا زنان خانہ بھی مولوی صاحب کے لیے چھوٹا پڑ گیا تھا اِس لیے کہ وہاں سنگری اپنے اور اپنے بچے کے علاوہ کسی اور کو برداشت کرنے کی روادار نہیں رہی تھی۔ مولوی صاحب کو بھی اُس نے نکاح کے بعد اپنے آپ سے اتنا ہی دور رکھا کہ جتنا ممکن تھا۔ وہ اُس کے حصے میں اُتنی ہی آتی کہ جتنی صدقے خیرات کی روٹی اور پھر بس۔ مولوی صاحب جب کبھی اپنی طے کردی گئی حیثیت سے زائد کا متقاضی ہو بھی جاتا تو اُسے واپس اپنی حدود میں لانا سنگری کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اُسے بھی سنگری کے ہاتھوں دن میں کئی بار بے عزت ہونے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ نکاح کے بعد سنگری اُس کے حجرے میں عارضی طور پر قیام پذیر ہوئی تو اُس کی بڑی زوجہ نے دیکھتے ہی فتویٰ دے دیا تھا کہ یہ لڑکی حاملہ ہے مگر اِس بہتان کو نہ تو مولوی صاحب خود سننے کو تیار تھا اور نہ ہی سوکن کی اِس شرانگیزی کو آگے پھیلانے کا روادار۔ لہٰذا اِس بات کا گلا بڑے زنان خانے ہی میں گھونٹ دیا گیا۔

اپنی عارضی قیام گاہ میں تو پھر بھی سنگری کا رویہ کچھ زیادہ بے رحمانہ نہیں تھا لیکن اُس کا مطالبہ علیحدہ گھر کا تھا۔ اُس نے مولوی صاحب کو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر وہ اُسے علیحدہ گھر نہیں دے سکتا تو وہ خالی پڑے ہوئے سیدے کے گھر یا اپنی ماں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دے گی۔ لیکن مولوی صاحب نے دونوں باتوں کو مسترد کرتے ہوئے بڑے زنان خانے کے ایک طرف دیوار ڈال کر چھوٹا زنان خانہ بنا دیا۔ جوں ہی سنگری چھوٹے زنان خانے میں منتقل ہوئی اُس نے آئے روز کے جھگڑوں اور بدزبانی کو اِس طرح اپنا وطیرہ بنایا کہ مولوی صاحب کو اندر گھسنے سے بھی خوف آنے لگا۔ لیکن عورت اگر اپنی آئی پر آ جائے تو اُسے کون سمجھائے۔ کہیں آنے میں کبھی تھوڑی سی دیر بھی ہو جاتی تو اندر سے بُلاوا آ جاتا لیکن مولوی صاحب کا پہلا قدم اندر پڑتے ہی پھر وہی چیخ دپکار، تذلیل اور رسوائی۔

مولوی صاحب نے کئی بار ارادہ کیا کہ اِس چوتھی مصیبت سے جان چھڑا لے مگر دل پسیج جاتا کہ زبان کی جیسی بھی تھی لیکن اُسے دیکھتے ہی آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی تھی۔ جب کبھی چند لمحوں کے لیے بھی میٹھا بول لیتی تو سارے گلے شکوے دور ہو جاتے۔ شاذ و نادر ایسا بھی ہو جاتا کہ

وہ مولوی صاحب کو پہلو میں بیٹھنے اور اُسے جی بھر کر دیکھنے کا موقع دے دیتی۔ بس پھر کیا اس روز سعید مولوی صاحب کا تمام تر جلال، جمال میں بدل جاتا۔ سنگری کی زبان سے تذلیل برداشت کرنے کے کئی اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اُس جیسی خوب صورت لڑکی کے خود چڑھتی کر کے شادی کرنے سے مولوی صاحب کی علاقے میں مفت کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ دیگر مفادات میں وہ دو گھر بھی تھے کہ جو آخر کار مولوی صاحب کے تصرف میں آنے والے تھے۔ ایک وہ جو سیدا چھوڑ گیا اور دوسرا وہ کہ جہاں ملوکاں رہ رہی تھی۔ تو ایسے میں سنگری کو طلاق دے کر گھاٹے کا سودا کم از کم مولوی جارُ اللہ تو نہیں کر سکتا تھا۔

سنگری کے ہاں امانت پیدا ہوا تو ملوکاں بیٹی اور نواسے کو دیکھنے چلی آئی۔ مولوی صاحب نے پوری کوشش کی کہ وہ سنگری سے مل نہ پائے مگر جوں ہی سنگری کو ماں کے آنے کا علم ہوا وہ خود ہی بیرونی حجرے میں چلی آئی اور ماں کو چھوٹے زنان خانے میں اِس طرح داری سے لے گئی کہ مولوی کی ایک بھی نہ چلی۔ ملوکاں نے سنگری کو یوں تنتناتے دیکھا تو دل کو تسلی ہوئی کہ بیٹی نے یوں ہی جھک نہیں ماری۔ تین عورتوں کے بعد کسی کی گھر والی بننا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر لگتا تھا کہ سنگری نے مولوی کو اپنے چلتروں سے باندھ رکھا ہے۔ ملوکاں کوٹھے میں جا کر بیٹھی تو سنگری نے امانت کو اُس کی گود میں ڈال دیا۔ تھن گُتھنے اور چوڑے ہاتھ پاؤں والے بچے کو گود میں کُلکاریاں کرتے دیکھا تو ملوکاں کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ کہیں سے بھی چھ ماہا نہیں لگ رہا تھا۔ ملوکاں نے سوالیہ نگاہوں سے سنگری کی طرف دیکھا تو اُس نے سر جھکا لیا شاید اس لیے کہ اُس کے پاس دینے کو کوئی جواب نہیں تھا۔ ملوکاں نے بیٹی کا سر جھکا ہوا دیکھا تو چُپ سادھ لی۔ اب مزید پوچھ گچھ کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا لیکن اِس کے باوجود وہ بچے کے چہرے کو بار بار یوں غور سے دیکھے جا رہی تھی کہ جیسے اُس کے نقوش میں اُس کے باپ کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جب کچھ نہ سمجھ پائی تو جی چاہا کہ اُسے اُٹھا کر ایک طرف پھینک دے مگر سنگری کے چہرے پر پھیلی ہوئی ممتا کو محسوس کرتے ہی اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اِدھر اُدھر پھینکنے کی بجائے اُس نے امانت کو اُٹھا کر اُس کا ماتھا چوما اور پھر سینے سے لگا لیا۔ سنگری کو یوں لگا کہ جیسے اُس کا پہلا قدم منزل پر پہنچ

چکا ہو۔ ملوکاں نے اُس کے بچے کو قبول کر لیا تھا۔ ایک لمبی سانس لیتے ہوئے اُس کے چہرے پر سکون سا چھلکا اور اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے آنکھیں موند لیں۔

سنگری کے چہرے کے تاثرات نے اب تک کی تمام گرہیں اپنی ماں پر کھول دی تھیں۔ ملوکاں کو اب احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے مولوی صاحب سے شادی کیوں کی اور کس واسطے کی۔ اگر چہ ملوکاں کے لیے یہ اب تک راز ہی تھا کہ سنگری حاملہ کیسے ہوئی مگر اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ عورت ذات کو اِس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ حاملہ کیسے اور کس سے ہوئی؟ بس ایک بار نطفہ ٹھہر جائے تو وہ اُس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرتی ہے۔ عورت کی زندگی میں یہی وہ مقام ہوتا ہے کہ جہاں وہ کائنات میں متعین اپنے حقیقی کردار یعنی نسلِ انسانی کی بڑھوتری سے جڑ رہی ہوتی ہے۔ سنگری اپنی خواہش سے حاملہ ہوئی یا حادثاتی طور پر، دونوں صورتوں میں اُسے اپنے پیٹ میں موجود بچے کی نگہبانی کرنا تھی تاوقتیکہ وہ پیدا نہ ہو جاتا۔ ملوکاں نے چھ ماہ پہلے کے حالات کے بارے غیر جانب دار ہو کر سوچا تو اُسے یقین ہو گیا کہ سنگری کا مولوی صاحب سے شادی کا فیصلہ قطعی درست تھا کیونکہ اُس کے حمل کی بحفاظت وضعگی کے لیے مولوی صاحب سے بہتر چوکیدار کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ اِس کے علاوہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ بستی کے لوگ یا رشتے دار سنگری پر حرام کاری کا الزام لگاتے تو پھر بھی سزا جزا کے لیے مولوی صاحب نے ہی پیش پیش ہونا تھا لیکن اِس نکاح کے بعد نہ تو مولوی صاحب نے آواز نکالی اور نہ ہی کسی اور کو جرات ہوئی۔ ملوکاں کو اپنی بیٹی کی معاملہ فہمی پر حیرت ہو رہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو اماں....!'' سنگری نے ماں کو مسلسل سوچ میں ڈوبے دیکھا تو پوچھ ہی بیٹھی۔

''کچھ نہیں..... میں تو دیکھ رہی تھی کہ کس کی شکل ہے امانت!''

''تجھے کس کی شکل لگا؟''..... سنگری نے سر جھکائے چارپائی کے بان کو کریدتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ ملوکاں بھی کب پکڑائی دینے والی تھی، بچے کا ناک نقشہ پھر ذرا غور سے دیکھتے ہوئے بولی'' منہ متھا تو زیادہ تیرا ہے پر کہیں کہیں سے مولوی صاحب کی بھاند بھی دیتا ہے،

بچہ آخر کو ماں باپ پر نہیں جائے گا تو کیا کسی ہمسائے پر جائے گا؟'' ..... نیا ٹلا جواب دے کر ملوکاں نے بیٹی کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ وہاں کیا اور کون سا رنگ آتا ہے مگر اُس نے بھی دوپٹہ درست کرنے کے بہانے چہرہ اِدھر اُدھر کرلیا۔

''اماں! منگر کیسا ہے؟..... بظاہر لگا کہ یہ سوال سنگری نے بات بدلنے کے لیے کیا ہے لیکن اِس کے پیچھے چھپا تجسس چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔ کم از کم ملوکاں کو تو یہی محسوس ہوا۔ اِسی لیے سوال سنتے ہی ملوکاں کے ماتھے پر بَل پڑ گئے۔ ''تجھے اُس سے مطلب؟''

''مطلب ہے نا.... میری وجہ سے داروغہ اُسے پکڑ کر لے گیا تھا۔'' سنگری دوپٹے کے پلو کو اپنے داہنے ہاتھ کی بڑی اُنگلی کے گرد مسلسل بَل دیے جارہی تھی۔

''تجھے بڑا خیال ہے نا اُس کا ÿ ÿ ..ملوکاں کے ماتھے کی سلوٹیں اور بھی ٹیڑھی ہو گئیں۔

''دو مہینے کے بعد چھوڑا ہے داروغے نے... اب بھی آئے روز پریشان کیے رہتا ہے۔''

''میں کھانے کے لیے لاتی ہوں تمہارے لیے'' ..... سنگری ماں کی بات کا جواب دیے بغیر ہی وہاں سے اُٹھ گئی۔ ملوکاں نے بھی امانت کو چارپائی پر سلایا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں نے کچھ نہیں کھانا تمہارے مولوی کے گھر سے، جارہی ہوں میں!''

# ٢٥

بستی آدم واہن کے قبرستان سے ریلوے ٹریک گزرنے کا سانحہ گزرے سال گزرا تو پیر زندہ کرامت کا میلہ پھر سے آن پہنچا۔ تین روز کا یہ میلہ صرف آس پاس کے لوگوں کا اجتماع ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ بستی میں موجود طاقت کے مختلف مراکز کا توازن بھی تبدیل کر دیا کرتا تھا۔ سال بھر ہمہ قسم کے معاملات کا قضیہ مولوی جاراللہ کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ وہی داروغہ سے ملاقات رکھتا، سزا جزا کے مسائل دیکھتا، دیوانی مقدمات کے فیصلے چکاتا، ضرورت پڑنے پر ملتان کے کمشنر کے ہاں بھی حاضری ہوتی اور اگر کوئی کارِ سرکار میں معاونت کسی حساس نوعیت کی ہوتی تو کمشنری کے گرمائی صدر مقام ڈیرہ جات میں واقع تمن لغاری بھی لے جایا جاتا۔ یہاں مولوی صاحب کی حیثیت سرکاری مہمان کی سی ہوتی، خاطر مدارت اور واپسی پر حسبِ درجہ قدر و منزلت۔ لیکن پیر زندہ کرامت کے میلے کے اِن تین ایام میں وہ اپنے حجرے سے باہر بھی نہ آتا، بس حجرے سے زیادہ سے زیادہ کسی زنان خانے تک یا جماعت کے وقت مسجد کے مصلے پر۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایک عجیب سا معاہدہ تھا دونوں مسالک کے پیروکاروں میں کہ جس کا وجود محسوس تو کیا جا سکتا تھا دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

پیر زندہ کرامت کے پیروکار گذشتہ برس میلے میں جوق در جوق شامل ہونے والے اُن مضافاتی لوگوں کی شناخت کے بارے میں ابھی تک پریشان تھے کہ جو آئے تو میلے میں شرکت کے

واسطے تھے لیکن جاتے ہوئے اُن کا میل جول اور اُٹھنا بیٹھنا مولوی جارُاللہ کے حجرے میں رہا۔ خلاف توقع اِس سال اُن جیسی وضع قطع کے لوگوں میں سے کوئی بھی میلے میں شریک نہیں تھا۔ اُن پُراسرار لوگوں کی کمی تو شاید بہت کم لوگوں نے محسوس کی ہو لیکن سیدے اور اُس کے ساتھیوں کی کمی نے لوگوں کو رُلا دیا جو میلے والوں کی خدمت اور حفاظت کا بے لوث فریضہ سرانجام دیا کرتے تھے۔ یہی وہ دن تھے کہ جب گوروں کی فوج نے بستی پر شب خون مارا اور یہاں کے صدیوں پرانے قبرستان کو اُجاڑنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے جی دار جوان سیدے کو بھی اُٹھا لے گئے۔ سیدے کے ساتھیوں کی لاشیں تو کبھی کبھار ایک ایک کر کے ملتی رہیں لیکن سال گزر گیا، سیدے کا کہیں پتا نہ چلا۔ منہ منہ کی باتیں الگ۔ کسی کے نزدیک مرکھپ گیا تو کسی کے نزدیک گوروں نے اُسے کالے پانی بھجوا دیا۔ کسی کے تئیں خود ہی کہیں روپوش تھا اور کسی کے مطابق پیر زندہ کرامت اپنے اِس خدمت گار کو اپنے ساتھ ہی اُڑا کر لے گئے لیکن حقیقت یہی تھی کہ اِس بار پیر صاحب کا میلہ تو تھا مگر سیدا نہیں تھا۔

ایسے میں منگرا اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ میلے کے معاملات میں آن دخیل ہوا۔ آنے جانے کے راستوں کی نگرانی، جہاں جہاں کچھ لوگ کھیل تماشے میں مصروف ہوتے وہاں اُس کا کوئی نہ کوئی سنگی ضرور موجود ہونے لگا۔ بستی کے کچھ لوگوں کو یہ دیکھ کر ضرور حیرت ہو رہی تھی کہ پچھلے سال تک سیدے کی جن باتوں کا وہ ناقد ہوا کرتا تھا، آج وہی ساری باتیں منگر خود کیے جا رہا تھا۔ خود منگر کو بھی احساس تھا کہ وہ کیوں ہر اُس جگہ پہنچنا چاہتا ہے کہ جو سیدے کی گم شدگی کے سبب خالی ہوئی ہو۔ وہ جو کل تک سیدے کی طرزِ زندگی اور اُس کے نظریات کی کھلی مخالفت کیا کرتا تھا کیوں وہی طرزِ زندگی اور وہی کردار اپنانا چاہتا ہے اور اپنائے جا رہا ہے جو کسی نہ کسی طور سیدے کا رہا ہے۔ کیا اِن تمام راستوں سے گزر کر وہ سنگری تک پہنچنا چاہتا ہے جو خود سیدے کی باقیات تو کیا اُس کی متروکات میں شامل ہو چکی تھی۔ تو کیا اپنی باقی زندگی وہ سیدے کے ترک کیے ہوئے راستوں کی خاک محض اِس لیے چھانتا رہے گا کہ اِن میں سے کوئی راستہ سنگری تک بھی جاتا ہوگا؟ لیکن نجانے وہ یہ بات کیوں بھلا بیٹھا تھا کہ سنگری کا تو سیدے سے کبھی اَنگ ہی نہیں لگا تھا اور نہ

ہی اُس نے کبھی سیدے کو اپنی زندگی میں شامل سمجھا تھا تو پھر ایسے میں سیدے کی راہ پر چل کر سنگری کو اپنی منزل سمجھنا پاگل پن نہیں تو اور کیا تھا؟

یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تمام عمر سیدے کے نظریات کی بلند آہنگی نے منگر کو نفسیاتی طور پر اتنا دبا رکھا ہو کہ اُس کے بستی کے منظر نامے سے ایک دم ہٹنے کے بعد آس پاس کی ہوا کے دباؤ کی طرح وہ اُس خلا کو پُر کرنا چاہتا ہو جو جاتے جاتے سیدا خالی کر گیا تھا۔ اگر یہ سب کچھ محض اتنا ہی تھا تو نو مہینے گزرنے اور مولوی جارُ اللہ کے بیٹے کی ماں بننے کے بعد بھی سنگری اُس کے دل سے کیوں نہ نکل سکی جس کا خیال بھی سیدے کی زندگی میں اُسے چھو کر نہیں گزرا تھا۔ تو کیا وہ ایسے گدھ کی مانند ہو چکا ہے کہ جو صرف گلے سڑے اور متعفن ہو چکے گوشت کی طرف لپکتا ہے، تازہ کی طرف نہیں۔ منگر کو لگا کہ وہ مردِ میداں کبھی نہیں رہا اور نہ ہی کبھی رہ پائے گا۔ وہ تو چھوڑے ہوئے میدانوں کی مخلوق ہے، خالی مکانوں کا چمگادڑ ہے اور پامال راستوں کی دھول ہے تو اِس حیثیت میں سنگری تک پہنچ پانے کا راستہ کس طرح بنا پاتا کہ جو بہر صورت حیرت زدہ کرنا اور کرتے رہنا ہی جانتی ہے۔ بہر حال منگر کو یقین ہو چلا تھا کہ اُس کا گھوم پھر کر سیدے کے راستوں پر آنا ''سیدا'' بننا نہیں تھا بلکہ سنگری تک پہنچنے کا بہانہ تھا اِس کے باوجود کہ وہ اُسے قدم قدم پر بُری طرح مسترد کرتی چلی آ رہی تھی۔ جہاں تک خلقِ خدا کا تعلق تھا وہ بھی اُسے سیدے والی حیثیتوں میں قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ ''سیدے'' کی جگہ لینے کے لیے بھی نہ صرف ظاہری بلکہ باطنی طور پر ''سیدا'' ہونا ضروری تھا۔ اب بھلا منگر کو سیدے کا متبادل تسلیم کر لیا جانا اُن لوگوں کے لیے عقلی طور پر ممکن نہیں تھا کہ جنہوں نے سیدے کو دیکھ رکھا تھا۔ منگر شاید بُھلا بیٹھا تھا کہ لوگ کسی بھی انسان کو اُس کے پہلے تعارف ہی سے یاد رکھتے ہیں، اُس کے بعد سانپ ہمیشہ سانپ ہی دکھتا ہے اور کیچوا ہمیشہ کیچوا۔ سانپ کیچوا بننے کی کوشش کرے گا تو مارا جائے گا اور اگر کیچوا سانپ بن بھی جائے تو اُس کا اعتبار کوئی بھی نہیں کرتا۔ منگر نے اگرچہ میلے کا انتظام سنبھال رکھا تھا مگر خلقت کے نزدیک یہ وہی منگر تھا کہ جس کا نہ کوئی کھڑ کا اور نہ ہی دڑ کا۔

پیر زندہ کرامت کے میلے کے پہلے ہی روز ہی ایسا واقعہ ہو گیا جس نے پوری بستی کا

چین سکون برباد کردیا۔ میلے پر آئے عقیدت مندوں کی خوشی تو غم میں بدلنا ہی تھی لیکن چہار جانب غم اور غصہ الگ۔ صورتِ حال اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ کسی بھی لمحے آگ کے الاؤ میں بدل سکتی تھی۔ ہوا یوں کہ اجودھن سے آنے والے چالیس سبز پٹکے والے درویشوں کا گروہ ہر سال کی طرح حسبِ معمول بستی کے قبرستان میں دھونی دُکھانے پہنچا تو سات شہیدوں کی قبریں وہاں نہ پاکر بہت پریشان ہوا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اُن قبروں کا کیا ہوا۔ درویش روتے پیٹتے نئے شمالی قبرستان پہنچے مگر اُس جگہ تو صرف اُن باقیات کے مدفن تھے کہ جنہیں اُن کے ورثان نے وہاں لاکر دفنایا تھا۔ وہاں کوئی قبر بھی ایسی نہ تھی کہ جسے لاوارثا یا گم نام کہا جا سکتا۔ خود بستی والوں کو بھی علم نہیں تھا کہ اُن قبروں کا کیا ہوا جن پر ہر سال یہ چالیس درویش دھونی دُکھانے اور سیس نوانے آن بیٹھتے تھے۔ درویشوں کی آہ و فغاں تا بہ فلک ہوئی تو بستی کے بڑے بوڑھے بھی پرانے قبرستان کے آثاروں میں درویشوں کے ساتھ جُو بیٹھے۔ اِن میں سب سے بوڑھے تو اب نَبلو سانسی اور مُتھل ماچھی ہی رہ گئے تھے باقی تو مر مرا گئے۔ اِن دونوں نے سات شہیدوں کی قبروں کی تصدیق تو کی مگر افسوس کے مارے منہ سر پیٹ لیا کہ جب قبروں سے لاشیں نکالنے کا کام شروع ہوا تو انہوں نے نگرانی کیوں نہ کی اور یہ سارا کام نوجوانوں پر کیوں چھوڑ دیا۔ ایسے میں جب لعنت ملامت کے واسطے کوئی نشانے پر نہ آیا تو سیدے کے کچھ طرف داروں نے اُس کا نام لے لے کر گُر لانا شروع کر دیا کہ آج وہ زندہ ہوتا یا بستی والوں نے اُس کا ساتھ دیا ہوتا تو یہ سانحہ نہ ہوتا۔ اِس کے ساتھ ہی ایک گروہ نوجوانوں کا ایسا بھی وجود میں آ گیا کہ جس نے اِس افسوس ناک صورتِ حال کا ذمے دار کھلم کھلا منگر کو قرار دے دیا کہ جو اپنی بزدلانا حرکتوں کے سبب بستی کے لوگوں کو سیدے کے خلاف بھڑکا کر انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرتا رہا اور بالآخر سیدے کی موت یا گم شدگی کا باعث بنا۔

وہاں کچھ منگر کے طرف دار بھی موجود تھے۔ انہوں نے منگر تک یہ خبر اِس انداز میں پہنچائی کہ سیدے کے ساتھی اُسے مارنے کے لیے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ منگر حیران تھا کہ اُس نے سیدے کا کیا بگاڑا جو یوں اُس کے سنگتی اُسے مارنے کے واسطے ڈھونڈتے پھریں۔ لیکن جلد ہی بات کھل گئی اور منگر بیس پچیس ساتھیوں کے ساتھ اپنی صفائی دینے درویشوں کے پاس پرانے

قبرستان جا پہنچا مگر اُن فقیروں کو سیدے اور مُنگر کے معاملات سے کیا واسطہ ہوسکتا تھا۔ وہ تو بس یہ جاننا چاہتے تھے کہ سات شہیدوں کی قبروں کا کیا ہوا۔ کسی نے بتایا کہ آخری بار دیکھے جانے تک وہ قبریں یہیں پر موجود تھیں تو کہیں یہ تو نہیں ہوا کہ وہ اپنی قبروں سمیت آسمانوں میں اُٹھا لیے گئے ہوں۔ اِس بات کا یقین کر لیا جاتا اگر کہیں سے یہ امکان سامنے نہ آتا کہ ہوسکتا ہے ریلوے لائن بچھانے والوں نے قبروں کو پدھرا کر کے اوپر لائن بچھا دی ہو۔ چالیس درویشوں نے اِس بات کا یقین نہ کیا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اُن کی قبروں کو پدھرا کر کے اوپر پتھر اور لوہا ڈال دیا جائے۔ لیکن امکان یہ بھی تھا کہ اُن کی قبروں کو انگریزوں ہی نے کہیں اِدھر اُدھر نہ کر دیا ہو۔ لیکن کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ شہیدوں کی قبروں کے ساتھ اِس قسم کا سلوک بھی ہوسکتا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ تھی کہ جن بستی والوں کو دریائے ستلج کے ہر سال کے عذاب سے بچانے کے لیے شہیدوں نے یہاں دفن ہونے کی وصیت کی تھی انہی شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہیں کی گئی۔ درویش دہائی دے رہے تھے کہ اگر واقعی شہیدوں کی قبروں کی بے حرمتی کی گئی ہے تو اِس بستی میں اب آدم کا ٹھکانا ممکن نہیں رہا۔ اُن کے نزدیک شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہ کر سکنا بھی اُن کی بے حرمتی ہی تھی۔

پیر زندہ کرامت کا میلہ اُلٹ پُلٹ چکا تھا۔ مُٹھل ماچھی کا کہنا تھا کہ اُس کی یادداشت میں کہیں نہیں کہ کسی سال پیر زندہ کرامت کا میلہ لگنے سے پہلے اُجڑ گیا ہو۔ اُس کے نزدیک بھی شہیدوں کی قبروں کا دھیان نہ رکھنا اور پیر زندہ کرامت کے میلے کا یوں اُجڑ جانا بستی آدم واہن سے آدم کے ایک بار پھر چل چلاؤ کی خبر دے رہے تھے۔ وہ خود حیران پریشان اپنا منہ پیٹے جا رہا تھا کہ سال گزر گیا مگر اُسے کیوں شہیدوں کی قبروں کے ہونے یا نہ ہونے کی نہ تو خبر ہوئی اور نہ ہی خیال آیا۔ وہاں موجود نبلو سانسی بھی بولنے کی کوشش کرتا تو اُسے دمے کا دورہ پڑ جاتا اور بار بار اُس کی سانس اُکھڑنے لگتی لہٰذا وہ محض اشاروں سے مُٹھل ماچھی کی باتوں کی تائید کیے جا رہا تھا اور مارے افسوس کے اپنا منہ بھی پیٹے جا رہا تھا۔

چالیس درویشوں کو مُٹھل ماچھی اور نبلو سانسی کے منہ پیٹنے سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ زار و قطار روتے اور ایک ہی بات کہے جا رہے تھے کہ کوئی تو بتائے سات شہیدوں کی قبروں کا

کیا ہوا؟ مگر وہاں موجود لوگوں میں سے کسے پتا تھا اور کون بتاتا؟ لٰہذا صورتِ حال خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ جتنے لوگ بستی کے اِس مسلک کے تھے وہ تو پہلے ہی درویشوں کے ساتھ پُرانے قبرستان میں جمع ہو چکے تھے لیکن آس پاس کی بستیوں سے بھی سینکڑوں لوگ جو پیر زندہ کرامت کے میلے پر حاضری کے لیے پتن پر اکٹھے ہو رہے تھے، دریا کا پتن چھوڑ کر پُرانے قبرستان میں جمع ہونے لگے۔ یوں یہ مجمع بڑھتے بڑھتے سینکڑوں سے تجاوز کرنے لگا تو لوگوں کے جذبات بھی افسوس اور ہیجان سے ہوتے ہوتے غم اور شدید غصے میں بدلنے لگے۔ اِس دوران کسی نے وہاں خبر اُڑا دی کہ سات شہیدوں کی قبروں کو مسمار کرا کر اُن کے آثار مٹانے میں مولوی جاڑُاللہ کا ہاتھ ہے جو مخالف مسلک کے پیروکاروں کا کرتا دھرتا ہونے کے ساتھ ساتھ پیر زندہ کرامت کے میلے کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

بس پھر کیا تھا، چالیس درویش وہیں پرانے قبرستان میں ماتم کرتے رہ گئے لیکن باقی لوگوں کا بہت بڑا بپھرا ہوا ہجوم اینٹیں اور ریلوے ٹریک پر پڑے ہوئے پتھر اُٹھائے مولوی صاحب کے حجرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ مولوی صاحب کے گھر سے پہلے مائی نوانی کا تندور تھا جہاں صبح سے شام تک دال روٹی چلتی رہتی تھی۔ اتنا بڑا ہجوم دیکھ کر مائی کے اوسان خطا ہوئے تو وہ ہر چیز وہیں چھوڑ کر مولوی جاڑُاللہ کے حجرے کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ تندور پھر سے تازہ کرنے کے لیے خشک لکڑی کی چڑاٹھیں ابھی تندور میں بھڑکنا شروع ہی ہوئی تھیں کہ ہجوم کے موہری لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئیں۔ پھر یہ ہوا کہ مولوی صاحب کے حجرے پر خشت باری اور سنگ باری کے ساتھ ساتھ آگ لگانے کے لیے بُھس، جھاڑیاں اور ڈھینگر اکٹھے کیے جانے لگے اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے مولوی صاحب کے حجرے کو چاروں طرف سے آگ نے گھیر لیا۔ مولوی صاحب کی بدقسمتی کہ اُس وقت وہ بڑے زنان خانے سے نکل کر حجرے میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ ہجوم کے پتھراؤ کے نشانے پر آ گیا۔ اگرچہ طالب علموں نے اُس کے گرد گھیرا ڈال کر بچانے کی پوری کوشش کی مگر وہ سب کے سب متشدد ہجوم کے ہاتھوں زخمی ہو کر آگ کی لپیٹ میں آتے چلے گئے۔ طالبان کا گرنا تھا کہ مولوی صاحب اور ہجوم کے درمیان سوائے آگ کے شعلوں کے اور کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ طیش

کی آگ میں جلتے بھنتے کچھ لوگ آگے بڑھے اور آگ میں کود کر اِدھر اُدھر بھاگتے اور چکراتے مولوی صاحب کو ڈانگ سوٹوں پر رکھ کر منٹوں میں پھڑکر کے نیچے گرا دیا مگر اُن کا غصہ تھا کہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ مولوی صاحب کے ارد گرد گرے ہوئے طالب علموں میں سے جو بھی ہوش میں آنے کی کوشش کرتا اُس پر لاٹھیاں برسا دی جاتیں۔ مقامِ حیرت تھا کہ وہ بستی جو پرانے قبرستان کی بے رحمانہ منتقلی کے بعد وہاں ریلوے ٹریک بچھا دیے جانے اور سیدے جیسے نوجوان کی بہت سے سنگتیوں سمیت گم شدگی یا ممکنہ ہلاکت اور سکندرے کے قتل پر پورا برس چُپ سادھے رہی تھی یکدم آتش فشاں بن کر رہ گئی تھی۔

اتنے میں ہجوم میں سے کسی نے نعرہ لگایا کہ مولوی جارُاللہ کے زنان خانوں کو بھی آگ لگا دی جائے۔ مشتعل ہجوم چونکہ سیلابی ریلے کی مانند اُسی طرف بڑھتا ہے کہ جس طرف نسبتاً ڈھلوان ہو اِس لیے زنان خانے پر چڑھ دوڑنا بھی پانی کا ڈھلوانی سطح کی جانب اُمڈنا تھا جہاں مزاحمت کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اِس قسم کے ہجوم کی اگلی صفوں میں ہمیشہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی طبع میں تشدد، بے رحمی اور خونریزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ یہ لوگ بھیڑیے کی سرشت رکھتے ہیں اور بپھرے ہوئے ہجوم کے جذبات کو بھڑکانے کے بجائے لوٹ مار کے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اِن کے بعد کی صفوں میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو ٹارگٹ پر از خود حملہ آور ہونے کے بجائے پہلے ہلے میں رگید دیے گئے ٹارگٹ کو بھنبھوڑنے کا کام انجام دیتے ہیں اور رہی سہی کسر کو پورا کرنے کے بعد ہی آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں جوش اور حیوانیت تو ہوتی ہے مگر جلد بازی نہیں۔ یہ اپنے شکار کا انجام دیکھ کر ہی آگے بڑھتے ہیں۔ جب کہ اِن دونوں گروہوں کو اپنی تعداد اور مقدار سے تقویت پہنچانے والی لوگوں کی تیسری قسم خود کو محض جذباتی نعرے لگانے تک ہی محدود رکھتی ہے اور ہجوم کے اشتعال میں کمی نہیں آنے دیتی بلکہ پوری کوشش میں رہتی ہے کہ اُس میں بڑھاوا ہو۔ اس قسم کے بپھرے ہوئے جلوس نما ہجوم کی سب سے آخری صفوں میں تماش بین مزاج کے لوگ کھچے چلے آتے ہیں۔ یہ کچو پیا طبع لوگ نہ تو عمل پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی عمل انگیزی جوگے ہوتے ہیں۔ یہ دوسروں کی فعالیت سے حظ اُٹھاتے اور اُن کی

لطف اندوزی سے اپنے لیے تسکین کشید کرتے ہیں۔ انہیں قتل کرنے میں نہیں بلکہ لاشیں گننے میں وہی سواد آتا ہے کہ جو ایک وحشی کو اپنی وحشت نمائی میں یا ایک جادوگر کو اپنی فسوں کاری میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ زخم لگا نہیں پاتے لیکن زخموں کی گہرائی کے اندازے لگا کر حیوانی جبلت کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ یوں یہ چار قسم کے لوگ ملیں تو ایک بپھرا ہوا مشتعل ہجوم تشکیل پاتا ہے۔

مولوی جاڑاللہ کے زنان خانوں پر حملہ کرنے کا نعرہ کیا بلند ہوا کیا تو بھڑکے ہوئے جلوس کے ہراول دستوں نے بلا سوچے سمجھے زنان خانوں ہی کا رُخ کر لیا۔ جیسے ہی گھروں میں پتھر گرنے شروع ہوئے تو پہلے سے ہونے والی چیخ و پکار بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ ابھی تک گھروں میں مولوی صاحب کی موجودہ حالت کی خبر نہیں پہنچی تھی مگر اتنا احساس ضرور تھا کہ باہر کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہو رہا ہے کہ جو جان لیوا ہے لہٰذا اپنی اپنی جان بچانے کے لیے حجرے کی سمت کے دروازے دھڑا دھڑ اندر سے بند ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن جب پتھراؤ میں شدت آئی اور باہر پھیلتی ہوئی آگ نے زبان پھیلا کر مولوی صاحب کے زنان خانوں میں جھانکنا شروع کیا تو مولوی صاحب کی بیویوں کو صورتِ حال کی نزاکت کے احساس کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب کی خیر خیریت کی فکر بھی لاحق ہو گئی۔ لیکن کون باہر جاتا اور کیسے کسی کی خبر لاتا؟

بڑے زنان خانے میں موجود خادماؤں نے روتی گُرلاتی مُلانیوں کو مت دی کہ جان بچانی ہے تو پچھواڑے والی کچی دیوار میں سے راستہ بنانا ہوگا ورنہ سبھی لوگ بے موت مارے جائیں گے۔ بڑی مُلانی نے کچھ دیر تک تو اِس تجویز کو مؤخر کیے رکھا کہ شاید مولوی صاحب کسی طریقے اندر آ کر اُن کی حفاظت کا بندوبست کریں گے مگر جب باہر سے مولوی صاحب کے بجائے پتھراؤ اور آگ کے شعلوں میں شدت آنے لگی تو خادماؤں نے مُلانیوں کی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اپنے طور ہی پر پچھواڑے کی دیوار کو ڈنڈوں اور سوٹوں سے توڑنا شروع کر دیا۔ ایسے میں کسی خادمہ نے چھوٹے زنان خانے میں سے چھوٹی مُلانی اور اُس کے بیٹے کی خبر گیری کی طرف بڑی مُلانیوں کی توجہ دلائی تو انہوں نے چیخنے چلانے کے دوران ہی اُس خادمہ کے بال نوچ کر اُسے لاتوں مُکوں پر اس طرح رکھا کہ اُسے مشکل ہو گیا کہ آگ اور پتھراؤ سے بچے یا مُلانیوں سے جان

بچائے۔

اُدھر گھر کے باہر لگائے جانے والے نعروں میں مولوی جارُ اللہ ہی کو سات شہیدوں کی قبروں کی گم شدگی اور بے حرمتی کا ذے دار ٹھہراتے ہوئے بیوی بچوں سمیت واجب القتل قرار دیا جا رہا تھا۔ گو کہ مولوی صاحب کا حجرہ مولوی صاحب اور اُن کے طالب علموں سمیت نذرِ آتش ہو چکا تھا مگر مشتعل ہجوم کا اشتعال ابھی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اِسی دوران نجانے کہاں سے ایک درمیانی عمر کا باریش شخص ظاہر ہوا جو مسلسل چیخے جا رہا تھا کہ اُس کی بات سُنی جائے مگر اتنے بڑے ہجوم میں کون کس طرح اُس کی طرف توجہ دے سکتا تھا۔ جب کہیں سے کچھ نہ بن پڑا تو اُس نے اپنی قمیص اُتار کر چیخنا چلانا اور منہ سر پیٹنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو لوگ یہ سمجھے کہ اُسے سات شہیدوں کی قبروں کی بے حرمتی کا شدید صدمہ پہنچا ہے جس کا اظہار وہ ماتم کر کے کر رہا ہے مگر جوں جوں بات پھیلتی گئی کہ وہ سات شہیدوں کی قبروں کے نہ ہونے پر صرف افسوس ہی نہیں بلکہ اُن کی گم شدگی کے بارے کچھ بتانا چاہتا ہے تو ہجوم میں موجود چہروں کے تناؤ میں کمی آتی چلی گئی۔ اب وہاں غم وغصہ کی جگہ حیرت اور تجسس نے لے لی تھی۔ لیکن یہ کیفیت در آتے آتے موقع پر سوائے دھواں دیتی نیم منہدم کوٹھڑیوں اور زخموں سے چور چور اَدھ جلے انسانی اجسام کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

وہ شخص جو خبر دینا چاہتا تھا خود بھی نڈھال ہو چکا تھا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کچھ لوگ جو اُس کی بات سننا چاہتے تھے وہ اُس کے قریب ہوتے جا رہے تھے اور پھر چند لمحوں میں اُس کے قریب ہونے والے لوگوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ نہ تو وہ کہیں دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی اُس کی بات سُنائی دے رہی تھی۔ ایسے میں کسی نے کہا اُسے اونچی جگہ پر کھڑا کر دو تا کہ سب سُن سکیں وہ کیا بکواس کرتا ہے۔ لفظ ''بکواس'' کا استعمال کچھ لوگوں کو برا لگا تو ہجوم ہی سے کسی نے دو چار ہاتھ اُس شخص کو جڑ دیے جس نے بکواس کرنے کو کہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ فتنہ کوئی نیا رُخ اختیار کرتا کسی سمجھ دار شخص نے خبر دینے والے شخص کو اُٹھا کر اپنے کندھے پر اِس طرح بٹھا لیا کہ وہ دور تک دکھائی اور سُنائی دے۔ مگر کندھے پر بٹھانے کے اِس عمل اور کھینچا تانی

میں اُس کی دھوتی کھل کر کہیں گر گئی جب کہ قمیص تو پہلے ہی اُس کے بدن پر نہیں رہی تھی۔ لیکن اُس جذباتی ہو رہے شخص کو کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حالت میں ہے؟ خوف اُس کے چہرے سے منتشرح اور کپکپی پورے وجود پر طاری کہ جیسے یہ لوگ اُس کے ساتھ ویسا سلوک نہ کریں کہ جیسا ابھی ابھی مولوی جارُاللہ اور اُس کے گھر والوں کے ساتھ کر چکے تھے۔ اُس کے قریب کھڑے لوگ اُسے بولنے کے لیے آوازیں دے رہے تھے مگر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی شخص کے کندھے پر بیٹھنے کے بعد اُس کا حافظ اور بولنے کی سکت دونوں جواب دے چکے ہوں۔

کچھ دیر کے بعد جب قدرے خاموشی ہوئی اور لوگوں کے چہروں پر چھائی ہوئی وحشت بھی کسی حد تک سکون میں بدلنے لگی تو اُس باریش برہنہ شخص نے بولنے کے لیے منہ کھولا مگر اُس کی آواز اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ شاید اُسے اپنی برہنگی کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ ممکن ہے وہ کچھ بول پاتا مگر اس دوران ہی ہجوم میں سے کسی شخص نے آواز لگا دی کہ یہ تو مولوی جارُاللہ کا خاص آدمی ہے جو ہماری توجہ ہٹا کر اُسے بچانا چاہتا ہے۔ لہٰذا چاروں طرف سے اُسے پکڑو مارو کے دبے دبے نعرے لگنے لگے۔ اتنے میں ایک شخص نے اُسے کمر پر دھپا رسید کرتے ہوئے کہا کہ بولو! بتاؤ کیا واقعہ ہوا تھا؟ نہیں بتاؤ گے تو تم بے موت مارے جاؤ گے۔ اِس سے پہلے کہ کچھ اور اُلٹا سیدھا ہوتا وہ برہنہ باریش شخص چیخ اُٹھا کہ ریلوے لائن بچھاتے وقت سات شہیدوں کی قبریں عین ریلوے ٹریک والی جگہ پر آ رہی تھیں۔ چونکہ اِن قبروں پر نہ تو کسی شخص یا برادری کا دعویٰ تھا اور نہ ہی کسی کی جانب سے انہیں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لہٰذا چیف انجینئر ریلوے کے حکم کے تحت اُن کو لاوارث سمجھتے ہوئے پرانی قبروں سے بحفاظت نکال کر دریا کے کنارے دفن کرا دیا گیا تھا۔

''اے بد بخت! تمھیں کیسے معلوم ہے یہ کہانی جو بستی میں کسی کو بھی معلوم نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو.... بکواس کر رہے ہو۔'' ایک شخص ہجوم سے چلایا۔

''میں اُس وقت ریلوے کمپنی کی ملازمت میں تھا، ریلوے لائن بچھانے کی مزدوری پر.... یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔'' کندھے پر سوار برہنہ باریش شخص بھی چیخ کر

بولا۔

''یہ جھوٹا ہے..... مار دو اِسے۔'' ہجوم میں سے ایک اور شخص کے چیخنے کی آواز آئی۔

''خدا کی قسم! میں جھوٹ نہیں بولتا..... اُن ساتوں شہیدوں کو ریلوے لائن کے دوسری جانب دریا کے کنارے دفن کیا گیا تھا۔'' باریش برہنہ شخص ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر قسمیں کھا رہا تھا مگر کوئی بھی اُس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

''اگر تم سچے ہو تو یہ بات بستی والوں کو پہلے کیوں نہیں بتائی؟'' ہجوم میں چھائی ہوئی خاموشی ایک بار پھر شور اور چیخنے چلانے میں بدلتی جا رہی تھی۔

''میں ڈرا ہوا تھا... خوف زدہ تھا۔'' باریش شخص اب بار بار ہاتھ جوڑے جا رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دو..... مجھے معاف کر دو۔''

''مار دو اِس حرامی کو..... خدا کی قسم یہ جھوٹ بول کر مولوی کو بچانا چاہتا ہے..... مولوی تو گیا جہنم میں.....اِسے بھی اُس کے ساتھ روانہ کرو۔'' ہجوم اب یک زبان ہونے لگا تھا۔

''مجھے نہ مارو! خدا کے لیے مجھے نہ مارو! مجھے مار دیا تو تم لوگوں کو شہیدوں کی نئی قبریں کون دکھائے گا؟'' موت کے خوف سے برہنہ شخص کا چہرہ زرد پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ مسلسل ہاتھ جوڑے جا رہا تھا مگر ہجوم میں سے کوئی بھی اُس کی بات سُننے کو تیار نہیں تھا۔ ''مار دو مار دو'' کی چیخ و پکار میں کسی نامعلوم شخص نے اُسے بازو سے پکڑ کر اتنے زور سے کھینچا کہ وہ کندھے پر سوار شخص کے کندھے سے نیچے زمین پر آن گرا۔ اُس کے گرتے ہی لوگوں نے اپنے پاؤں زور زور سے اُٹھا کر اُس گرے ہوئے شخص کے پورے بدن پر اِس طرح مارنے شروع کیے کہ کچھ دیر ہی میں وہ جیتے جاگتے انسان سے گوشت کے لوتھڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں مٹی ہو جاتا چاروں طرف سے دوڑتے گھوڑوں کی آوازیں سنائی دینا شروع ہو گئیں۔ کسی کے لیے بھی اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ داروغہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ اُدھر کو چلا آتا ہے۔

داروغہ اگرچہ اِس زمرے میں مقامی ہی تھا کہ اُس کا تعلق ملتان سے تھا مگر اُس کی خاکی وردی کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنا ایسے ہی تھا کہ جیسے انگریز سرکار کو آنکھیں دکھانا اور سرکار کو

آنکھیں دکھانے کی سزا آنکھوں کو نکالے جانے سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔ سُو آپس میں جڑ کر کھڑے ہوئے لوگ دیکھتے ہی دیکھتے تتر بتر ہونا شروع ہو گئے۔ داروغہ اپنی سپاہ کے ساتھ موقع پر پہنچا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ بستی کے لوگ اِس قدر وحشی بھی ہو سکتے ہیں۔ خدا کی پناہ کہ محض پاؤں کی پے در پے ضربات سے ایک جیتے جاگتے انسان کو کچلے ہوئے گوشت کی ڈھیری بنا دیا گیا تھا۔ مولوی جارُاللہ کے سوختہ حجرے کے دالان میں پہنچا تو وہاں مولوی صاحب کے سمیت گیارہ جلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ انہوں نے ایک ایک کر کے لاش اکٹھی کرنا شروع کیں مگر اُن کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ جس کا جو بھی عضو جس کسی کے ہاتھ میں آیا، بدن سے علیحدہ ہوتا چلا گیا۔

داروغہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اتنا غصہ بستی کے لوگوں میں ایک دم کہاں سے آ گیا؟ سال بھر پہلے اُن کے صدیوں پرانے قبرستان کو اُدھیڑ کر پھینک دیا گیا مگر وہ محض کسمسائے اور چُپ ہو رہے۔ اُن کے محبِ وطن نوجوانوں کے پورے گروہ کا صفایا کر دیا گیا مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ مگر یہ جنوں کہاں تھا، کون سے پاتال میں چھپا ہوا تھا کہ بظاہر معمولی سی بات پر اُبھرا اور مولوی جارُاللہ جیسی بستی کی طاقت ور ترین شخصیت کو روندتا ہوا گزر گیا۔ داروغہ کے نزدیک بھی یہ غصہ اُسی قبرستان کو مسمار کیے جانے کا غصہ تھا کہ جو اُس کے جیسے تنخواہ دار ملازم کو وہ حوصلہ نہ دے سکا جو ایک سیدے جیسے فریڈم فائٹر کو دے گیا۔ سیدا زندہ رہا یا مر گیا مگر وہ تاریخ کے پنّوں میں تو زندہ ہی ہے نا۔ اور یہ جو آج ہوا، یہ اُسی کاوڑ اور کرودھ کا لاوا تھا جو ایسے آتش فشاں سے پھٹا اور اُبلا جسے مردہ سمجھ لیا گیا تھا۔ کسی بہت بڑے ظلم کے بعد کی خاموشی، ظلم برداشت ہو چکنے کی نہیں ہوتی بلکہ اُس کے ردِعمل کے لیے کسی عمل انگیز کی منتظر رہتی ہے۔ ظلم کے آتش فشاں پر لاوا اِس لیے جمتا رہتا ہے کہ دوبارہ پھٹنے پر اُسے وہاں تک پھیلانے کی توانائی دے سکے جہاں اِس سے پہلے اُس کے پہنچنے کے امکانات بھی نہیں ہوتے۔

مولوی جارُاللہ کی لاش سمیٹتے ہوئے داروغہ کو اُس سے منسوب وہ سبھی باتیں یاد آنے لگیں کہ جن کی بدولت اِس خطے میں انگریز سرکار کا اقتدار مستحکم ہوا تھا۔ کیسے کیسے نازک مرحلے اِس

دوران نہیں آئے تھے کہ جب یوں لگا کہ انگریز سرکار کی حاکمیت گئی سو گئی۔ مگر ایک بار پھر کوئی ایسا جادو سا مولوی صاحب کی زبان سے ادا ہوتا اور حالات کا پہیہ گھوم جاتا۔ کہی اَن کہی اور اَن کہی کہی ہو جاتی۔ داروغہ کو یاد آیا کہ دریائے ستلج پر پُل بنانے اور اسے ریلوے لائن کے ذریعے ملتان سے جوڑنے کے واسطے اگر مولوی صاحب اِس کی مخالفت نہ کرتا تو انگریز سرکار کو کیوں کر مقامی لوگوں کے ردِ عمل کے حجم کا اندازہ ہو پاتا۔ باریش برہنہ شخص سمیت وہاں بارہ لاشیں اور بھی پڑی تھیں مگر داروغہ کو اگر کسی کا دکھ تھا تو مولوی جارُ اللہ کا کہ جس کے یوں رخصت ہونے کے بعد بستی میں انگریز اثر و نفوذ کا امکاں بھی محسوس نہیں ہو پا رہا تھا۔

مولوی صاحب کے حجرے کے بعد اُن کے کے زنان خانوں کی کی باری آئی۔ حجرے سے ملحقہ بڑے زنان خانے میں کوئی بھی نہیں تھا سوائے ایک باندی کی لاش کہ جسے بظاہر برآمدے کے کھمبے سے باندھا گیا تھا مگر اُسے آگ نے وہیں آلیا۔ داروغہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ زنان خانے میں موجود جب سب لوگ ایک ہی ہلے میں گھر کی کچی دیوار توڑ کر باہر جا سکتے تھے تو اِس خادمہ کو کیوں یہاں باندھ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا؟ ابھی اِس بات کا تعین بھی ہونا تھا کہ گھر والے گھر جلائے جانے کے وقت کیا واقعی اندر موجود تھے بھی یا نہیں اور کیا دیوار اندر ہی سے توڑی گئی یا باہر سے حملہ آور ہونے والوں نے توڑی۔ لیکن موقع پر موجود شواہد سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ دیوار اندر سے ٹوٹی ہے۔ داروغہ کے لیے اِس مرحلے پر جہاں لاقانونیت پر قابو پانا ضروری تھا وہاں مولوی صاحب کے اہلِ خانہ کی حفاظت کرنا بھی اُس کی ذمے داریوں میں سے تھا۔ سو اپنے ساتھ آئے ہوئے بیس گھڑ سوار سپاہیوں میں سے چار چار کی چار ٹولیاں اُس نے چاروں طرف گشت کے لیے پھیلا دیں اور باقی چار کو اپنے ساتھ لے کر موقع پر پڑاؤ ڈال لیا اور تفتیش شروع کر دی۔

تفتیش کیا تھی بس گھڑی پَل میں ویران ہو چکے حجرے اور اُس سے ملحقہ مکانوں میں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھتے جانا تھا کہ جس میں انسانی گوشت کے جلنے کی بو سب سے نمایاں تھی۔ جلتے ہوئے جسموں کی ایک جیسی بو سے تفریق نہیں ہو پا رہی تھی کہ کون سی مولوی صاحب کی

چربی کی ہے اور کون سی اُن کے طالبان کے جسموں کی یا کون سی خادمہ کے بدن کی۔ اِس بو سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ کون زندہ جلا، کون جلتے ہوا مرا اور کون مرنے کے بعد جلا؟ چاروں طرف پھیلی ہوئی بو یہ بتانے سے بھی قاصر تھی جلنے والے جسم پر زخم کتنے یا پوشاک کون سی تھی؟ کپڑا قیمتی تھا یا ارزاں؟ پاؤں میں جوتا بھی تھا یا ننگے پاؤں تھا؟ کچھ کھایا بھی تھا یا فاقے سے تھا؟ داروغے کا سر چکرایا تو وہ گھوڑے سے نیچے اُتر آیا۔ حجرے سے ملحقہ مسجد جوں کی توں اور ثابت و سالم تھی۔ اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ جب کہ مشتعل ہجوم کب کا اپنے اشتعال سمیت غائب ہو چکا تھا اور موقع پر محض اشتعال کے آثار باقی رہ گئے تھے۔

اتنے میں مولوی صاحب کے بڑے زنان خانے کے عقبی سمت جانے والے دستے نے واپس آ کر بتایا کہ مولوی صاحب کی تینوں بڑی بیگمات اپنے بچوں اور خادماؤں سمیت پرانے کھنڈر میں چھپی ہوئی تھیں، اُنہیں محفوظ جگہ پہنچا کر دو گھڑسواروں کا پہرہ لگا دیا گیا ہے۔ داروغہ اُن سے ایک بندھی ہوئی خادمہ کی موت کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر اِن حالات میں پوچھنا نامناسب تھا۔ معاً اُسے چھوٹے زنان خانے میں رہنے والی مولوی صاحب کی چوتھی بیوی کا خیال آیا تو وہ کسی کو کچھ کہنے کے بجائے خود ہی اُچھل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور تیزی سے اُس سمت گیا کہ جہاں چھوٹے زنان خانے کا دروازہ تھا۔ مولوی کی چھوٹی بیوی کا خوب صورت چہرہ ابھی تک اُس کے حافظے میں تھا۔ یہ تو مولوی صاحب کا سرکاری احترام تھا کہ جس نے اُس کے ہاتھوں اتنی کم عمر لڑکی کو مولوی کے نکاح میں جانے دیا تھا ورنہ کسی کی کیا مجال اُس قسم کی لاوارث چھوہر داروغہ کے علاوہ کسی اور کے حصے میں آتی۔

داروغہ چھوٹی مُلانی کے دروازے پر پہنچا تو اُس کا دل دھڑکنا چھوڑ کر ایک دم بیٹھ گیا۔ چھوٹے زنان خانے کا دروازہ کسی پھاٹک کی طرح کھلا تھا۔ وہ جتنی تیزی سے اُچھل کر گھوڑے پر سوار ہوا تھا اُتنی ہی تیزی سے نیچے کودا اور پاؤں زمین پر لگتے ہی گھر میں گھس گیا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ اگرچہ پورے گھر میں ہر چیز موجود تھی مگر اُلٹ پُلٹ ہوئی پڑی تھی۔ جہاں جہاں خشک لکڑیاں، پتے یا کوئی اور جل اُٹھنے والی چیز پڑی ہوئی تھی، وہ جل چکی تھی یا ہلکا ہلکا دھواں دیتے ہوئے سُلگے جا

رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ چھوٹی مُلانی اپنی جان بچا کر گھر سے نکل چکی ہے۔ مگر کہاں؟ کیا اُس کے پاس کوئی خادمہ بھی تھی یا نہیں؟ کیسے بچایا ہوگا اُس نے اپنے آپ کو اور اگر کوئی بچہ بھی ہوا تو اُس کو؟ کیا اُس کی ماں تو نہیں تھی گھر میں اُس کے ساتھ؟ یہ سوچتے ہی عجیب سا پاگل پن سوار ہوا داروغہ پر۔ وہ پھر سے ایک ہی جست میں گھوڑے پر سوار ہوا ایک اُسے ایڑ لگانے سے پہلے ہی کچھ سوچ کر پھر واپس پلٹا اور اپنے ساتھ موجود سپاہیوں کو حکم دیا کہ فی الحال جلوس میں شامل لوگوں کو کچھ نہ کہا جائے اور اِس کے لیے اوپر کے حکم کا انتظار کیا جائے۔ جاتے جاتے داروغہ ایک بار پھر واپس آیا اور جلی ہوئی لاشوں کی شناخت اور اُن کی تدفین کے بندوبست کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب کے زنان خانے والوں کی حفاظت کا کہتے ہی گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اُس کا رخ ملوکاں کے گھر کی طرف تھا۔

ملوکاں کا گھر مولوی صاحب کے زنان خانوں سے بھی زیادہ ویران پڑا ہوا تھا۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ یہاں کچھ جلا ہوا نہیں تھا ورنہ سامان کی اُلٹ پلٹ اور سب کچھ چھوڑ اچانک بھاگ نکلنے کے آثار ایک جیسے تھے۔ اندر باہر کے دروازے سب کھلے ہوئے، چارپائیاں کہیں اُلٹی اور کہیں گھسیٹی ہوئی، کھانے کے برتنوں میں کھانا ادھ کھایا موجود مگر گھڑے کا پانی زمین پر گرا ہوا جس کا مٹی میں جذب ہونا گزرے وقت کی نشان دہی کر رہا تھا کہ یہاں سے رخصت ہوئے مکینوں کو آدھ پون گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرا تھا۔ داروغے کا شک منگر کی طرف گیا۔ اِس قسم کے حالات میں وہی ایک بار پھر موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر سکتا تھا کہ سنگری چھوٹی مُلانی ہو کر بھی کسی کو بھلائے نہیں بھول پا رہی تھی۔

داروغہ کو منگر کے گھر جا کر بھی مایوسی ہوئی۔ وہاں گھر کی دو عورتوں کے سوا کوئی بھی موجود نہیں تھا جن میں ایک منگر کی ماں اور دوسری اُس کی ماں کی کوئی بوڑھی عزیزہ جو اپنے گھر کی رہائش بوجوہ ترک کر چکی تھی۔ منگر کی ماں نے بتایا کہ وہ اِس بار میلے کے انتظامات کا وڈ کا بنا ہوا ہے اس لیے تین دن ہوئے، گھر ہی نہیں آیا۔ داروغہ پریشانی کے عالم میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ چھوٹی مُلانی ماں سمیت گئی تو گئی کہاں خاص طور پر اِس صورتِ حال میں کہ مولوی صاحب کی زنانیوں کا

بستی سے نکلنا بھی مشکل تھا اور بستی میں بچ کر رہنا بھی دشوار۔

داروغہ ابھی وہیں گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دو گھڑ سوار سپاہیوں نے آ کر اطلاع دی کہ مولوی صاحب کے گھر پر حملہ کرنے والا ہجوم جو داروغہ کے آنے پر بکھر گیا تھا پھر سے پرانے قبرستان میں چالیس درویشوں کے گرد جمع ہو رہا ہے۔ اُدھر درویشوں تک بھی خبر پہنچ چکی تھی کہ سات شہیدوں کی میتوں کو اُن کی قبروں سے نکال کر دریا کنارے اُس جگہ بے نشاں دفن کر دیا گیا تھا کہ جہاں پُل بنانے کے لیے ستلج کو موڑ کر خشک جگہ نکالی گئی تھی۔ اب فوری خدشہ یہ پیدا ہو گیا کہ چالیس درویش وہاں اکٹھے ہو چکے لوگوں کا جلوس لے کر کہیں اُس سائٹ کی طرف نہ چل پڑیں جہاں سے دریا کا رخ موڑ کر پُل کے ستونوں کی بنیادیں بھری جا رہی تھیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ براہ راست انگریز سرکار کے امور میں مداخلت سے زیادہ بغاوت کے مترادف ہو گی۔ داروغہ کو فوری طور پر اوپر کے حکام کو مطلع کرنا تھا۔ لیکن اتنی بڑی ایمرجنسی کے باوجود اُس کے دل سے نہ تو سنگری نکل پا رہی تھی اور نہ ہی دماغ سے منگر۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بالترتیب بسے اور چھبے ہوئے تھے۔ وہ پھر سے سنگری ہو چکی چھوٹی مُلانی اور منگر کو تلاش کیے بغیر بستی سے نہیں جانا چاہتا تھا جب کہ اُدھر اوپر والوں کو روداد بتانا بھی ضروری تھا۔

داروغہ نے اپنے سب سے بااعتماد سپاہی جسے اُس کے حاسدین نے نائب داروغہ مشہور کر رکھا تھا، بُلایا اور اوپر رپورٹ کرنے کی تفصیل بتا کر چوکی روانہ کر دیا یہ سمجھا کر کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر اُس کا موقع پر رہنا ضروری تھا۔ نائب داروغہ ایک سپاہی کے ہمراہ جوں ہی چوکی کی سمت روانہ ہوا، داروغہ نے بھی دو گھڑ سوار سپاہی اپنے ساتھ لیے اور خطرات کی پروا کیے بغیر گھوڑے کو پرانے قبرستان کی جانب ایڑ دکھا دی۔ دونوں سپاہی اُس کے ساتھ جا تو رہے تھے مگر پریشان تھے کہ اُن کا داروغہ کر کیا رہا ہے؟ جان بوجھ کر آگ میں کودنے جا رہا ہے۔ اگر مشتعل ہجوم نے اِن کو دیکھ لیا تو بوٹی بوٹی کر کے رکھ دیں گے۔ لیکن کیا کرتے کہ داروغہ نے پرانے قبرستان میں انگریز سرکار کے خلاف نعرہ زنی کرتے ہوئے مجمع کے پاس جا کر ہی گھوڑے کی باگیں کھینچیں۔ گھوڑا ایک دم رُکا تو زور کا ہنہنایا۔ مجمع کی سب سے آخری دو قطار کے لوگوں نے پلٹ کر اُس کی

طرف دیکھا۔ اِن لوگوں میں سے ایک مَنگر بھی تھا۔ خلاف توقع وہ پا پیادہ تھا۔ مَنگر کو مجمع میں یوں سواری کے بغیر کھڑے دیکھ کر داروغے کو جہاں اطمینان ہوا وہاں پریشانی بھی کچھ اور سوا ہو گئی۔ پریشانی اس بات کی تھی کہ اگر مَنگر بھی یہاں کافی دیر سے بِنا سواری کے موجود ہے تو سَنگری کہاں ہو سکتی ہے؟



## ۲۶

دریائے ستلج کے جنوبی کنارے پر ریاست بہاول پور کی حدود میں واقع اِنڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کے سائٹ آفس میں کھلبلی شروع ہو چکی تھی۔ کمپنی کے ہیڈ آفس اور مقامی انتظامیہ کی طرف سے ملنے والی خبریں اگرچہ ایک ہی نوعیت کی تھیں مگر احکامات مختلف تھے۔ کمپنی کے ہیڈ آفس سے موصول ہونے والے پہلے مراسلے میں تو محض محتاط رہنے کو کہا گیا تھا کیونکہ عین ممکن تھا بستی کے کچھ شر پسند عناصر قبرستان کی منتقلی کا ایک برس پورا ہونے پر کوئی شر انگیزی کریں مگر کچھ دیر کے بعد وضاحت آئی کہ کمپنی کی تعمیراتی تنصیبات کی حفاظت بھی غیر معمولی حد تک یقینی بنائی جائے۔ لیکن مقامی انتظامیہ کی طرف سے واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ بستی سے آنے والے سوسَوا سو لوگ دریا پر پُل تعمیر کیے جانے والی جگہ پر جمع ہو کر کوئی بھی تخریبی کارروائی کر سکتے ہیں لہٰذا اُن سے نمٹنے کے لیے سکیورٹی فورس بھجوائی جا رہی تھی۔

چیف انجینئر جان برٹن نے مقامی انتظامیہ کی جانب سے خبر ملتے ہی اُس کی اطلاع بہاول پور ہیڈ آفس کو تار کے ذریعے بھجوا دی اور خود ایک لمبی سانس لے کر آرام چیئر پر نیم دراز ہو گیا۔ دن ڈھلتے ہی ایما سے وابستہ تمام تر تصوراتی رنگینیاں اُس کے حواس پر غلبہ کرنے لگتی تھیں۔ طبیعت میں پیدا شدہ اضمحلال کا سبب اِس کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا کہ اُس سے شادی کے بعد غالباً یہ پہلی شام ہونے کو آ رہی تھی جس کی شب اُس کا بہاول پور جانے کا امکان کم سے کم تھا۔ ایما سے

شادی اُس کی بے چین اور غیر ہموار زندگی میں مست ہوا کا خواب آور جھونکا ثابت ہوئی تھی۔ ایک طویل مدت کی تھکن جس نے زندگی کو اُجاڑ کر رکھا ہوا تھا، ایما کے دخیل ہوتے ہی غائب ہو چکی تھی۔ وہ اُس کا بگڑے ہوئے بچوں کی طرح خیال رکھتی۔ جان برنٹن کا شروع شروع کا چڑچڑا پن اُس نے کسی صبر مند ماں کی طرح جھیلا تا وقتیکہ خود جان کو اپنے رویے پر ندامت نہ ہونے لگی۔ جان کی عادت بن چکی تھی کہ دن بھر کی پیشہ ورانہ زندگی کی تمام اُلجھنیں وہ رات کی بے سکوں خاموشی کی نذر کیا کرتا جس میں سگار کا دھواں اور شراب کی کڑواہٹ اُس کے رفیق تلذذ ہوتے۔ مگر ایما سے رفاقت کے چند ہفتوں کے بعد ہی جہاں دن میں کلفتوں کے خلاف برداشت پیدا ہوئی وہیں شام بھی خود بخود خوش گوار ہوتی چلی گئی۔ شراب کم سے کم اور سگار خواہشاً نہیں، عادتاً رہ گیا۔

جان پہلی بار زندگی کے اُن پہلوؤں کے بارے میں بھی سوچنے لگا تھا جو اِس سے قبل اُس کی خواہشات کا حصہ ہی نہیں رہے تھے۔ پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ عورت کسی مرد کی زندگی میں ہمیشہ عذاب بن کر نہیں آتی بلکہ عذابوں سے چھٹکارہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ پہلی بار ادراک ہوا کہ لازم نہیں بیوی صرف چڑچڑ، چخ چخ اور جذباتی ایذا رسانی جیسے رویوں ہی سے وجود پاتی ہو بلکہ میٹھا بولنے پر آئے تو شہد بھی اُس کے سامنے پھیکا، مرہم ہونا چاہے تو بڑے سے بڑے زخم بھی پل بھر میں مندمل اور بھری خزاں میں بہار لانا چاہے تو بس ایک بار آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا دے۔ وہ حیران تھا کہ آس پاس کی سبھی شرابیں، سبھی مُسکن عورت سے مطلوب خوش گوار وجودیت اور تشفی کا متبادل بن کر مرد کے ذہنی حصار میں جگہ بناتے ہیں، عورت کے اصل میں ہوتے ہوئے نہیں۔ جب کہ اِس کے برعکس رویوں کی حامل عورت، مرد کے واسطے سر کہ تو ہو سکتی ہے مگر شراب نہیں۔

جان کو احساس ہو رہا تھا کہ شرابیں اُس وقت تک مرد کی ترجیحات میں شمار ہی نہیں ہو پاتیں کہ جب تک وہ کسی عورت کے استرداد کا شکار نہ ہو۔ شراب مرد کے نزدیک متبادل ترجیح کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ وہ عورت کا متبادل تو ہے مگر عورت نہیں جب کہ ایک مہربان عورت کے ہوتے ہوئے شراب کی طلب اور نہ ہی کسی اور مُسکن کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ صرف عورت کا

ہونا اور اکثر اُس کے ہونے کا احساس ہی ایسی سرشاری کا باعث ہوا رہتا ہے۔ جس کے روبرو تمام متبادل ہیچ۔ لیکن اِس کے برعکس عمومی طور پر عورت کی زندگی میں شراب کا دخل نہ ہونے کے برابر چلا آتا ہے۔ نہ تو وہ اُس کے لیے کبھی مطلوب مرد کا متبادل بن سکی اور نہ ہی اُس کی ضرورت۔ چاہے مرد کے ہوتے ہوئے یا نہ ہوتے ہوئے۔ تو کیا عورت کی زندگی میں کسی خاص مرد کا نہ ہونا یا مرد کی طرف سے مسترد کیا جانا وہ خلا پیدا نہیں کرتا کہ جہاں اُسے کسی مرد جیسے متبادل مُسکن یا شراب کا وجود لازمی چاہیے؟ کیا شراب صرف مطلوب عورت کا متبادل ہے، کسی مطلوب مرد کا نہیں؟

اگر یہ سب کچھ ایسا ہی ہے تو پھر عورت کے ہاں مطلوب مرد کا متبادل کیا ہے؟ جان کو کئی بار خیال آیا کہ عورت کے ہاں مطلوب مرد کا متبادل تو صرف مرد ہی ہے چاہے وہ اُس کے نطفے کی حالت ہی میں کیوں نا ہو۔ بس ایک بار کسی نر کا نطفہ کسی مادہ کی کوکھ میں اپنی جڑ پکڑ لے پھر اُس مادہ کو کسی نر کی حاجت باقی نہیں رہتی، نہ کسی اصل کی اور نہ ہی متبادل کی۔ مرد کے نطفے کو اپنی رحم میں پھلنے پھولنے کی اجازت دے کر عورت اپنے تئیں کائنات کی تخلیقی سچائی سے جڑت جوڑ کر مرد جیسے مہمان کردار سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ غور کریں تو کائنات کے اسٹیج پر نسلوں کے تخلیقی تسلسل نام کے کھیل میں مرد کا کردار مہمان اداکار جیسا بنا دیا گیا ہے۔ جس کی ضرورت عورت صرف اُس وقت ہی محسوس کرتی ہے کہ جب تک اُسے پھر سے حاملہ ہونے کی طلب نہ ہو یا جب تک اُسے اپنے بچے کی معاشی اور معاشرتی چوکیداری کے واسطے کوئی چوکیدار چاہیے ہو۔ درمیان کے دورانیے میں اُس مرد سے قربت کا تصور بھی اُس عورت کے واسطے ایذا ہی ایذا اور عذاب ہی عذاب بن کر رہ جاتا ہے۔

ایما اور جان کے تعلقات میں کسی بھی قسم کے متبادلات کا گماں نہ تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی زندگی میں متبادلات کی صورت ہی دخیل ہوئے تھے لہٰذا اُن کے مابین شوہر بیوی کا رشتہ چلے نہ چلے عورت مرد کا رشتہ بہر صورت چلنے والا تھا۔ جان کو اِس رشتے کی خوب صورتی اور پائیداری کا احساس ہو نہ ہو مگر ایما کو بخوبی تھا اور وہ اِسے راسخ کرنے کے ساتھ ساتھ اچھے سے نبھانا بھی جانتی تھی۔ کیونکہ بقا کی جہد اور موزونیت کی بقا کے اصولوں کا فہم مرد سے زیادہ عورت کی جبلیاتی بُنت میں مضمر ہوتا ہے۔

آج ایما تک نہ پہنچ پانے کے امکانات اور ان سے پیدا شدہ اضمحال جان برٹن کو ایک بار پھر شراب اور تمباکو کی جانب کھینچ رہے تھے مگر وہ مسلسل مزاحمت کیے جا رہا تھا۔ اُسے کمپنی اور مقامی انتظامیہ دونوں پر غصہ آ رہا تھا کہ جو بستی آدم واہن کے سوسوا سو لوگوں سے خوف زدہ ہو کر غیر معمولی انتظامات کرنے میں لگ گئے تھے۔ اِن لوگوں کے لیے تو ایک داروغہ اور چار سپاہی کافی ہوتے ہیں مگر کمزور پڑ چکی انگریز سرکار نجانے کیوں معمولی سی صورتِ حال کو غیر معمولی بنا دیتی ہے۔ اُسے ایک برس پہلے والا اپنا موقف آج بھی یاد تھا کہ جب اُسے نظر انداز کرتے ہوئے نہ صرف کمپنی بلکہ مقامی انتظامیہ نے بھی غیر ضروری اہمیت دی اور اُسے لٹکائے رکھا۔ نتیجہ وہی نکلا کہ جو وہ کہا کرتا تھا۔ بستی میں سے تو کسی نے چوں تک نہ کی لیکن کمپنی کا جتنا نقصان نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہو کر رہا۔

اتنے میں جان کو احساس ہوا کہ کسی نے خیمے کے باہر رکھی مدھم آواز والی اطلاعی گھنٹی پر ہاتھ رکھا ہے۔ جان نے بے دھیانی میں اندر آنے کا تو کہہ دیا لیکن خود غنودہ سا ہو گیا۔ اندر آنے والے شخص نے کچھ دیر تو اُس کے اونگھ سے باہر آنے کا انتظار کیا لیکن اُس کی طوالت دیکھتے ہوئے دبے قدموں باہر جانے ہی لگا تھا کہ جان کی آنکھ کھل گئی۔ سامنے اُس کا بیٹا ولیم تھا۔ ایما سے اُس کی شادی کی خبر اُڑنے کے بعد وہ پہلی بار اُس کے سائٹ آفس کے خیمے میں آیا تھا ورنہ مُلاقات بھی ہوتی، آمنا سامنا بھی ہوتا مگر کچھ اِس قسم کا جس کے سامنے اجنبیت بھی شرمندہ ہو رہی ہے۔ اِس قسم کا آمنا سامنا لمحاتی ہوتا تو دونوں کی آنکھیں جھکی رہتیں مگر جوں ہی ایک آدھ بار ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنا پڑ جاتا تو ولیم کی آنکھوں میں سوائے شکوے اور جان برٹن کی آنکھوں میں تمام تر تاویلات کے باوجود سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہ ہوتا۔ اب یوں بیٹے کو خیمے میں آیا ہوا دیکھا تو وہ کرسی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

ولیم بھی اُس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اُس سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن جان برٹن نے اس طرح سر جھکایا ہوا تھا جیسے ابھی اونگھ کے خمار سے باہر نہیں آ سکا۔ ولیم چند لمحے تو خاموش رہا مگر پھر ایک عرصے کے بعد ڈھیلے ڈھالے انداز میں بول ہی پڑا۔ ''ڈیڈی! مجھے آپ

سے کچھ کہنا ہے۔''

جان نے سر اُٹھا کر اُس کی طرف یوں دیکھا کہ جیسے پوچھ رہا ہو کیا کہنا ہے؟

''ڈیڈی آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کو کمپنی سے نکالے جانے کی سازش حتمی مرحلے میں داخل ہو چکی ہے؟'' ولیم نے جھجکتے ہوئے آخر بات مکمل کر ہی لی۔

''یہ بات تو پرانی ہو چکی..... اب پھر سے کون کر رہا ہے یہ سازش؟''

''یہ بات کبھی پرانی نہیں ہوئی.... آپ کو اپنے پروفیشن کے ساتھ ساتھ، پروفیشن میں بقا کی فکر بھی کرنی چاہیے... صرف کیمپ میں بیٹھ کر نہیں، اِدھر اُدھر دیکھ کر بھی، اندازہ گیری کے ذریعے۔''

بیٹے کی بات میں چھپے طنز کو محسوس کر کے جان کو عجیب سا لگا۔ اُس نے غور سے دیکھا تو ولیم کا سر جھکا ہوا تھا۔ اُسے ولیم کا بچپن یاد آ گیا۔ صبح اُس کے اسکول جاتے وقت جب دونوں میاں بیوی میں بک بک کا مارننگ سیشن اپنے عروج پر ہوتا تو وہ اسکول جانے کے بجائے یوں ہی سر جھکا کر کنفیوزڈ حالت میں باہر کے دروازے کے ساتھ بنی ہوئی اینٹوں کی منڈیر پر بیٹھ جایا کرتا تھا اور یوں ہر روز اسکول کا وقت نکل جایا کرتا۔ جان کا دل چاہا کہ اُٹھ کر اُس کے جھکے ہوئے سر کے بالوں میں اُسی طرح اُنگلیاں پھیر کر سینے سے لگا لے مگر اُن دونوں کے بیچ آ چکی دراڑ نے جان کو ایسا کرنے کی خواہش سے بھی روک لیا۔

''میری اندازہ گیری کی صلاحیت کو کچھ نہیں ہوا.... میں اب بھی وہی جان برنٹن ہوں کہ جس کی حیثیت ریلوے ٹریک کی انجینئرنگ میں ایک فرد کی نہیں بلکہ ادارے کی سی ہے.... اب اگر اپنے ہی کسی سازش کا حصہ بننے کے لیے سازش کے جواز گھڑیں تو کیا کہا جا سکتا ہے۔''

''سازش کے لیے جواز گھڑے نہیں جاتے کچھ نہ کچھ پہلے سے موجود ہوتے ہیں جنہیں ہوا دی جاتی ہے اور ڈیڈی معافی چاہتا ہوں... اب آپ ادارہ نہیں رہے بلکہ کہا جا رہا ہے کہ آپ ادارے کے لیے خطرہ بن چکے ہیں۔''

''کوئی نہیں کہہ رہا.... جانتا ہوں کہ تم کہہ رہے ہو اور کیوں کہہ رہے ہو یہ بھی۔'' جان

اچانک کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ولیم کی جانب پشت کر لی۔ اُسے دیکھ کر ولیم نے بھی کرسی چھوڑ دی۔

''ڈیڈی! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بستی سے لوگ اپنے آپ ہی برج بنانے والی سائٹ پر جمع ہونے آرہے ہیں؟''

''اور کیا.... کیا وہ میرے خلاف اکٹھے کیے جا رہے ہیں؟''

''جی وہ آپ کے خلاف وہاں لے آئے جا رہے ہیں.... بظاہر وہ آپ کو ٹارگٹ نہیں کریں گے لیکن حقیقت میں وہ آپ ہی کو ٹارگٹ کریں گے۔''

''او یو شٹ اَپ.... جیسے مجھے اپنا پروجیکٹ ڈیزائن کرنا آتا ہے ویسے ہی اُسے سنبھالنا اور مکمل کرنا بھی آتا ہے.... اگر تم مجھ پر کوئی مہربانی کر سکتے ہو تو اتنا ضرور کر لو کہ میرے مخالفین کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا بند کر دو اور بس!!''.... یوں لگ رہا تھا کہ جان برنٹن غصے میں اپنے حواس پر قابو رکھنا ایک بار پھر بھول چکا ہے لیکن ولیم کے لیے جان کا یہ رویہ کچھ نیا نہیں تھا۔

''بہر حال ڈیڈی.... اپنا خیال رکھیے گا۔'' ولیم نے یہ کہتے ہوئے ایک عجیب سی نگاہ اپنے باپ پر ڈالی، ایسی نگاہ کہ جس میں اگر پیار اور غصہ نمایاں تھے تو تاسف اور کئی قسم کے شکوے بھی چھپائے نہیں چھپ رہے تھے۔ ایک اور جھلک اِس دیکھنے میں ناکامی اور جھنجلاہٹ کی تھی تو بے بسی بھی بخوبی دیکھی جا سکتی تھی۔ ولیم کے نزدیک وہاں کچھ دیر اور ٹھہرنا شاید نامناسب تھا اِس لیے باپ کو گڈ بائی کہا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔ جان نے اُس کی طرف اگرچہ آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا مگر پھر بھی نجانے کیوں اُسے ولیم کا اِس طرح دیکھنا، نہ صرف سر سے پاؤں تک محسوس ہوا بلکہ اُس پر پیار بھی آیا اور اچھا بھی لگا۔ وہ ولیم کو کچھ دیر اور اپنے پاس روکنا چاہتا تھا، اُس سے جھگڑنا چاہتا تھا، اُسے اپنے اندر بھرا ہوا وہ سب کچھ اُسی طرح سنانا چاہتا تھا کہ جیسے اُس کی ماں مَیری کو سنا کر ہلکا پھلکا ہو جایا کرتا تھا مگر ولیم نے تو آج اُسے یہ موقع بھی نہیں دیا کہ اُس سے جھگڑ کر وہ اپنا غصہ باہر نکال سکے کہ جو ایما سے شادی کے بعد اُس کی اجنبیت سے در آیا تھا۔ وہ شاید سیانا ہو گیا تھا۔

جان نے غصہ اُترنے کے بعد ولیم کی باتوں پر غور کرنا شروع کیا تو وہ اُسے اتنی بھی غیر

ضروری نہ لگیں۔ کچھ دیر اور گزری تو یہی باتیں ضروری سے زیادہ متعلقہ اور پھر متعلقہ سے زیادہ سچ لگنے لگیں۔ اُس کے اندر دبا ہوا خوف کپکپی بن کر آہستہ آہستہ باہر نکلنا شروع ہو چکا تھا۔ جان نے اپنے آپ کو سنبھالا دینے کے لیے بے دھیانی میں الماری کے پَٹ کھولے اور شیواز کی بوتل ڈھونڈنے لگا مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ شراب نہ سگار۔ پھر خیال آیا کہ وہ سب کچھ تو ایما نے شادی کے بعد وہاں سے اُٹھوا لیا تھا۔ بے چینی حد سے بڑھی تو وہ بائی ناکولر اُٹھائے خیمے سے باہر نکل آیا اور دریا کے شمالی کنارے کی طرف دیکھنے لگا جہاں لوگوں کی ایک لمبی قطار بستی سے سوکھے ہوئے دریا کی جانب رواں تھی۔ اُس نے اِدھر جنوبی کنارے پر موجود سیکورٹی فورس کو دیکھا۔ یہ اگرچہ مسلح تھی مگر تعداد میں بستی والوں کا عشرِ عشیر بھی نہ تھی۔ جان برٹن ایک دم اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگا۔ اُسے لگا کہ یہ سارے لوگ محض اُسے کمپنی سے نکلوانے کے لیے آ رہے ہیں اِسی لیے تو اِدھر موجود سیکورٹی فورس اُن کے خلاف کوئی قدم بھی نہیں اُٹھا رہی تھی۔ وہ تیزی سے اپنے خیمے میں آیا اور میز پر لگی ہوئی چھوٹی سی ٹیلی گراف مشین کو ایک مخصوص انداز میں کھٹکھٹانے لگا مگر دوسری طرف سے کوئی متوجہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ہیڈ آفس کو کچھ بتانا چاہتا تھا، مقامی انتظامیہ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا کہ جیسے وہ سب بھی اُس کے خلاف ہونے والی سازش میں شریک ہو چکے تھے۔

# ۲۷

پرانے قبرستان میں چالیس درویشوں کے گرد گھیرا ڈال کر انگریز سرکار کے خلاف نعرے لگانے والے مجمع میں موجود منگر نے اچانک اپنے عقب میں کسی ایسے گھوڑے کے زور سے ہنہنانے کی آواز سُنی کہ جسے دوڑتے ہوئے ایک دم روک لیا گیا ہو۔ اُس نے گردن فوراً پیچھے گھمائی تو کیا دیکھتا ہے کہ گھڑ سوار داروغہ اپنے جاہ و جلال کے بجائے پریشان صورت لیے مجمع میں کسی کو تلاش کرنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔ اُس کے پیچھے دو گھوڑوں پر سوار سپاہی بھی اُسی انداز میں کچھ دور رہ کر مجمع کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر پریشانی کے ساتھ ساتھ خوف کی پرچھائیاں بھی صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔ منگر نے بلا سبب نگاہیں چرا کر اپنے آپ کو دوبارہ ہجوم کا حصہ بنانے کی کوشش کی مگر ایسا کرتے ہوئے اُس کی نگاہیں داروغہ سے چار ہو ہی گئیں۔ اُسے دیکھتے ہی داروغہ کے چہرے پر کچھ اِس قسم کے تاثرات ابھرے کہ جیسے وہ منگر ہی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ چنانچہ اب کے گھبرانے کی باری منگر کی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ داروغہ اُس کی تلاش میں کیوں ہے؟ اُس نے ایسا کوئی غلط کام بھی نہیں کیا تھا کہ جس پر اُس کی پکڑ ہوتی اور جو معاملے ماضی کے تھے وہ انہیں پہلے ہی بھگت چکا تھا۔

منگر اپنے سے آگے والی قطار میں گھسنے کی کوشش میں کنکھیوں سے مسلسل داروغہ کو تکے جا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ اپنے عقب میں موجود سپاہیوں کو اشارہ کیے جا رہا ہے کہ وہ اُسے پکڑ

لیس لیکن وہ دونوں ہچکچا رہے تھے۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ پورا پورا امکان تھا کہ انگریز سرکار کے خلاف ہونے والے مظاہرے کے ہجوم میں اگر کوئی ایک دو سپاہی کسی کو پکڑنے کے لیے گھسیں گے تو شاید اُن کی بوٹیاں بھی کسی کو نہ ملیں۔ نہ تو ہجوم کا بے قابو ہو جانا کسی کی تدبیر میں اور نہ ہی اُسے قابو میں لانا کسی کے اختیار میں۔ سپاہیوں کی ہچکچاہٹ منگر کو غنیمت لگی اور وہ اِس کا فائدہ اُٹھا کر ہجوم میں گھستا چلا گیا اور ایسی جگہ جا پہنچا کہ جہاں سے نہ اُسے داروغہ دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی اب اُس کی گرفت میں آنے کا کوئی امکان باقی رہا تھا۔ اب اگر گھسنے کا سوچے گا بھی تو مارا جائے گا۔ لیکن پریشانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مولوی جاراللہ اور دوسرے لوگوں کے قتل کے بعد داروغہ نے لازمی طور پر بہت زیادہ فورس منگوا رکھی ہوگی جس کے آنے کے بعد ہجوم کا اِس طور جمے رہنا مشکل تو کیا ناممکن ہو جائے گا۔

تو کیا بڑی فورس کے آنے سے پہلے اُسے یہاں سے بچ بچا کر نکل جانا چاہیے؟ لیکن وہ کہاں جائے گا؟ جہاں بھی جائے گا وہ داروغہ یا انگریز فورس سے دور تو نہیں ہوگا۔ لیکن وہ اُسے کیوں پکڑنا چاہتے ہیں؟ یہ سوال ایک بار پھر اُس کے ذہن میں اُبھرا۔ منگر نے ہجوم کے درمیان کھڑے کھڑے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی یاداشت کو دماغ ہی دماغ میں پیچھے کی طرف گھمانے لگا۔ دور کی بات تو ایک ہی تھی کہ جب وہ مولوی صاحب اور سنگری کی شادی میں آڑے آیا تھا لیکن اُس کی تو سزا بھی بھگت چکا۔ کہیں داروغہ کو آج کی بات پر تو اعتراض نہیں؟ لیکن اُسے کیوں ہوگا اعتراض آگ کے شعلوں میں گھیر کر ممکنہ طور پر ماری جانے والی ایک عورت اور اُس کے بچے کو زندہ بچانے لینے پر؟ اگر آج وہ بروقت مولوی صاحب کے چھوٹے زنان خانے نہ پہنچتا تو مشتعل ہجوم سنگری اور اُس کے چھوٹے سے بچے کو بھی قتل کر چکا ہوتا۔ سنگری بھی عجیب پاگل عورت تھی، شعلوں میں گھر جانے اور گھر پر پتھروں کی برسات کے باوجود وہ گھر سے باہر نکلنے کو تیار نہیں تھی۔ اُس نے لاکھ ترلے کر لیے مگر وہ تو اِسی بات پر بضد تھی کہ مولوی صاحب کا گھر کسی صورت نہیں چھوڑنا۔ اُس نے یہاں تک بتا دیا کہ غصے سے بھرے ہوئے لوگوں نے مولوی صاحب کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا ہے اور اب وہ اُن کے بڑے زنان خانے میں گھس کر سب کو مار رہے ہیں مگر اِس

کے باوجود سنگری اُس کی کسی بات کو ماننے کو تیار نہیں تھی۔ وہ شاید یہی سمجھ رہی تھی کہ اُس کے ساتھ ایک بار پھر چالاکی کی جارہی ہے۔ اتنے میں باہر کسی نے آواز دی کہ جلدی پہنچو اور پہلے مولوی کے چھوٹے زنان خانے سے نمٹ لو۔ اب شاید کہیں جا کر سنگری کو احساس ہوا کہ گھر سے باہر کے حالات وہی ہو چکے ہیں جو منگر بتا رہا ہے۔ لیکن اُسے یقین پھر بھی نہیں ہو رہا تھا کہ مولوی جارُاللہ جیسے بااثر اور بااختیار شخص کے ساتھ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

اِس سے پہلے کہ سنگری مزید تاخیر کرتی منگر نے اُسے بچے سمیت اُٹھا کر گھوڑے پر ڈالا اور آگ کے شعلوں کے درمیان میں سے نکالتا ہوا جوں ہی بیرونی دروازے تک پہنچا تو غیض و غضب سے کھولتے لوگوں کا ایک جتھا زنان خانے میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا۔ سنگری نے مولوی صاحب کے خلاف نفرت سے بھرپور نعرے سنے تو اُسے اپنے حواس مجتمع کرنے مشکل ہو گئے۔ مولوی جارُاللہ کے سامنے سَر نہ اُٹھانے والے لوگوں کا یہ روپ دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جب کہ منگر اُنہیں دیکھتے ہی کچھ اِس انداز میں پرجوش ہوا کہ ایک ہی زقند میں گھوڑے پر سوار ہو کر اُن دونوں کو چیختے چلاتے لوگوں کے سامنے سے نکال کر بحفاظت بھگا تو لے گیا مگر مسئلہ پھر بھی وہی درپیش کہ سنگری کو اُس کے بچے سمیت کہاں لے جایا جائے؟ کیونکہ اِس صورتِ حال کے بارے میں تو اُس نے سوچا تک نہ تھا اور معاملہ جو فوری درپیش تھا وہ انہیں اُن کے گھر سے زندہ نکالنے کا تھا۔ اب اگر وہ سنگری اور اُس کے بچے کو اُس کی ماں ملوکاں کے پاس لے جاتا تو عین ممکن تھا کہ مشتعل لوگ وہاں آ کر بھی اُن کو نقصان پہنچا سکتے تھے اور اگر اُنہیں وہ اپنے گھر لے جاتا تو جہاں لوگوں کے وہاں آنے کا امکان تھا وہاں یہ بھی تو ممکن تھا کہ سنگری جیسی خود سَر عورت جانے ہی سے انکار کر دے۔ اِن سوالوں میں اُلجھے ہوئے منگر کو پتا بھی نہ چلا کہ کب اُس کا گھوڑا ملوکاں کے گھر والی گلی میں داخل ہوا لیکن جب ایسا ہونے کا احساس ہوا وہ ملوکاں کے گھر کے سامنے تھا۔ اِسی کو مقدر جان کر وہ گھوڑے سے اُترا اور اُس کی باگ پکڑ کر گھر کے اندر لے گیا۔

بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سُن کر ملوکاں کوٹھے سے نکلی تو باہر کا منظر اُس کے لیے بھی ناقابلِ یقین تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی سنگری کا بچہ پیدا ہونے کے بعد بھی ایک دن یوں منگر

اُسے مولوی کے گھر سے اُٹھالے آئے گا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنا منہ سر پیٹے یا منگر کو اُس کی جواں مردی پر تھپکی دے کہ جواب تک اپنی خواہش بھولا نہیں تھا۔ ملوکاں کو خوف بھی تھا کہ اُن کا پیچھا کرتے ہوئے اگر مولوی جاراللہ وہاں آن پہنچا تو اُن سب کو برباد کر کے رکھ دے گا۔ اِس دوران منگر نے اگرچہ سنگری اور اُس کے بیٹے کو گھوڑے سے اُتار لیا تھا مگر کچھ دیر پہلے والی اکھڑ اور سرگراں سنگری میں اتنی جان بھی نہیں رہی تھی کہ کچھ بول پاتی۔ وہ تو خوف اور بے یقینی کے ہاتھوں بالکل ہی نچڑ چکی تھی۔ ایک بہت بڑی اور بااثر شخصیت کے گھر میں بحفاظت ہونے کا غیر متزلزل یقین محض چند لمحوں میں اِس قدر تیزی سے متزلزل ہوا کہ اُس کے حواس ابھی تک بحال نہیں ہو پا رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ابھی تک اُس کی جانب لپکتے ہوئے جنونی چہرے تھے کہ جن کے بیچوں بیچ منگر اُنہیں نکال کر یہاں تک لایا تھا۔ اُس ضدی عورت کو دُکھ تو اِس بات کا بھی تھا کہ اُسے مشتعل ہجوم سے بچالانے والا یہ فرشتہ منگر ہی کیوں تھا، کوئی اور کیوں نہیں؟

اُدھر ملوکاں یہ سمجھ رہی تھی کہ منگر نے شاید سنگری کو مولوی کے گھر سے زبردستی اُٹھایا ہے اور پھر اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد اُن دونوں کو وہاں اُس کے پاس لے کر آ گیا ہے۔ تبھی تو اُس کے تیور بدل گئے۔ اُس کا پہلا سوال ہی یہی تھا کہ وہ حرام پُناں کر کے اُنہیں وہاں لے کر کیوں آ گیا ہے؟ کہیں اور دفعان کیوں نہیں ہوا۔ ایسے میں کہ جب سنگری دہشت کے مارے ایک لفظ بھی نہیں بول پا رہی تھی، ملوکاں کو ساری صورتِ حال سمجھانا منگر کے واسطے عذاب بن کر رہ گیا۔ اُسے بھی مولوی صاحب کے دردناک انجام کے بارے میں بڑی مشکل سے یقین دلایا گیا لیکن اُس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ یقین دلائے جانے کے باوجود اُسے یقین نہیں تھا۔ ناممکنات میں سے لگتا تھا کہ وہ شخص جو نصف صدی سے زائد تک بستی کے سیاہ و سفید کا پورے طمطراق کے ساتھ مالک رہے اور پھر یوں چیونٹی کی طرح مسل دیا جائے۔

حالات کی جو صورت ہو چکی تھی اُس میں منگر کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اُن کو اِس کا یقین دلانا نہیں بلکہ اُن سب کو کسی محفوظ جگہ تک پہنچانا تھا۔ منگر کی چھٹی حس اُسے مسلسل آگاہ کیے جا رہی تھی لوگوں کا وہ مشتعل جتھا ابھی کے ابھی وہاں پہنچا سو پہنچا۔ اِس گھر کا تو محلِ وقوع ہی ایسا تھا کہ

ایک بار گھر جانے کی صورت میں وہاں سے بچ نکلنا تقریباً ناممکن۔ لیکن وہ اِن کو لے کر جائے تو کہاں جائے۔ اُس کا اپنا گھر بھی غیر محفوظ کیونکہ اگر مشتعل لوگوں نے مولوی جاراُللہ کی جَد مٹانے کا تہیہ کر رکھا ہے تو وہ اُس کے گھر تک بھی ضرور پہنچیں گے۔ دفعتاً اُسے ایک ایسی جگہ کا خیال آیا کہ جہاں زیرک سے زیرک آدمی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ ہجوم اگر بپھرا ہوا ہو تو ہوش سے نہیں بلکہ جوش سے کام لیتا ہے اور جوش میں وہاں تک کی ٹوہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ جہاں وہ انہیں لے جانا چاہتا تھا۔

منزل کے تعین کے بعد منگر نے سنگری کو گھوڑے پر بیٹھنے کو کہا تو اُس نے ایک بار پھر اُسے انکار کر دیا لیکن اب کے ہوش مندی میں نہیں بلکہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے۔ منگر نے اُسے پھر سے منت کے انداز میں کہا کہ مولوی کو مارنے والے لوگ اُسے مارنے کے لیے کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتے ہیں لہٰذا جتنی جلدی ممکن ہو وہاں سے نکلا جائے۔ لیکن سنگری نے اُسی طرح کھوئے کھوئے لہجے میں اب کے قطعی انکار کر دیا اور بچے کو سینے سے لگائے ہوئے ماں کے کندھے سے چمٹ گئی۔ سنگری کو یوں گریزاں دیکھا تو ملوکاں نے بھی منگر کو ڈانٹ دیا کہ وہ سنگری کی مرضی کے خلاف اُسے کہیں بھی لے جانے سے باز رہے۔ منگر تو ملوکاں کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن اُس کا یہ رویہ دیکھ کر کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیسے اُن کو کسی محفوظ جگہ پہنچائے؟ اُن کے رویہ کا سبب بھی منگر جانتا تھا کہ شاید انہیں مولوی کے قتل اور اُس کے محرکات کا ابھی تک پکا یقین نہیں آ سکا تھا۔ اُس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی کہ انہوں نے جو کچھ سُنا وہ منگر کی زبانی سُنا جس کی غیر جانب داری پر اُس کے ماضی کے سبب بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ منگر کو اپنے آپ سے اور اپنے خلوص سے شرمندگی ہو رہی تھی۔ کیوں خوار کر رہا تھا وہ اپنے آپ کو ایک ایسی عورت کے لیے جسے نہ تو اپنی بھلائی عزیز ہے اور نہ ہی خیر خواہی بلکہ ایک عرصے سے وہ اِس کے حصے میں سوائے ذلت اور دل شکنی کے اور کچھ نہیں ڈال رہی۔ کیا فائدہ اپنے آپ کو ایک ایسی عورت کے لیے خطرے میں ڈالنے کا کہ جو نہ تو کبھی اُس کی ہو سکتی ہے اور نہ ہی اُس کے جذبات کا احساس کر سکتی ہے۔ کیا تماشا اور کیسی بدقسمتی ہے کہ جس عورت کو وہ اپنی جان کی قیمت پر بچانا چاہ رہا تھا، اُسے نہ تو اُس کا اعتبار تھا

اور نہ ہی اُن مصیبتوں کا ادراک جو اُس کے سر پر کھڑی تھیں۔ منگر روہانسا ہو گیا۔ اُس کا دل چاہا کہ خود یہاں سے جان بچا کر بھاگ نکلے باقی اِن کے ساتھ جو ہوتا ہے وہ ہوتا رہے۔ وہ کب تک اُن کے ترلے لیتا رہے گا۔

منگر کا دل بھر آیا تو آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ اُس نے گھوڑے کی باگ پکڑی اور آخری بار گردن گھما کر سنگری کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں بے اعتنائی پھیلی ہوئی تھی جب کہ ملوکاں کے دیکھنے کے انداز میں بھی اجنبیت سے زیادہ شبہات تھے، بے اعتباری تھی جیسے وہ انہیں اپنے مفاد کے واسطے کسی ایسی جگہ لے جانا چاہتا ہے جہاں من مانی کر سکے۔ منگر گھوڑے کو ابھی دروازے سے باہر نکال ہی رہا تھا کہ سکندرے کی ماں پَیر ِوحواس باختہ ننگے سَر ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے ملوکاں کے گھر میں داخل ہوئی۔ اگر چہ اُسے ضعفِ بینائی کے سبب کم بھی دکھائی دیتا تھا لیکن وہ اِس قدر بوکھلائی ہوئی تھی کہ اُس کی نگاہ نہ تو منگر پر پڑی اور نہ ہی گھوڑے پر بلکہ وہ سیدھی ملوکاں کی طرف لپکی اور چیختے ہوئے اُسے بتایا کہ اُس کے داماد مولوی صاحب کو لوگوں نے قتل کر دیا ہے اور اب وہ اُس کے گھروں کو جلا رہے ہیں، گھر والوں کو بھی مار رہے ہیں، لہٰذا وہ بھی جائے اور جا کر اپنی بیٹی کو بچائے لیکن جوں ہی اُس کی نگاہ سنگری پر پڑی وہ پریشان ہو گئی کہ سنگری وہاں پر کیسے آ گئی؟ اِس سے پہلے ملوکاں یا سنگری کوئی جواب دیتے وہ پھر چیخی کہ وہ نکلیں، گھر سے نکلیں اور جان بچائیں کیونکہ لوگوں کا ہجوم اِدھر ہی آ رہا تھا۔

منگر دروازے سے باہر نکل کر گھوڑے پر بیٹھ چکا تھا جب ملوکاں ایک ہاتھ سے سنگری کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے تیزی باہر نکلی اور اُس کے گھوڑے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر بے پناہ خوف، انتہائی بے بسی، لاچاری اور مظلومیت چھائی ہوئی تھی۔ منگر نہیں جان پا رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ یہی وہ عورت تھی جو محض چند لمحے پہلے اُس کی بات سننے کو تیار نہیں تھی اور نہ ہی اُس پر اعتبار کرنے کو مگر اب اُسی کام کے لیے اُس کے سامنے ملتجی ہوئی کھڑی ہے۔ جب یہی خبر اُس نے اُسے سنائی تو اُس نے یقین نہیں کیا مگر جب وہی بات ایک اور عورت نے آ کر سنائی تو وہ دنیا کا سب سے بڑا سچ ہو گئی۔ تو کیا ایسی عورت کے لیے وہ اپنی جان خطرے میں ڈالے؟ منگر نے

اُس کے پیچھے کھڑی ہوئی سنگری کی طرف دیکھا تو اُس کے چہرے پر بھی بے چارگی ہی بے چارگی تھی اور آنکھوں میں التجا کہ کسی طرح اُن کی جان بچالی جائے۔

کیسی عورتیں ہیں یہ کہ جن کے نزدیک ہر پل نیا رنگ بدلنا کچھ مسئلہ ہی نہیں۔ اُنہیں اِس کا احساس ہی نہیں کہ اُن کے بدلتے ہوئے رویوں سے اُس پر کیا گزرتی ہے کہ جو اُن سے خیر خواہی کی بے وقوفی کرنے جا رہا ہوتا ہے۔ اُسے لگا کہ سنگری اگر اپنی طبع میں ایک نا قابل اعتبار عورت ہے تو ایسا ہونا اُسے اپنی ماں سے ورثے میں ملا ہے۔ اُن دونوں کو یوں اپنے سامنے مظلومیت کی تصویر بنے دیکھ کر منگر کا دل چاہا کہ گھوڑے کو ایڑ لگائے اور یہ جا وہ جا۔ اب بھاڑ میں جائیں دونوں ماں بیٹیاں اُس بچے سمیت جو مولوی جاراللہ جاتے جاتے سنگری کو عطا کر گیا ہے۔ لیکن اتنے میں دور کہیں ایک بہت بڑے ہجوم کے نعرے لگانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں کہ جو بہت تیزی سے قریب آتی جا رہی تھیں۔ منگر کے پاس فیصلہ کرنے کو وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ جس طرح وہ ماں بیٹیاں اپنی طبع کے ہاتھوں اپنی آنکھوں بدلتے رہنے پر مجبور تھیں اِسی طرح منگر بھی اپنے دل کے ہاتھوں یا شاید سنگری کے مسلسل انکار کے سبب ذہن میں چبھی پھانس کے کارن وہی کچھ کرنے پر مجبور تھا کہ جو اُس سے چاہا جا رہا تھا۔

لیکن اِس کے باوجود دل شکستہ منگر اُن سے نگاہیں ملائے بغیر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اپنے بدن کے اکڑاؤ کو مارنے کے لیے اُس نے گھوڑے کی باگ کو سختی سے اپنی طرف کھینچ رکھا تھا کچھ اِس طرح کہ اُس کے پاؤں بھی رکاب پھنسے ہوئے لگ رہے تھے۔ اَب کے وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن نجانے کیسے آنکھیں چرانے کے عمل میں اُس کی نگاہیں سنگری کے چہرے پر جا پڑیں اور پھر اُس کا بُری طرح اکڑا ہوا بدن ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔ اگلے لمحے وہ سب اُس کے گھوڑے پر سوار تھے اور دروازے میں کھڑی پیڑو مائی نا قابل فہم الفاظ میں چیخ چلائے چلی جا رہی تھی جنہیں اُن میں سے کوئی سمجھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

اُن سب کو ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچانے کے بعد منگر نے اپنا گھوڑا ایک سنگتی کے گھر چھوڑا اور خود ہر ممکن عجلت میں مولوی جاراللہ کے گھر کے قریب جا پہنچا تا کہ مشتعل ہجوم میں گھل

مِل کر نہ صرف ہو چکی وارداتوں کی ٹوہ لگا سکے بلکہ اُن کے آئندہ کے ارادوں کو بھی جان سکے کیونکہ وہ اُس وقت وہاں سے سنگری کی جان بچانے بھاگا تھا کہ جب فسادیے مولوی صاحب کے قتل کے بعد اپنا اگلا شکار ڈھونڈنے کی جستجو میں تھے۔ لیکن اب وہ بپھرا ہوا مجمع جو کچھ دیر پہلے مولوی جارُاللہ کے اِدھر اُدھر چھپے ہوئے اہل خانہ کو چُن چُن کر مارنے کے درپے تھا، پوری طرح بکھر چکا تھا۔ مولوی صاحب کے قتل میں پیش پیش رہنے والے لوگ وہاں سے واپس جا کر پُرانے قبرستان میں چالیس درویشوں کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں میں اِس طرح شامل ہو چکے تھے کہ جیسے وہاں سے کبھی اُٹھے بھی نہ ہوں۔ وہ جتھے جو مولوی صاحب کے خاندان کے افراد کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر مارنے نکلے ہوئے تھے، واپس بلائے جا چکے تھے۔ اگرچہ یہ بات پوری طرح پھیل چکی تھی کہ مولوی جارُاللہ اور کچھ دوسرے لوگ بے گناہ قتل ہوئے تھے لیکن قاتلوں سمیت کسی کے چہرے پر بھی تاسف یا شرمندگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ منگر حیرت زدہ تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو ایک پل میں وحشی جانور اور دوسرے پل میں اپنی مظلومیت کی دہائی دیتے بے چارگی کی تصویر بن جاتے ہیں۔ مشتعل ہجوم میں شامل لوگوں کی اکثریت دیکھتے ہی دیکھتے اب پھر سے لاچاری کی بُکل مارے سات شہیدوں کی قبروں کی بے حرمتی کے خلاف آہ و بکا کرتے چالیس درویشوں کے گرد حلقے پر حلقے بناتے چلے جا رہے تھے۔ منگر آخری حلقے سے پہلے والے میں موجود تو تھا لیکن اُس کی روح یہاں سے پرے سنگری کے ہاں بھٹک رہی تھی۔ وہ ہر ممکن طور پر اُس کے ہاں جلدی سے جلدی پہنچنا چاہتا تھا، اُسے تسلی دینا چاہتا تھا، پرسہ دینا چاہتا تھا مگر جب تک غارت گری کے امکانات ٹل نہیں جاتے وہ وہاں جا نہیں سکتا تھا ورنہ سارا بھانڈا پھوٹ جاتا، بھانڈا کیا پھوٹتا زندگی کے لالے پڑ جاتے۔ لیکن منگر کو یہیں معلوم ہوا کہ فسادات میں ایک شخص نے مرنے سے پہلے اُگل دیا تھا کہ سات شہیدوں کی قبروں کو مولوی صاحب نے نہیں بلکہ انگریزوں کی ریلوے کمپنی کے افسروں نے مسمار کرایا اور اُن کے جسدِ خاکی یہاں سے نکلوا کر دریا کنارے اُس جگہ دفن کرا دیا کہ جہاں پُل بنانے کے واسطے دریا کا رخ موڑا گیا تھا لیکن ظلم یہ کیا گیا کہ نئی جگہ پر قبروں کو بے نام و نشاں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس لیے اب کوئی نہیں جانتا تھا کہ قبریں ہیں کہاں؟

منگر کے لیے یہ خبر اِس قدر مسرت افزا تھی کہ اُس کا دل بے اختیار جھمر ڈالنے کو کر رہا تھا۔ مگر یہ سوچ کر ڈر بھی رہا تھا کہ اگر کسی نے اُس کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کی رمق بھی دیکھ لی تو بے موت مارا جائے گا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اُسے سات شہیدوں کی قبریں بستی کے قبرستان میں ہونے یا نہ ہونے کی کوئی فکر نہیں تھی اُسے خوشی تھی تو اِس بات کی کہ بیٹھے بٹھائے سنگری کی نہ صرف مولوی صاحب سے جان چھوٹ گئی بلکہ اُس سے تعلق کی وجہ سے جو خطرہ جان کو پیدا ہو چلا تھا، وہ بھی ختم ہو چکا۔ اب وہ آزاد تھے اور منگر کو یقین تھا کہ سنگری اب اور کہیں نہیں جانے والی، اُس کا پہلا اور آخری انتخاب منگر کے علاوہ کون ہو سکتا تھا؟

اتنے میں منگر نے اچانک اپنے عقب میں کسی ایسے گھوڑے کے زور سے ہنہنانے کی آواز سُنی کہ جسے دوڑتے ہوئے ایک دم روک لیا گیا ہو۔ اُس نے گردن فوراً پیچھے گھمائی تو کیا دیکھتا ہے کہ گھڑسوار داروغہ اپنے جاہ و جلال کے بجائے پریشان صورت لیے مجمع میں کسی کو تلاش کرنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔



# ۲۸

داروغہ عجیب مخمصے میں گھر کر رہ گیا تھا۔ منگر اُس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا اور وہ اُس کا کچھ نہیں بگاڑ پا رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر جس طرح منگر نے اپنے آپ کو ہجوم میں چھپانے کی کوشش کی اُس سے صاف ظاہر تھا کہ سنگری کی گم شدگی میں ضرور اُسی کا ہاتھ ہے۔ اگر اُس کا دامن صاف ہوتا تو وہ کیوں یوں اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا؟ اُسے رہ رہ کر اپنے سپاہیوں پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ جو اُس کے حکم کے باوجود منگر کو پکڑنے کے واسطے ہجوم کی طرف بڑھنے کے بجائے ہچکچاتے رہے۔ منگر نے چالاک خرگوش کی طرح اِس کا فائدہ اُٹھایا اور ہجوم ہی میں کہیں آگے پیچھے ہو گیا۔ سپاہیوں کی سُستی اور حکم عدولی پر داروغہ ایک دم غصے سے پھٹ پڑا اور اُنہیں گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اتنی اونچی آواز میں اِس قسم کی گفتگو سُنی تو چالیس درویشوں کے گرد قطار اندر قطار جمع لوگوں کی آخری قطار کی اکثریت نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو انہیں انگریز سرکار کا باوردی گھڑ سوار داروغہ دو سپاہیوں کے ہمراہ مغلظات بکتا ہوا دکھائی دیا۔

ایسے میں کہ جب سینکڑوں لوگوں کے وسط میں چالیس درویش اپنے سات شہیدوں کے مزارات کی بے حرمتی پر گریہ کناں اور اُن کے مریدین اور پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد شدید حالتِ غیض و غضب میں اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہوئی تو داروغہ کی مغلظات بھری موجودگی نے کس قسم کی آگ بھڑکائی ہوگی، اُس کا اندازہ تب ہوا جب دیکھتے ہی دیکھتے غیر محسوس طریقے سے

داروغہ اور اُس کے دونوں سپاہیوں کو ہجوم نے اپنے نرغے میں لے لیا۔ دونوں سپاہیوں کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ ہجوم کی جانب سے نشانے پر رکھ لیے گئے ہیں اور اُن کا انجام مولوی جاراللہ کی طرح ہونا طے پا چکا ہے لیکن اِس کے باوجود داروغہ سنگری کی جستجو میں منگر تک پہنچنے کے لیے طیش میں اِس قدر اندھا ہو چکا تھا کہ اُس کی جانب ایک ایک قدم آگے بڑھ کر گھیرا تنگ کرتے ہوئے سینکڑوں لوگ اُسے دکھائی دینا بند ہو چکے تھے اور وہ محض سپاہیوں کو گالیاں بکے جا رہا تھا۔

داروغہ کے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں نے آخری حربے کے طور پر لحظہ بہ لحظہ تنگ ہوتے گھیرے پر نظر دوڑائی۔ اُنہیں حلقے کے جنوب مشرقی سمت میں باقی اطراف کی نسبت کم لوگ دکھائی دیے اور انہوں نے اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح ریلوے لائن سے اُٹھائے ہوئے پتھر اپنی جھولیوں میں بھی نہیں بھرے ہوئے تھے بلکہ جو کچھ اور جتنا کچھ تھا وہ ہاتھوں ہی میں تھا۔ دونوں سپاہیوں نے ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر ایک جیسا فیصلہ کیا اور گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے ٹاواں ٹاواں لوگوں پر چڑھ دوڑے تو اپنا راستہ خود بناتے ہوئے حلقے کو چیر کر باہر تو نکل گئے لیکن اُن پتھروں سے خود کو نہ بچا سکے جو ایک بوچھاڑ کی صورت اُن کا پیچھا کرتے ہوئے مسلسل برستے چلے گئے۔ نوک دار پتھروں نے جہاں گھوڑوں کو پچھواڑے اور رانوں سے لہولہان کیا وہیں سپاہیوں کو بھی زخموں سے چور کر دیا لیکن اِس کے باوجود وہ چند لمحوں ہی میں زندہ بچ کر نکل جانے میں کام یاب ہو گئے۔

اُن کے برعکس داروغہ بہت بری طرح ہجوم کی جکڑ بندی میں آ گیا۔ اُس کی طیش سے اندھی ہوئی آنکھوں سے دِکھنا شروع ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا اور وہ گھوڑے سمیت نرغے سے نکلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے اُس کے گھوڑے کو باگ سے پکڑا اور کچھ نے اُسے گھوڑے پر سے اِس طرح گھسیٹا کہ وہ منہ کے بل نیچے زمین پر آ رہا۔ بس پھر کیا تھا کچھ دانا لوگوں کے روکنے کے باوجود اُسے اِس طرح زدوکوب کیا گیا کہ سانسیں اُکھڑنے سے پہلے ہی ڈوبتی چلی گئیں۔ جسم کی ہڈیاں ٹوٹیں تو وہ گوشت کے لوتھڑوں کا ڈھیر بن گیا اور چہرہ قطعی ناقابل شناخت۔ کسی سیانے نے آواز لگائی کہ داروغے کو مار بیٹھے ہو اگر بستی کو عذاب سے بچانا ہے تو اس کی وردی

اُتار کر جلا دو تو کس کو پتا کون مرا؟

مجمع کے مشتعل نوجوانوں نے بجائے اُس کے مشورے پر کان دھرنے کے اُسی سیانے کو پکڑا اور دو چار اُلٹی سیدھی لگا کر واپس ہجوم کی طرف پٹخ دیا۔ یہ اِس امر کا اشارہ تھا کہ جو بھی اِس قسم کی صورتِ حال پیدا کرنے کی کوشش کرے گا اُس کے ساتھ کم سے کم اِسی طرح کا سلوک کیا جائے گا۔ یہ دیکھ کر پہلے تو مجمع پر چند لمحوں کے لیے سکوت طاری ہوا مگر پھر اچانک ہی ہر طرف سے انگریز سرکار کے خلاف نعرے گونجنے لگے۔ اِس دوران کچھ لوگوں نے داروغے کے کچلے ہوئے جسم کو اُسی کی وردی میں باندھا اور پھر قریبی جال کے درخت سے لٹکا دیا۔ لوتھڑا ہو چکے گوشت کے ڈھیر سے رسنے والا خون ایک دم اِکٹھا ہو کر نیچے زمین پر آن گرا۔ مولوی صاحب کے قتل کے بعد لوگوں کا ٹھنڈا ہو چکا جنون ایک بار پھر سے سر چڑھ کر بول رہا تھا اِتنا کہ گھبرا کر نرغے کے اندر دوڑتے ہوئے گھوڑے کو نرغے سے نکالنے کے بجائے تلوار نما برچھیوں سے اُس کی تونچیں کاٹ دی گئیں اور وہ زمین پر گر کر دوبارہ اُٹھنے کے لیے تڑپنے لگا۔

اتنے میں کسی اور نے آواز لگائی کہ یہاں ٹھہرے کر کیا کر رہے ہو، چالیس درویشوں کو ساتھ لو اور شہدا کی قبریں ڈھونڈنے کے لیے پورا ستلج کھود ڈالو.... کہیں تو اُن کے مزارات ہوں گے۔ ایک اور آواز اُبھری کہ آج کے دن زندہ واپسی کا ارادہ حرام ہے.... آج کا دن صرف شہادت، صرف شہادت۔ اُس کی بات ختم ہوتے ہی پورا مجمع چلانے لگا صرف شہادت.... صرف شہادت!!!

اب کے چالیس درویشوں سمیت مجمع کا رُخ ستلج کے اُوپری جانب تھا کہ جہاں پُل تعمیر کرنے کے لیے سو فٹ گہری بنیادیں بھرنے کا کام مکمل ہوا چاہتا تھا۔ آدم واہن ریلوے اسٹیشن سے اس پُل تک تعمیر ہو چکے ریلوے ٹریک نے پرانے قبرستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ہجوم اس لائن سے دوسری جانب جانے کے لیے گزرا تو یہاں پڑے ہوئے پتھروں سے اپنی جھولیاں بھر لیں۔ کچھ سر پھروں نے اس ٹریک کو اُکھاڑنے کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہے۔ اُن کے عقب میں آنے والا جتھا جو برچھیوں اور تلواروں سے لیس تھا پوری قوت سے اس ٹریک پر پل

پڑا۔ اُن میں سے کچھ ریلوے لائن کو بچھتا ہوا دیکھتے بھی رہے تھے اور جانتے تھے کہ اِس کی روح اُس فش پلیٹ میں ہوتی ہے جو اُسے سلیپر سے جوڑے رہتی ہے۔ اِسی لیے انہوں نے پے در پے وار کر کے فش پلیٹوں کو اُکھاڑنا شروع کیا تو ریلوے ٹریک بھی ساتھ ساتھ اُکھڑنے لگا۔

معاملہ جب یہاں تک پہنچا تو ہجوم کے آخر میں ہجوم کے ساتھ مزید چلنے یا نہ چلنے کے اُدھیڑ بن میں مبتلا منگر وہیں رُک گیا۔ وہ حیران تھا کہ جو لوگ اتنے بڑے مجمع کی قیادت کر رہے ہیں، قتل پر قتل کیے جا رہے ہیں، املاک کو آگ لگا رہے ہیں، لوگوں کو اشتعال دلا رہے ہیں وہ تو اِس بستی آدم واہن کے لیے قطعی اجنبی ہیں۔ نہ وہ یہاں کے رہنے والے اور نہ ہی کسی کے رشتے دار۔ آج سے پہلے نہ تو کسی نے اُن کو دیکھا اور نہ ہی اُن سے ملا۔ اِس بستی میں تو کلہاڑی بھی شاید کسی چرواہے کے پاس ہو، یہاں تو خنجر بھی کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ یہ تلوار اور تلوار نما برچھیاں اُٹھائے لوگوں کو کون یہاں پر لایا ہے اور اُس کا مقصد کیا ہے۔ چالیس درویش تو ایک زمانے سے ہر سال یہاں آتے ہیں لیکن آج تک اُن کو کسی نے اِس طرح طیش میں گریہ کرتے اور بددعائیں دیتے نہیں دیکھا۔ وہ تو ظلم اور زیادتی کے جواب میں حوصلے، مسکراہٹ اور معاف کر دینے کا درس دیتے رہے ہیں تو کس نے ڈال دیا اَب اُنہیں طیش اور انتقام کے راستے پر؟

منگر وہیں کھڑے کھڑے دور جاتے ہجوم کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آج ہو چکی ہلاکتوں کے بدلے میں شاید بستی پر کوئی عذاب نازل ہو یا نہ ہو لیکن اِس اُکھڑی ہوئی ریلوے لائن کی ایک ایک کیل کے بدلے سو سو عذاب نازل ہونا بستی کا مقدر ہو چکا۔ اتنے میں اُسے اپنے عقب میں سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آواز اگرچہ کہیں دور سے آ رہی تھی لیکن گھوڑوں کے سموں سے اُڑتی ہوئی گرد اُن کی رفتار کا پتا دے رہی تھی۔ منگر کے لیے پرانے قبرستان میں مزید رُکنا گویا انگریز سرکار کے غیظ و غضب کو دعوت دینا تھا جس کے کارپردازان وہاں پہنچے سو پہنچے۔ اُسے سنگری کی فکر تھی کہ اگر اس بار بھی وہ اپنے حسن اور اکھڑ پے والی ضد کے ہاتھوں کسی اور کے ہتھے چڑھ گئی تو کیا ہوگا؟ اُسے ملوکاں کا بھی کسی طور اعتبار نہیں تھا۔ کوئی اور تر نوالہ اُسے کسی نئے لوبھ میں مبتلا کر سکتا تھا اور ضروری نہیں کہ سنگری ہر بار

اپنی ماں کی رضا کے خلاف ہی چلتی رہے۔ اِس بار کوئی نیا موقع ہاتھ آنے پر وہ اپنی ماں کی تائید میں کسی حد تک بھی آگے جا سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایسا موقع نصیب میں ہو جہاں ماں بیٹی کی نیت اور رضا پہلے ہی سے ایک نکتے پر مرکوز ہوں۔ امکانات تو یہ بھی تھے کہ یہ سبھی بدگمانیاں ہوں جو سنگری اور ملوکاں کے سابقہ رویوں کے سبب اُس کے ذہن میں دھرنا دے کر بیٹھ گئی ہوں۔

اپنے دماغ میں ہونے والی مسلسل کھدبُد سے منگر خود بھی نڈھال ہو کر رہ گیا تھا۔ معاملہ جو بھی تھا، امکانات جیسے بھی تھے، خیریت اِسی میں تھی کہ جتنا جلدی ہو سکے وہ سنگری کے پاس پہنچے اور اُسے اپنے حقیقی موقف پر قائم رکھنے کے لیے دیکھے اَن دیکھے جتن کرتا رہے کیونکہ فسادیوں سے ماں بیٹے کی جان بچانے والا صرف وہی تھا، اور کوئی نہیں تھا۔ سنگری یا ملوکاں اِس موقف سے اگر تھوڑا سا بھی اِدھر اُدھر ہوتیں تو منگر کی خیر نہیں تھی۔ اگرچہ دن بھر اُس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا جو انگریز سرکار سے بغاوت کے زمرے میں آتا ہو مگر جلوس میں اُس کی موجودگی کی شہادتیں اِس قدر تھیں کہ اُسے انگریز سرکار کے خلاف بغاوت کا شریک مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی تھیں۔ صورتِ حال ایسی بن چکی تھی کہ سنگری کا مقتول مولوی جارُ اللہ سے رشتہ ہی منگر کی جان بچنے کا واحد راستہ رہ گیا تھا۔ انگریز سرکار کی مقامی اسٹیبلشمنٹ کے نزدیک اگر مولوی صاحب کے پسماندگان کی گواہی معتبر نہ قرار پاتی تو کس کی پاتی۔ لہٰذا منگر نے کچھ سوچ کر کچی اینٹیں بنانے والے تھیروں کی بستی سے اپنے لیے مختصر ترین راستے کا انتخاب کیا کہ جو سیدھا اُسی ٹھکانے پر جاتا تھا جہاں سنگری اپنے نومولود بیٹے اور اپنی ماں ملوکاں کے ساتھ چھپائی گئی تھی۔

تھیروں کی بستی سے گزرتے ہوئے اِتنی ویرانی کا احساس اُسے کبھی نہیں ہوا تھا جتنا اُس روز ہو رہا تھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کی موجودگی تو کیا، اِس کا احساس تک نہ تھا۔ منگر حیران تھا کہ بستی والے جو سارا دن کھلے میدان میں بیٹھے کچی اینٹیں تھاپتے رہتے تھے، گئے تو گئے کہاں؟ ایک انجانا خوف تھا جس نے تمام لوگوں کو شاید گھروں میں دبکا دیا تھا۔ لیکن گھروں میں بھی موجودگی کا احساس، محسوس کیے جانے کی کوشش پر بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ دور کچھ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی تو منگر جلدی سے کھڑکائی گئی اینٹوں کی درمیانی تنگ سی پٹی میں لیٹ کر

اپنے اوپر قریب پڑی ہوئی خشک جھاڑیاں ڈالتے ہوئے دَم سادھ لیا۔

گھڑ سوار منگر کی توقع سے پہلے ہی وہاں آن پہنچے۔ اُس کے اندازے کے مطابق تعداد میں وہ بارہ سے کم نہیں رہے ہوں گے۔ وہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے، لمحہ بھر کو وہاں رکے اور چلتے بنے۔ اُن کے انداز سے لگ رہا تھا وہ سیکورٹی فورس کے اضافی جتھے ہیں جو شاید فسادات کی خبراوپر پہنچنے پر پورے آدم واہن میں پھیل چکے تھے اور اب ہر آبادی اُن کے گھوڑوں کی ٹاپ تلے تھی کہ فسادیوں کے اشتعال سے بچنے کی اور کوئی صورت نہیں تھی۔ تھیروں کی آبادی سے نکلنے کے بعد اور خفیہ ٹھکانے پر پہنچنے تک ایسے دو اور جتھے منگر کے راستے میں آئے۔ اِن سب سے بمشکل بچ بچا کر وہ جیسے ہی اپنے خفیہ ٹھکانے میں داخل ہوا تو تمام دروازے چوپٹ تھے۔ منگر کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ یوں لگا کہ جیسے روح اُس کے بدن سے نچوڑ لی گئی ہو۔ کچے کوٹھے میں سب کچھ موجود تھا سوائے سنگری، اُس کے بیٹے اور ماں ملوکاں کے۔ منگر سر تھام کر اُکڑوں حالت میں زمین پر بیٹھ گیا۔ نہ تو اُسے کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ سُجھائی۔

# ۲۹

جان برٹن پیش آمدہ صورتِ حال سے اتنا پریشان ہوا کہ تمام ضابطوں کو توڑتے ہوئے ستلج ویلی اسٹیٹ ریلوے کے سائٹ آفس سے نکل کر اُس علاقے میں ٹہلنے لگا جہاں سے پکھی واسوں کی جھگیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ جان برٹن کو خود بھی خبر نہیں تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ شراب، سگار اور ایما کی کمی کیا اس طرح پوری کی جاسکتی تھی؟ کیا اِن کے تہ ہوتے ہوئے وہ ادھورا ہے؟ کیا انجانے میں وہ اُس لڑکی کو ڈھونڈنے تو نہیں نکلا جس کے ساتھ ڈیوڈ اور ایبٹ نے جنسی زیادتی کی تھی؟ جنسی زیادتی کیوں؟ جنسی تلذذ کیوں نہیں۔ جان برٹن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اگر جنسی فعل عورت کی رضا کے ساتھ کیا جائے تو وہ محبت کی انتہا اور اگر مرد اپنی مرضی سے کرے تو وہ جنسی زیادتی یعنی ذلالت اور پستی کی انتہا۔ تو کیا فاعل کی خواہش کچھ معنی، کچھ تکریم نہیں رکھتی؟ صرف مفعول کی خواہش اور مرضی کسی کو حبیب اور کسی کو رقیب بنا دیتی ہے۔

اور یہ کیا مذاق؟ صرف مرد ہی فاعل کیوں؟ عورت کیوں نہیں؟ جنسی تعلقات میں تو فاعل اکثر عورت ہوتی ہے اور مرد مفعول اِس کے باوجود کہ ایستادگی جیسی نامعقول ذمے داری بھی مرد کے سر تھونپ دی گئی ہے۔ اگر اُسے ایستادگی ہو تو وحشی کہلائے وگرنہ نامرد مگر اِس کے باوجود تمام تر الزامات، تمام تر خباثتیں مرد ہی کے سر کیوں؟ عورت اگر ناعورت ہو تو اُس سے کسی کو کچھ شکوہ نہیں اور مرد کو اگر عورت کے احترام میں ایستادگی نہ ہو تو وہ مردانگی کے دائرے سے خارج۔ اور یہ

مردانگی کا دائرہ ہے کیا؟ کون کھینچتا ہے اِسے؟ اِس کی حدود کیا ہیں؟ نسائیت یا نسوانیت کا دائرہ کیوں نہیں؟ اِسے کوئی کیوں نہیں کھینچتا؟ کسے ڈر لگتا ہے خوف آتا ہے اِس کے اندر گھسنے میں؟ کیا دنیا جہان کی عورتیں اپنے حرم سرا میں اکٹھی کر لینا مردانگی ہے یا ایک صرف ایک کو اپنا بنا کر رکھنا مردانگی ہے؟ اور یہ اپنا بنانا کیا ہوتا ہے؟ کچھ اِس کا بھی بیاں ہو جائے۔ مگر کون کرے؟ جس نے بیان کرنا ہے وہ بتانے کو تیار نہیں اور جس نے نہیں بتانا وہ بجھارتیں بجھوائے جا رہا ہے۔ تو کون طے کرے گا یہ تنازع؟ تنازع کے فریق یا ایمپائر؟

خیالات کی اِس گھسڑ بندی میں جب جان برنٹن کو اپنے ہونے یا نہ ہونے کا احساس ہوا تو وہ دریائے ستلج کے جنوبی کنارے پر اُس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں کئی مہینے قبل مچھیرے اپنی کشتیاں پانی میں باندھ کر گئے تھے مگر اب وہاں ریت ہی ریت تھی۔ جان نے سوچا کہ دریا کا رُخ موڑے جانے اور اِن ایام میں پانی کم آنے کے سبب وہاں ریت نہ اُڑے تو اور کیا ہو؟ دن ڈھلنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ جان ہر چیز سے بے خبر ایک سوکھی کشتی کے چونچ نما اگواڑے پر بیٹھ گیا۔ ستلج کے جنوبی کنارے پر اِس طرح بیٹھ کر پُل بنائے جانے کا عمل جہاں خوش کن دِکھ رہا تھا وہاں شمالی کنارے پر سینکڑوں لوگوں کا اجتماع بھی اُسے قطعی نہیں کھل رہا تھا۔ نہ اُسے ریت سے اَٹی ہوئی کشتیوں اور اُن کے پتوار سے کوئی کام اور نہ اونچائی پر کھڑے ہو کر دریا کے مردہ بہاؤ کو دیکھنے جیسا کوئی نظارہ اُس کے نزدیک کوئی توجہ طلب معاملہ۔

جان کو یوں لگا کہ بستی آدم واہن سے آنے والے سینکڑوں لوگ دریا پر پُل بنانے کے وہ بنیادی ستون گرانے کے لیے آ رہے ہیں جو ایک سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود ابھی دریا کے پیٹ سے بھی باہر نہیں نکلے تھے۔ کمال ہے جو ابھی پیٹ سے بھی باہر نہیں نکلے اُنہیں کیسے گرایا جائے گا۔ ہونہہ! جان برنٹن نے اُکتاہٹ سے سر کو جھٹکا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ واپس کیمپ میں جانا چاہ رہا تھا۔ مگر ابھی وہ ایک دو قدم بمشکل چل پایا ہو گا کہ اُسے اپنے عقب میں لیکن بہت دور کہیں شور سُنائی دیا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دریا کے خشک شمالی کنارے پر سینکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے جن کے آگے آگے چلنے والے کچھ لوگ سبز رنگ کے ڈھیلے ڈھالے چُغے پہنے ہوئے تھے۔ جان برنٹن

کے دیکھتے ہی دیکھتے سبز لباس والے لوگ ریت پر دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے جب کہ باقی لوگوں نے جنونیوں کی طرح دریا کے ریتلے کنارے کو کھودنا شروع کر دیا اور پھر نیچے بہاؤ کی جانب کھودتے ہی چلے گئے۔

جان برنٹن کیمپ میں واپس جانے کی بجائے پھر وہیں ٹھہر گیا کیونکہ کیمپ میں موجود فورس نے خشک دریا کے پاٹ میں اُتر کر دوسرے کنارے کی جانب پیش قدمی کرنا شروع کر دی تھی۔ جان حیران تھا کہ جم یہ بیہودہ حرکت کیوں کرنے جا رہا ہے کہ جس میں سراسر تصادم کا امکان ہی نہیں بلکہ خطرہ تھا۔ گو کہ نئی آنے والی فورس مقامی انتظامیہ کی کمانڈ اور کنٹرول میں تھی مگر کیمپ میں آنے کے بعد یہاں کا سیکورٹی انچارج جم اِس کا بالحاظِ عہدہ کمانڈر بن چکا تھا۔ لیکن اِس کے باوجود کوئی فردِ واحد سیکورٹی فورس کو میدان میں اُتارنے کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ اِس کے لیے ضروری تھا کہ مقامی انتظامیہ کے ڈپٹی کلکٹر اور سائٹ پر موجود کمپنی کے چیف انجینئر سے مشاورت کی جاتی۔

جان برنٹن نے جھنجلاہٹ میں سر پکڑ لیا۔ ''جم ہمیشہ اپنے اختیارات سے تجاوز کرتا ہے اور مجھے پوچھتا تک نہیں حالانکہ چیف انجینئر میں ہوں اور سائٹ پر موجود ہوں۔'' اِس قسم کے حساس معاملے میں یوں نظر انداز کیے جانے پر جان کی برہمی فطری تھی۔ اُس نے سوچا کہ فوراً کیمپ میں جا کر اِس حکم کو واپس کرائے کہ جس کے تحت فورس کو مشتعل ہجوم کا سامنا کرنے کے لیے خشک دریا میں اُتار دیا گیا تھا لیکن پھر نجانے دل میں کیا خیال آیا کہ دل برداشتہ ہو کر وہیں ایک اوندھی پڑی کشتی کی نکڑ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ سیکورٹی فورس کو دریا کے پاٹ میں اترتا دیکھ کر ہجوم بھی کنارے پر کی جانے والی کھدائی چھوڑ کر ایک طرف صف بند ہو گیا تھا۔ اب تو جان برنٹن کے نزدیک بھی میدان میں اُتاری گئی فورس کو واپس بلانا اُس کو وہاں بھیجنے والی غلطی سے بھی کہیں زیادہ بھیانک غلطی ثابت ہو سکتی تھی۔ معاً اُس کے ذہن میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے فورس کو پیش قدمی کرنے کا حکم ضلعی ہیڈ کوارٹر یا کمپنی کے ہیڈ آفس سے دیا گیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو وہاں جم تو کیا جان بھی کچھ مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ جان کچھ نہ سمجھ پایا تو خود ہی بڑبڑانے لگا کہ جو

کچھ ہونے جارہا ہے وہ کچھ اچھا نہیں ہونے جارہا۔

جان کی بڑبڑاہٹ کا جواب اُسے چند لمحوں ہی میں مل گیا۔ جو کچھ وہ سوچ رہا تھا موقع پر اُس سے بھی برا ہونے جارہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ بستی کے پرانے قبرستان کی جانب سے سیکورٹی فورس کے کم و بیش تین مسلح گھڑ سوار دستے اُکھاڑ دی گئی ریلوے لائن کو پھلانگتے ہوئے تیزی سے ہجوم کی عقبی سمت بڑھتے چلے آرہے تھے۔ اب سامنے سے ریلوے کمپنی کے سائٹ آفس سے اُترنے والی فورس تھی اور عقب میں بستی کی سمت سے آنے والی فورس۔ دیکھتے ہی دیکھتے اِن دونوں فورسز نے پورے ہجوم کو اپنے نرغے میں لے لیا اور لوگوں کو پرامن طور پر منتشر ہوجانے کی وارننگ دینے لگے۔ ابھی یہ وارننگ نما اعلانات جاری ہی تھے کہ ہجوم کے وسط میں سے پچاس کے قریب ایسے اجنبی لوگوں نے سرکاری فورس پر حملہ کردیا کہ جو پہلے ہی سے تلواروں اور تلوار نما برچھیوں سے مسلح تھے۔ اگرچہ سرکاری فورسز کے واسطے مشتعل ہجوم کی طرف سے یہ ردِعمل غیر متوقع نہیں تھا مگر اتنا بھی متوقع نہیں تھا۔ اِس لیے جہاں بہت سارے گھوڑے گھائل ہوئے وہاں کچھ سپاہیوں کو بھی زخم لگے۔ ایسے میں سرکاری فورسز کے لیے طاقت کا فوری استعمال نہ صرف منطقی تھا بلکہ ضروری ہو کر رہ گیا۔ لیکن جونہی سپاہیوں نے اُن مسلح حملہ آوروں کو اپنے نشانے پر لیا وہ سب کے سب یوں سوچے سمجھے طریقے سے دریا کا کنارہ چھوڑ کر چور راستے سے بھاگے کہ جیسے وہ پہلے سے کسی منصوبے کا حصہ رہے ہوں۔

ہجوم میں سے مسلح افراد کے نکل بھاگنے کے بعد موقع پر چالیس سبز جُبہ پوش درویشوں کے علاوہ بستی کے سوسَوا سو افراد ہی باقی رہ گئے جو خالی ہاتھ بے بسی سے بھاگتے لوگوں کو دیکھے جا رہے تھے۔ اُنہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کون لوگ تھے، کہاں سے آئے تھے اور اب سرکار کے آدمیوں کو اپنی حملہ آوری سے اشتعال دلا کر خود کدھر کو بھاگ نکلے؟ اب ایسے میں سرکار کی سپاہ نے کہاں تک بھاگتے ہوؤں کے پیچھے بھاگنا تھا، اُن کے بدلے میں وہ موقع پر موجود لوگوں پر ٹوٹ پڑی۔ اُن کے ہتھیاروں نے نہ تو سبز جُبہ پوشوں میں تمیز روا رکھی اور نہ کسی خالی ہاتھ بستی والے پر۔ جو بھی سامنے آیا، گھائل ہوا اور مٹی کے ساتھ مٹی ہوتا چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد ہی دریا کے کنارے

بنے میدان جنگ میں کوئی شخص بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ دیکھا گیا۔ گھڑ سوار فورس تھی یا زمین پر گرے پڑے عام لوگ اور سبز جُبہ پوش درویش۔ یوں ایک ایسی بغاوت چل دی گئی کہ جہاں کچلے جانے والوں میں کوئی ایک بھی نہ تو بغاوت کا محرک تھا اور نہ ہی منصوبہ ساز۔ جن مشتعل باغیوں نے سارا دن بستی میں اشتعال کو مسلسل ہوا دی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے رکھا انہیں کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ پوری بستی کے لوگ ایک ہجوم بن کر سارا دن فسادیوں کے پیچھے چلتے تو رہے مگر کسی نے بھی اُن سے یہ تک نہ پوچھا کہ حضرت! کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور ہمارے ساتھ ہمدردی کا مروڑ آپ کے پیٹ میں کیوں اُٹھا ہوا ہے؟ بستی آدم واہن کے باسیوں کے لیے یہ ایک منحوس دن تھا کہ جس کا آغاز مولوی جاراللہ کے خون سے ہوا اور شام سے پہلے دریائے ستلج کے سوکھے کنارے کی ریت میں چالیس درویشوں سمیت درجنوں بستی والوں کا خون بھی جذب ہو چلا تھا۔ کسی کو اِس تفکر کی ضرورت نہیں تھی کہ ایک ہی روز بستی کے دو مختلف مذہبی نقطۂ نظر رکھنے والوں کا خون ایک ہی دستِ قاتل سے بہا تو کیسے بہا؟

جان برنٹن کے لیے سب کچھ دیکھنا جہاں ایک بھیانک خواب کی طرح تھا وہاں اُس کے کبھی خدشات بھی سچ ثابت ہوتے چلے جا رہے تھے جنہیں وہ حکام کے روبرو کبھی کہہ پایا اور کبھی خاموش رہنے میں عافیت جانی۔ سنڈی ریلوے کمپنی میں انجینئر کی ملازمت کے دنوں میں کئی مواقع پر اُس نے ایسے کئی مشتعل ہجوم دیکھے اور اُن سے کامیابی سے نمٹا لیکن جو کچھ آج دیکھنے کو ملا اُس نے جان جیسے سخت گیر منتظم کو بھی دہلا کر رکھ دیا تھا۔ کیا اس طریقے سے مقامی لوگوں سے نمٹا جاتا ہے انہیں چاروں طرف سے گھیر کر کتوں کی طرح مارا جائے۔ وہ شدید تاسف کے اثرات تلے ہاتھ ملتا ہوا وہ اُٹھ کھڑا ہوا تاکہ کیمپ میں پہنچ کر اُس رپورٹ کی صحت کو تو دیکھ سکے جو ہیڈ آفس بھجوائی جانے والی ہوگی۔ لیکن جوں ہی وہ اوندھی کشتی سے اُٹھ کر پیچھے کی جانب مڑا تو سامنے پوری قامت سے سر اُٹھائے وہ پکھی واس لڑکی کھڑی تھی جو ڈیوڈ اور ایبٹ کے جنسی تشدد کا شکار ہوئی تھی۔ اب کے وہ پہلی نظر میں پہچان گیا کہ اُس روز مین آفس جاتے ہوئے جس لڑکی کو سائٹ آفس کے مین گیٹ پر کھڑے دیکھا تھا، وہ کوئی اور نہیں، یہی لڑکی تھی۔

میل سے اَٹی ہوئی چھوٹی سی ننگ دھڑنگ بچی اپنے کندھے پر ڈالے وہ عجیب سی آنکھوں سے جان کی طرف تکے جا رہی تھی۔ اُس آنکھوں میں جہاں نفرت تھی وہاں بے بسی اور بے حسی کا عجیب امتزاج بھی تھا۔ ڈھلتے سورج کی دھوپ میں جہاں اُس کی آنکھوں کے رنگ اور رنگوں میں سموئے ہوئے تاثرات اور بھی نمایاں ہو رہے تھے وہاں اُس کے کپڑوں کا میل جسم کے پسینے میں بھیگ کر کچھ الگ سی باس پھیلا رہا تھا کہ جسے نہ تو خوش گوار کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی ناگوار۔ بس کچھ جدا سا تھا جس میں جوانی کی خوشبو کی موجودگی کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یقیناً یہ بچی اُسی جنسی جبر کا نتیجہ ہے جس کے میلے وجود میں بھی گورا رنگ اپنی پوری شرمندگی سے جھانک رہا تھا۔ جان اُس کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکا اور گردن جھکا لی۔ ماضی کے بہت سے واقعات اُس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ جہاں جہاں عورت جنسی جبر کا نشانہ بنتی ہے تو اُس کے نتیجے میں اکثر ایک اور عورت کو جنم دیتی ہے، مرد کو نہیں۔ وہ مردانہ جینز میں موجود وائی کروموسوم کو اپنے ایکس کے ساتھ شریک ہی نہیں کرتی کہ اِس قسم کے نَر پیدا ہونے کا امکان ہی نہ رہے۔ غیر شعوری سطح پر شاید نطفے کے مردانہ شریک کے گناہوں کے کفارے کے لیے یا اُس کے انسانیت کے خلاف اِس جرم کی سزا کے طور پر؟ مگر یہ کیا کہ عورت سے زیادتی کی سزا عورت ہی کیوں بھگتے یا اُس کے گناہ کا کفارہ ایک اور عورت کا جسم ہی کیوں ادا کرے؟

جان برنٹن جو پہلے ہی سے شدید ذہنی اذیت اور خلفشار میں مبتلا تھا اُس لڑکی کی وہاں موجودگی سے اتنا گڑبڑایا کہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کرے، کیا کہے؟ کیسے پوچھے کہ وہ اُس وقت وہاں کر کیا رہی ہے؟ شاید اُسے کچھ مالی مدد درکار ہو یا پھر چاہتی ہو کہ ڈیوڈ یا ایبٹ تک یہ خبر کسی طور پہنچا دی جائے کہ اُسے تو اِس بچی کی ماں ہونے پر کسی تنازعے کا سامنا نہیں مگر وہ دونوں آپس میں ضرور طے کر لیں کہ اُن میں سے کسے اِس کا باپ کہا جائے؟ جان کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ لڑکی کو اُس کے قبیلے نے شاید نکال باہر کیا ہوا ہے۔ تبھی تو اُس کی یہ حالت تھی وگرنہ پکھی واس عورتیں اتنا تو اپنے آپ کو بنا سنوار کر ضرور رکھتی ہیں کہ نسائیت کے تقاضے پورے کر سکیں۔ جان برنٹن شرمندگی سے اپنے آپ کو زمین میں گڑا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہ جو کبھی مقامی لوگوں کو کچل کر کمپنی کے مقاصد

پورے کرنے کا داعی رہا تھا اُس پکھی واس لڑکی سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ بھی نہیں کر پا رہا تھا جسے اُس کے پکھی واس قبیلے نے اپنے قبیلے جوگا رہنے کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا محض اِس لیے کہ اب اُس کی گود میں بن بیاہے ایک گورے کی بیٹی تھی۔ جان برنٹن حیران تھا کہ نفرت کرنے کا ہنر تو کوئی محکوم قوموں سے سیکھے، فاتحین کو تو نفرت کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا اور نہ وہ جانتے ہیں کہ ظلم اتنا گہرا گھاؤ نہیں لگا پاتا کہ جس قدر گہرائی میں نفرت کی برچھی اُترتی ہے۔

جان ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اُس لڑکی سے کس طرح اُس کی آمد کا سبب پوچھے کہ اتنے میں جم اور ولیم اچانک اُن کے سامنے آگئے۔ وہ دونوں اُس کی تلاش میں نکلے تھے اور چاہتے تھے کہ اِس وقت تک سائٹ پر ہو چکی صورتِ حال کی رپورٹ اُس کی مشاورت سے ہیڈ آفس بھجوائی جاسکے۔ لیکن جوں ہی اُنہوں نے جان کو ایک پکھی واس لڑکی کے ساتھ دریا کے ویران کنارے پر کھڑے ہوئے پایا اُن کی آنکھیں تشکیک اور چہرے ناگوار تاثرات سے بوجھل لگنے لگے۔ جان خود انتہائی شرمندہ سا کہ جیسے موقع پر رنگے ہاتھوں کوئی غیر اخلاقی حرکت کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ اِس پر طرفہ جم اور ولیم کا رویہ کہ وہ اُس سے ایک دم ایسا برتاؤ کرنے لگے تھے کہ جیسے کسی گھٹیا شخص سے ملفوف بے ادبی کی جاتی ہے۔ جم، جان برنٹن کو بحیثیت کمپنی کے چیف انجینئر اور ولیم اُسے بطور والد کے تکریم دیتے ہوئے بھی تذلیل کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ جان کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ لوگ جن میں اُس کا بیٹا بھی شامل ہے کیوں اُسے ایسی صورتِ حال میں گھسیٹے جا رہے ہیں کہ جس میں اُس کا ہونا سب کے لیے باعث شرمندگی ہو۔ جان انہیں بتانا چاہتا تھا کہ یہ لڑکی نہ تو اُس کے بلانے پر آئی ہے، نہ اُسے ملنے کے لیے آئی ہے اور نہ اُس کا اُس سے کوئی ربط یا واسطہ ہے مگر وہ بتا نہیں پا رہا تھا۔ وہ دونوں اُسے اِس لیے بھی نگاہِ کم سے دیکھ رہے تھے کہ اُس کا ماضی تقریب ایما سے شادی کے سبب داغ دار بنا دیا گیا تھا۔ اُسے ایک ایسے شہوت پرست بوڑھے کے طور پر پینٹ کیا جا رہا تھا جسے سوائے عورت کے اور کسی سنجیدہ پیشہ ورانہ ذمے داری سے کوئی تعلق نہیں۔ جم اور ولیم دونوں کے چہروں پر لکھے ہوئے بہت سے سوالات اِسی تیقن کے سبب تھے کہ ریلوے کمپنی کا چیف انجینئر اُس وقت سائٹ آفس چھوڑ کر ایک بدبودار فاحشہ کی صحبت میں مست ہے کہ جب

کمپنی کے اثاثے فسادیوں کے حملوں کی زد میں اور اُس کی بقا کو مہیب خطرات لاحق ہیں۔ وہ اپنے تئیں یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ یہ کیسا باس ہے جسے سائٹ پر بہنے والا انسانی خون بھی ذمے داری کا احساس نہیں دلا پا رہا؟

اُن دونوں نے اب تک جان سے کوئی بات نہیں کی تھی جب کہ جان بھی توقع کر رہا تھا کہ اُن سے کوئی بات کیے بغیر وہ بہت جلد اِس گھمبیر صورتِ حال سے نکل آئے لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہو پاتا کہ جب کسی نہ کسی طور اُس مکالمے کا آغاز ہو پاتا کہ جو اُن دونوں کے ذہنوں میں ترتیب پا رہا تھا۔ مگر وہاں تو عجیب سی صورتِ حال بن چکی تھی۔ چار لوگ موجود تھے لیکن اُن میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ ولیم اور جم کا رویہ پراسیکیوٹرز جیسا جب کہ جان برنٹن نے مسلسل نظریں جھکا کر خود کو مجرم تسلیم کر لیا تھا لیکن جس لڑکی کی موجودگی کے سبب اِن سب کو اِس صورتِ حال کا سامنا تھا وہ اِس کا ادراک کیے بغیر ہی سب کو اُن نگاہوں سے تکے جا رہی تھی جن میں نفرت، بے بسی اور بے حسی کا راج تھا۔

جم اور ولیم نے اِس سکوت کو اپنی گفتگو سے توڑنے کے بجائے بہتر سمجھا کہ وہاں سے واپس ہو لیا جائے۔ جوں ہی وہ مڑے جان نے انہیں روکنا چاہا لیکن حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ بدقسمتی نے اُسے اُن دو لوگوں کے سامنے رسوا کر کے رکھ دیا تھا جن کے معاندانہ رویے کا وہ پہلے سے شاکی چلا آ رہا تھا۔ وہ بہر صورت اُن پر اپنی اخلاقی بالادستی قائم رکھنا چاہتا تھا مگر ہر بار اُس کے حصے میں محض تذلیل ہی آتی رہی تھی۔ اُن دونوں کو فاتحانہ انداز میں واپس جاتا دیکھ کر جان برنٹن کا دل بھر آیا۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ آنکھوں کے گوشے نہ بھیگیں لیکن ناکام رہا۔ جان نے بھیگی آنکھوں سے لڑکی کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں بھی جان برنٹن کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہونے لگے تھے۔ اب جان کے لیے وہاں مزید رُکے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اُس نے نگاہ بھر کر اُس چھوٹی سی بچی کو دیکھا جو پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنا باپ نطفے کے مغالطوں اور سماجی تعین کی تہذیبی بھول بھلیوں میں کھو چکی تھی۔ مگر وہ خود زندہ رہنے کے لیے مجبور تھی اپنی مکمل نسائی وجودیت کے ساتھ، اپنے باپ کے شہوانی اُبال کا قرض چکانے کے لیے۔

جان نے پتلون کی عقبی جیب سے اپنا والٹ نکالا، اُس میں موجود تمام کرنسی اپنی مٹھی میں بھینچی اور لڑکی کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر ہولے سے اُس کی کھلی ہوئی انگلیوں کو دبا کر مٹھی بنا دیا۔ وہ لڑکی کچھ بھی نہ بول سکی مگر اب اُس کی آنکھوں میں جان کے لیے اپنائیت کے ساتھ ساتھ حیرت کے رنگ بھی اُبھرنے لگے تھے۔ اِن رنگوں کا احساس کیے بغیر ہی وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا کمپنی کے سائٹ آفس میں اپنے کیمپ کی طرف چل پڑا۔ ان حالات میں وہ ہر قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔





# ۳۰

پورے دودنوں کی خواری کے بعد منگر کو خبر ہو سکی کہ سنگری اپنے بچے اور ماں سمیت اُس گھر میں واپس پہنچ چکی ہے جہاں اُسے مولوی جارُاللہ نے رکھا ہوا تھا۔ منگر کی دی ہوئی محفوظ پناہ گاہ سے وہ یہاں تک کیسے پہنچی اور اِس دوران کہاں کہاں رہی، ابھی تک راز ہی تھا۔ مولوی صاحب کی دیگر بیوگان بھی واپس اپنے گھر میں پہنچا دی گئی تھیں اور حجرے کے باہر دو سپاہیوں کو چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی پر بٹھانے کے علاوہ گھڑ سوار سیکورٹی کا آنا جانا بھی اُن حفاظتی اقدامات میں سے تھا جو مقامی انتظامیہ نے اِس کے باوجود کرنا مناسب سمجھے کہ سات شہیدوں کی قبروں کے معاملے میں مقتول مولوی صاحب کا کوئی کردار نہیں تھا۔

مولوی جارُاللہ کی میت تدفین کے بعد اپنے پیچھے دو تنازعے چھوڑ کر گئی۔ پہلا یہ کہ اُس کے بعد بستی کی مذہبی پیشوائی کون کرے گا؟ اور دوسرا اُس سے بھی گنجلک کہ اثاثے کس طور تقسیم ہوں گے۔ پہلے مسئلے میں کچھ زیادہ فریق نہیں تھے، بس تین۔ ایک اُس کا چھوٹا بھائی مولوی اللہ رکھا اور دو بیٹے مولوی اللہ بخش اور مولوی کالو۔ اللہ بخش پہلی بیوی سے جب کہ کالو دوسری بیوی سے۔ مولوی جارُاللہ کا چھوٹا بھائی مولوی اللہ رکھا اگرچہ اپنے بھتیجوں کا ہم عمر تھا لیکن اگر وہ کالو سے بڑا تھا تو بخشو سے کچھ چھوٹا۔ فرق تھا تو کہیں سال دو سال کا۔ لیکن یہ تنازع پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ مقامی انتظامیہ کو باقی دو کی نسبت مولوی اللہ بخش زیادہ قابلِ قبول تھا لہٰذا مرکزی مسجد کی

امامت کو شخصی وراثت کے تحت طے کرتے ہوئے مولوی جارُاللہ کے پہلی بیوی سے بڑے بیٹے مولوی اللہ بخش کو یہ سیادت سونپ دی گئی۔ مولوی اللہ رکھا نے مرحوم جارُاللہ کا برادرِ حقیقی ہونے کے ناتے تنازع کو نئے سرے سے اُٹھانے کی کوشش کی تو اُسے انگریز سرکار کے خلاف منافرت پھیلانے اور ستلج برج کے خلاف بلوہ کرنے کے الزام میں دھرلیا گیا لیکن اُس کی فِطانت کام آئی اور فوری معافی تلافی کو بھی درخورِ اعتنا جان لیا گیا نتیجتاً مولوی اللہ رکھا نے اپنے نسبتاً کم عمر بھتیجے کا نائب امام بننا قبول کر لیا۔

دوسرا مسئلہ وراثت کا تھا۔ مولوی جارُاللہ کی تدفین تک تو ہر طرف خاموشی رہی مگر تدفین کے فوری بعد جہاں چار بیوگان اپنے بچوں سمیت وراثت کی دعوے دار کے طور پر سامنے آئیں وہاں دو اور جوان عورتیں بھی اپنے بچوں سمیت یہ مدعا لے کر حجرے میں آن بیٹھیں کہ وہ بھی گزرے وقتوں میں مولوی صاحب کے عقد میں رہی ہیں لہٰذا وراثت سے حصہ پانے کی حق دار ہیں۔ مولوی مرحوم کی بیوگان کو اِس کی خبر ہوئی تو بڑے زنان خانے میں نئے سرے سے کہرام مچ گیا۔ اب آہ و بکا میں مولوی صاحب کے قتل کا دکھ عنقا مگر اُن کی روح کی مدارت کے واسطے بد دعاؤں کا نذرانہ وافر مقدار میں تھا۔ دونوں مدعی عورتیں چونکہ بستی آدم واہن سے باہر کی تھیں اِس لیے مولوی اللہ بخش نے اُنہیں وقتی دلاسہ دے کر جان چھڑالی کہ وہ دوبارہ آئیں اور اپنے ساتھ نکاح کا ثبوت یا گواہ بھی لائیں تو اُن کا حق اُنہیں ملے گا۔

اُن دنوں بستی میں معاملاتِ مال سے متعلقہ عمّال کے ہاں واجب الارض مرتب کیے جانے کا چرچا بھی تھا کہ جس میں علاقے کے رسوم و رواج اور وراثت سے متعلق معاملات کا صراحت سے ذکر کیا جا رہا تھا۔ بات اوپر تک گئی تو مولوی اللہ بخش سے مشاورت کے بعد طے پایا کہ بیوگان اور دختران کی کثیر تعداد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مناسب یہی ہوگا کہ علاقے میں وراثت کی تقسیم شریعت کی بجائے رواجاً کی جائے۔ اِس طور اُن دو عورتوں کے فتنہ سے بھی نجات کا راستہ کھلا تھا جو مولوی مرحوم سے شادی کی دعوے دار تو تھیں مگر اولادِ نرینہ نہیں رکھتی تھیں۔ لہٰذا سرکاری سطح پر واجب الارض کے بنیادی مسودے میں قرار دے دیا گیا کہ بستی آدم واہن میں وراثت

مطابق شریعت نہیں بلکہ تحت رواج پگ وَنڈ ہی تقسیم ہوتی آئی ہے اِس لیے مولوی جارُاللہ کی وراثت کی تقسیم بھی پگ وَنڈ کے مطابق ہوگی کہ جس میں صرف مرد وارثان ہی وراثت کے حق دار ہوں اور چونڈا وَنڈ کی طرح نہیں کہ جہاں خواتین بھی وراثت کا حق رکھا کرتی ہیں۔ پگ وَنڈ کی قرار دہی پر مولوی جارُاللہ کی بیوگان اور دعوے داران، تمام کی جانب سے خاصا احتجاج سامنے آیا مگر انہیں مختلف طریقوں سے خاموش کرا دیا گیا۔ مولوی اللہ رکھا نے ایک بار پھر سَر اُٹھانا چاہا کہ جس کی سالی مولوی مرحوم کی دوسری بیوی تھی مگر اِس بار جس انداز میں اُسے تنبیہ کی گئی اُس کے بعد اُسے اپنی دستیاب حیثیت میں رہنے ہی میں عافیت محسوس ہوئی۔ سنگری سمیت مولوی جارُاللہ کی دیگر بیوگان نے بھی مولوی اللہ رکھا کو جھاگ کی طرح بیٹھتے دیکھا تو پگ وَنڈ کے تحت تقسیم وراثت پر قانع ہو کر بیٹھ گئیں کہ چلیں وہ نہ سہی اُن کی اولادِ نرینہ تو کچھ نہ کچھ کی حق دار ہو ہی گئی ہے۔

منگر نے پہلے تو اپنے طور پر سنگری سے رابطے کی کوشش کی مگر اُس نے پٹا انکار کر دیا گیا کہ وہ عدت کے ایام میں ہے لیکن بعدازاں جب اُس کی ماں کو بھی سنگری کی ماں سے ملنے سے جواب دے دیا گیا تو اُس کا ماتھا ٹھنکا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ مگر معاملہ اور ہونے کا خیال، خیال خام نکلا کیونکہ ہر بار گھر اسنگری کی طرف جاتا رہا کہ وہی اُس سے ملنے سے گریزاں تھی۔ منگر کے واسطے یہ دن بے اندازہ پریشانی کے تھے کہ جن پر سنگری کا رویہ سِوا تھا۔ ایک طرف کسی ثبوت کے بغیر اُس کا نام بستی میں ہونے والے فسادات اور ریلوے برج پر حملے میں ملوث ہونے کے سلسلے میں لیا جارہا تھا اور دوسری جانب وہ عورت اُس کے احسانات کا بدلہ تو کیا چکانا اُس سے شناسائی کے اقرار سے بھی انکاری تھی جس کی جان بچانے کے لیے اُس نے اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلے رکھا۔

منگر حیران تھا کہ اِس چھوٹی سی بستی میں ہونے والے ایک ہی دن کے فسادات سے ملتان کی مقامی انگریز انتظامیہ ہل کر رہ گئی تھی۔ اگر معاملہ صرف بستی میں ہونے والی ہلاکتوں کا ہوتا تو یہ انگریز سرکار کے اثاثوں سے چھیڑ خوانی نہیں کہا جا سکتا تھا مگر یہاں تو اِنڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کی تنصیبات اور تعمیرات کو نشانے پر رکھ لیا گیا تھا۔ بستی کے لوگ قسمیں اُٹھاتے تھے کہ محض

ریلوے برج کی بنیادوں کو بچانے کے نام پر ستر سے زیادہ ہلاکتیں ہوئیں جن میں بستی کے لوگوں کے علاوہ تیر و سبز جبہ پوش بزرگ بھی شامل تھے اور یہ وہ لوگ تھے کہ جن کے ہاتھ میں لکڑی کی سوٹی تک نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر ایسا ہوا ہے تو انگریز انتظامیہ کے پاس ان کی ہلاکتوں کا پورا جواز موجود تھا کیونکہ ان مقتولین کے ہمراہ موجود مسلح لوگوں نے انگریز انتظامیہ کی فورس کو اُن کے گھوڑوں سمیت بھسم کر ڈالا تھا۔ بستی کے فسادات سے قطع نظر یہ واقعہ، سانحے سے زیادہ گورکھ دھندہ تھا جس میں نامعلوم مسلح افراد نے بستی کے غیر مسلح لوگوں کو گھیر گھار کر پہلے تو ایک مخصوص مقام پر پہنچایا، پھر سرکار کے سپاہیوں پر برچھیاں چلائیں اور چلا کر خود تو پتلی گلی سے نکل لیے مگر انہیں بھری ہوئی سرکاری سپاہ کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔ واقعہ تو ہو چکا مگر اب جتنے منہ اُتنی باتیں۔ کوئی کہتا اگر یہ ستر ہلاکتیں قبروں کی صورت باقی رکھی جاتیں تو نجانے کیسا ردعمل سامنے آتا۔ لہٰذا فسادات کو سرد کیے جانے کے بعد اُن لاشوں کو اس طرح ٹھکانے لگایا گیا کہ مرنے اور مارنے والے دونوں کو خبر تک نہ ہوئی کہ اُن کا اور اُن کے کیے دھرے کی باقیات کا کیا ہوا؟ شاید ایک بار پھر خشک ہوئے دریا کا وہ کنارہ ان بے گناہوں کی اجتماعی قبر بنا جس کی گہرائی میں اُترنے کے لیے پانی بھی گریزاں رہتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ بھی تھی کہ اس اجتماعی تدفین کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ وہ لوگ جو سرِشام طرح طرح کی کوڑی لا رہے تھے، رات گئے صرف زخمیوں کی تعداد تو بتاتے مگر مرنے والوں کے نام اور تعداد بتانے سے ہچکچانے لگے۔

اب خدا جانے ان ستر ہلاکتوں کی خبر حقیقت تھی یا افسانہ لیکن بستی بھر کی دبی زبانیں اور بولتی آنکھیں پھر بھی گم شدگان کی تعداد کو اس سے کم کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ مولوی اللہ بخش نے اگرچہ وراثت کی پگ باندھے جانے کے بعد اپنے پہلے خطاب میں جہاں لوگوں کو پرسکون رہنے کی تلقین کی وہیں دریا کنارے ہونے والی مڈبھیڑ میں ہلاکتوں کی خبر کو جھوٹ اور افواہ قرار دے دیا تھا مگر لوگ پوچھنے میں حق بجانب تھے کہ بستی کے اتنے سارے لوگ کہاں گم ہو گئے۔ شام ڈھلے جب سبز جبہ پوش اور دوستوں کو واپس پرانے قبرستان کی جانب دھکیلا گیا تو وہ بھی تعداد میں ستائیس تھے، چالیس نہیں۔ کچھ لوگوں کا بار بار یہ کہنا بھی رفتہ رفتہ رائے عامہ پر اثر کرنے لگا تھا کہ ہو سکتا

ہے گم شدہ لوگ سیکورٹی فورس سے خوف زدہ ہو کر خود ہی کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو گئے ہوں۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گم شدگان کے ورثا اُن کی موت کا پُرسہ لینے کے بجائے اُن کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ اِدھر مقامی انتظامیہ نے بھی معاملے پر مٹی ڈالنے کے بجائے پکڑ دھکڑ اور فرمان پر فرمان جاری کرنے کا کام بجڑ کائے رکھا۔ جس کسی کا فسادیوں کے ساتھ معمولی سا بھی ربط معلوم ہوا اُس کے گھر کے باہر سپاہی کھڑے کر دیے۔ جس کسی کا فساد میں سایہ پڑنا بھی معلوم ہوا اُسے اُٹھا لیا گیا۔ اِن حالات میں گم شدگان اگر کوئی تھے، تو اُن کی واپسی خواب بن کر رہ گئی۔ اُلٹا اُن کے وارثان خواہش کرنے لگے کہ اب تو وہ کبھی واپس نہ آئیں تو زیادہ بہتر ہے۔

منگر نے سُنا کہ مڈبھیڑ میں سے زندہ بچ رہنے والے سبز جبہ پوش درویشوں کو شام ڈھلے پُرانے قبرستان واپس لانے کے بعد راتوں رات کہیں روانہ کر دیا گیا تھا۔ اب وہ کہاں گئے اور کہاں ہیں کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ مگر اتنا ضرور سنا گیا کہ جانے سے پہلے اُنہوں نے اپنے سات شہیدوں کے بجائے بیس شہیدوں کا ماتم کیا اور پھر اجتماعی گریہ کرتے ہوئے بددعا کی کہ جہاں جہاں بیس شہدا کا مدفن ہے اور جہاں جہاں اُن کے جسم سے کہیں خون کا ایک قطرہ بھی گرا ہے، وہاں نہ تو کبھی دریا بہے گا اور نہ ہی پانی زمین سے اُبھرے اور آسمان سے اُترے گا۔ اور یہ بھی سُنا گیا کہ جب اُن کو پُرانے قبرستان سے لے جانے کے واسطے رات کے کسی پہر گھسیٹا جا رہا تھا تو انہوں نے آسمان کی طرف شہادت کی اُنگلی کھڑی کر کے کہا تھا کہ ”برباد ہوائے ستلج! کہ جس پر لوہا ڈالنے کے لیے شہدا کا مدفن اُجاڑا گیا، برباد ہوائے ستلج! کہ تیرے سبب بے گناہوں کا خون تیری گزرگاہ میں بہا، برباد ہوائے ستلج! اِس طرح کہ تو خلقت کے واسطے عذاب ثابت ہو، رفتہ رفتہ تیری رگوں میں بھی موت اُترے، تو بھی بے آب و نشان ہو، تجھ میں کبھی ماس مچھی پیدا نہ ہو، تم پر کبھی پرندے نہ اُتریں اور تو ہمیشہ زندگی کے لمس کو بھی ترسے۔“

منگر کو لگا کہ درویشوں کی بددعا صرف دریا کے لیے نہیں یہ تو پوری بستی کے لیے ہے اور بستی سے کہیں زیادہ اُس خطے کے لیے جہاں جہاں سے ستلج گزرتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے عجیب سا منظر گھوم گیا کہ ستلج پر لوہے کا ایک طویل پُل کئی ستونوں پر رکھا ہے اور اِس کے

پاٹ میں حدِ نظر تک خشک ریت اُڑ رہی ہے۔ پتن ویران، ماس مچھی عنقا اور آسمان دور دور تک پرندوں سے خالی۔ نہ کہیں کشتی اور نہ کوئی ملاح۔ نہ کوئی درخت اور نہ کہیں ہریالی۔ ایسے میں اُسے بچپن میں سُنی ہوئی ایک کہانی یاد آ رہی تھی کہ اِس بستی کا نام آدم واہن کیوں پڑا۔ آدم واہن اِس لیے کہ آدم کو بار بار یہاں آباد ہونے کے لیے لایا جاتا رہے گا اور ہر بار اُس کو یہاں سے چل چلاؤ کا سامنا بھی رہے گا۔ تو کیا اِس مقام کو، اِس دریا کو اور اِس دریا کی گزرگاہ کو ہمیشہ سے مظالم اور بد دعاؤں کا سامنا رہا ہے؟ کیا یہ مقام مسلسل اُجڑتا اور آباد ہوتا رہا ہے؟ کیا صدیوں کے گرداب میں یہاں بھی پے در پے نقل مکانی ہی ہوتی رہی ہے؟

منگر کا سر چکرا گیا۔ اُس نے آنکھ بھر کر بستی کی طرف دیکھا تو اُسے سبھی مکان کھنڈرات کی طرح دکھائی دیے کہ جہاں زندگی اپنے آثار خود کھرچ چکی تھی۔ اُس نے بستی کی گلیوں کو دیکھا تو وہاں ریت ہی ریت کہ جیسے صدیوں سے اِدھر کسی کا گزر ہی نہ ہوا ہو۔ منگر نے اپنے سراپے پر نظر ڈالی تو کانپ کر رہ گیا۔ وہاں اُس کی بجائے کوئی سال خوردہ بوڑھا تھا کہ جس کے بدن کی کھال پر خشک بدرنگے چھلکے اُگے ہوئے تھے۔ اُس نے اپنے ہاتھ اپنی جلد پر پھیرنے چاہے تو اُس انگلیوں کے آگے بل کھائے ہوئے لمبے لمبے ناخن جلد کے چھلکوں میں الجھنے لگے۔ منگر کو کراہت سے اُبکائیاں آنے لگیں۔ اُس نے سر کو کئی بار زور سے جھٹکا۔ اُس کی آنکھوں میں منجمد ہو چکا منظر پھسلنے میں بھی تاخیر کا متقاضی تھا۔

# ۳۱

جان برنٹن کے لیے اگر مقامِ عبرت نہیں تو مقامِ حیرت ضرور تھا کہ اُس کی مبینہ بُری کارکردگی، بے عملی اور بدعملی کے سلسلے میں کی جانے والی انکوائری میں اُس کی بیوی ایما محکمانہ پراسیکیوٹر اور اُس کا بیٹا ولیم اور برسہا برس سے چلا آنے والا ماتحت جم استغاثہ کے گواہوں میں شامل تھے۔ جب کہ اُس کی انکوائری کے لیے اِنڈس اسٹیٹ ریلوے کے کراچی آفس سے ایسے شخص کو انکوائری آفیسر مقرر کیا گیا تھا جو سرے ہی سے جان برنٹن کے چیف انجینئر بنائے جانے کا مخالف رہا تھا۔ ایک نہیں کئی انتظامی اجلاسوں میں وہ جان کو سنکی، بددماغ اور بُری یادداشت والا شخص قرار دے چکا تھا جو چیف انجینئر جیسے اہم اور حساس عہدے کے لیے مناسب نہیں تھا۔ جان برنٹن نے انکوائری آفیسر کے تقرر کی اطلاع ملتے ہی ہیڈ آفس سے بذریعہ تار اپنے تحفظات کا اظہار کیا مگر اُس کی یہ درخواست اُسی روز ہی رد کر دی گئی۔

جان برنٹن پر پہلا الزام تو یہ تھا کہ اُس نے بطور چیف انجینئر اِنڈس اسٹیٹ ریلوے، بجائے کمپنی کی جائیداد اور تنصیبات کی نگہبانی کے اُس وقت خود کو سائٹ آفس سے غیر حاضر کر لیا جب کمپنی کی تنصیبات انتہائی خطرے میں تھیں اور اُن پر حملہ کر کے انہیں نقصان پہنچانے والا ہجوم موقع پر پہنچ چکا تھا۔ دوسرا یہ کہ اُس نے لا اینڈ آرڈر کی شدید بحرانی کیفیت میں جان بوجھ کر کمپنی کے مفادات کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک بدکردار خانہ بدوش لڑکی کے ساتھ وقت گزارنے کو ترجیح

دی اور اس طور بدعملی اور بے عملی کا مرتکب ہوا۔ جب کہ تیسرا الزام یہ تھا کہ اپنے کردار کی کمزوری اور سرِعام مخربِ الاخلاق حرکات میں ملوث ہونے کے سبب وہ انڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی میں ملازمت کا جواز اور اپنے رفقائے کار کی نگاہ میں عزت و توقیر کھو چکا ہے لہٰذا کیوں نہ اُسے ان وجوہات کی بنا پر ملازمت سے برخاست کر دیا جائے۔

جان برنٹن کے ساتھ کئی مہینوں سے قدم بہ قدم چلتی ہوئی بدقسمتی نے بھی اُس روز اپنی اُخیر کو چھولیا جس روز دریائے ستلج کے کنارے سبز جبہ پوش درویشوں اور بستی کے لوگوں کی مقامی انتظامیہ کی سیکورٹی فورس سے خونی مڈبھیڑ ہوئی۔ سات شہیدوں کا مدفن ڈھونڈنے والوں پر یہ سمجھ کر پوری طاقت سے حملہ کر دیا گیا کہ وہ پُل کے ستونوں کی کھدی ہوئی بنیادوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ جان برنٹن کے لیے یہ واقعہ بھی شاید بدقسمتی کی انتہا ثابت نہ ہوتا اگر وہ اُن بحرانی لمحات میں اُس خانہ بدوش لڑکی کے ساتھ تنہائی میں نہ دیکھا جاتا۔ ''کس قدر منحوس لڑکی ہے وہ کہ پہلے دو نوجوان انجینئرز کے ساتھ پَل بھر کے لیے مَس ہوئی تو دونوں کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے اور آج چند لمحوں کے لیے اُس کے ساتھ دیکھی گئی تو زندگی بھر کا کیا دھرا داغ دار اور ملازمت انکوائری کے کٹہرے میں۔'' جان برنٹن کے پاس اس طرح کی بٹی ہوئی سوچ سوچنے کے علاوہ کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ زندگی بھر نحس اور سعد کے چکر میں نہیں پڑا تھا اور نہ ہی کبھی توہمات کو اپنے قریب پھٹکنے دیا۔ وہ جو چاہتا کر گزرتا، مٹی کو ہاتھ لگاتا تو سونا بن جاتی اور سونا اُس کے چھو لینے سے ہیرا بن جایا کرتا تھا۔ اب اگر اُس کے دیکھے سے بھی سونا مٹی ہونے لگا تھا تو کچھ تو تھا ایسا کہ جو اُسے ہزیمت کے پاتال میں تہہ در تہہ دھکیلے جا رہا تھا۔

جان کا خیال تھا کہ جم اور ولیم اُس کے بارے میں کبھی بے سروپا کی نہیں گھڑیں گے کیونکہ اُن سے زیادہ کون جانتا تھا کہ اُس نے زندگی بھر عورت کو کبھی اپنے پیشہ ورانہ امور پر ترجیح نہیں دی۔ ولیم کی والدہ مَیری کے روا رکھے گئے سلوک اور اجیرن کر دی گئی زندگی کے بعد تو عورت نام کی صنف اُس کے تصورات میں بھی دخیل نہیں رہی تھی، حقیقت میں کیا ہوتی۔ وہ دونوں ایما کی حقیقت بھی جانتے تھے کہ اُس باوقار عورت نے کس طرح اُس کی ویران زندگی میں زندہ رہنے کی

اُمنگ پیدا کر کے دراصل ایک ایسے انجینئر کو مرنے سے بچالیا تھا کہ جس کا نام ریلوے جیسی جدید ایجاد کے حوالے سے ضرب المثل بن چکا تھا۔ لیکن ولیم اور جم نے ایک میلی کچیلی خانہ بدوش لڑکی کو محض اُس کے ساتھ کھڑا دیکھ کر اُس کی بدکرداری کی کہانی نہ صرف گھڑلی بلکہ جان کے واپس خیمے میں پہنچنے سے پہلے ہی اُسے ہیڈ آفس میں رپورٹ بھی کر دیا تھا۔ یہ اُسی پھرتی کا نتیجہ تھا کہ کیمپ آفس پہنچتے ہی جان کو جہاں پیشہ ورانہ ذمے داریوں سے فراغت کا حکم نامہ ملا وہاں اُسی حکم کے ذریعے انجینئر ولیم سینٹ جان گالوے کو اُس کا جانشین مقرر کر دیا گیا۔ جان کا خیال تھا اِس سے زیادہ تکلیف دہ لمحہ شاید ہی اُس کی زندگی میں آیا ہو لیکن یہ خیال شام ڈھلتے ہی اُس وقت خام ثابت ہوا کہ جب بہاول پور پہنچنے پر ایما نے اُس سے ملنے سے انکار کر دیا۔

اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایما بھی اُس کو سمجھنے میں غلطی کر سکتی ہے۔ دن بھر ہمہ قسم اعصاب شکن خبریں، رسوائیاں، تذلیل اور قدم قدم ندامتیں محض اِس لیے برداشت ہوتی رہیں کہ کم از کم وہ شام کو ایما کے سامنے تو سر اُٹھا کر بیٹھ سکے گا۔ زمانہ چاہے یقین کرے نہ کرے ایما تو ہر حال میں اُسی کی بات کو سچ مانے گی۔ ایما ہی تو اُس کی طاقت تھی اور ایما ہی اُس کا حوصلہ کہ جس کے ہوتے ہوئے وہ ہر طرح کے بہتان کا مقابلہ کر سکتا تھا مگر ایما کے رویے نے اُسے توڑ کر رکھ دیا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اُس کے تصور سے بھی ماورا تھا۔ جان سے چند لمحوں کے لیے بھی اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہوا تو وہ وہیں ایما کے گھر کے سامنے پختہ چبوترے پر بیٹھ گیا جس کے چاروں کونوں پر پتھر سے تراشے گئے ببر شیر کے کھلے ہوئے منہ نصب تھے۔ برطانوی راج کی اِس علامت کو دیکھ کر جان کا دل بھر آیا جسے دنیا کے کونے کونے تک پھیلانے اور اُسے استحکام اور دوام دینے کے لیے اُس جیسے لاکھوں بیٹے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے مگر اُن کا کوئی دشمن نہیں سوائے اپنوں کے جو سازشوں کے ہتھیار سے لیس ہر وقت اُن کی گھات میں رہتے ہیں۔ جان برنٹن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اگر یہی حال رہا تو تاج برطانیہ کے اقتدار کا کیا بنے گا۔ ”تو کیا تاج برطانیہ صرف ایک ریلوے انجینئر کی ملازمت باقی رہنے یا نہ رہنے پر ٹکا ہوا ہے کہ وہ ہے تو برٹش حاکمیت بھی ہے اور اگر وہ نہیں تو برٹش حاکمیت بھی نہیں؟“

اگر چہ یہ آواز جان برٹن کے اندر سے کہیں گونجی تھی مگر وہ اِس پر دھیان دیے بغیر اپنی بنیادی بات ہی کو تسلسل سے سوچے جا رہا تھا مگر اِس شبے کے ساتھ کہ ہوسکتا ہے برٹش راج ایک معمولی ریلوے انجینئر کی ملازمت کے باقی رہنے یا نہ رہنے کا محتاج نہ ہو مگر جس طور اور جس طریقے سے اُسے اِنڈس اسٹیٹ ریلوے سے نکالا جا رہا تھا، وہ رویہ، وہ طریقہ، وہ طرزِ عمل ضرور ایسا تھا کہ جس کے ہوتے ہوئے بہت بڑی ایمپائرز بھی زمیں بوس ہوتی رہی ہیں۔ کسی حکومت کے عمال ہی اُس حکومت کی آبرو ہوتے ہیں اور اگر وہی عمال ہی بوجوہِ سازش اور باہمی خلفشار ایک دوسرے کو کارِ مذلت میں دھکیلتے رہیں تو حکومتوں کو اپنی بقا کا اہتمام کیے رکھنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ اکثر ناممکن ہو جاتا ہے۔

جان برٹن کو نجانے کیوں یقین تھا کہ وقتی غصے کے ہوتے ہوئے بھی ابھی کچھ دیر میں ایما مین گیٹ پر آئے گی اور اُسے کبیدہ نگاہی سے دیکھتے ہوئے بن بلائے واپس اندر تو چلی جائے گی مگر دروازہ کھلا رکھتے ہوئے کہ وہ اندر جا کر اُسے منا سکے۔ لیکن دو سے زیادہ گھنٹے گزر جانے کے باوجود ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ نہ تو دروازہ کھلا اور نہ ہی ایما مین گیٹ پر آئی اور نہ ہی دروازہ کھلا چھوڑ کر رکھا گیا کہ جان اندر جا سکے۔ انتظار نے طول کھینچا تو جان کے لیے وہاں بیٹھنا ممکن نہ رہا۔ مچھروں کا اُس کے اردگرد چکراتے رہنا تو ایک طرف رہا خود اُسے ایک دم بہت سی ضرورتوں کی شدید طلب نے چکرا کر رکھ دیا۔ اُسے بیک وقت کافی، تمباکو اور شراب کی طلب نے شدت سے گھیر لیا تھا جن میں سب سے بالا طلب ایما کے قرب کی تھی۔ شادی کے بعد سے ایما نے جان پر اپنا عورت ہونا اِس طرح منکشف کرنا شروع کر رکھا تھا کہ ہر آنے والی شب اُس پر ایک نئی عورت، نئے ڈھب سے، نئے چلتروں سے مرصع ہو کر اپنا آپ ظاہر ہی نہیں بلکہ ثابت کرنے کی کوشش میں حد سے گزر جاتی۔ یہ وہ لمحہ ہوتا کہ جب ڈھلتی عمر کے انجینئر کو اپنے دل کی دھڑکن اُن حدوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی جس کے بعد اُس کے خون کے بہاؤ میں نادر ہارمونز اپنی اپنی سرمستیوں کو گھولنا شروع کر کے اُس کے جسمانی تلذذ کو اُن منزلوں کا شناور کر دیتے جہاں سے اپنی خبر کا آنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ جب کسی شب اِس نوعیت کا مکاشفہ نہ ہو پاتا تو جان کا بدن اُس کھلاڑی کی طرح

ٹوٹنے لگتا جس کی رگوں میں یہ مُنتہی ہارمونز اپنی راہ بنانے کی حد تک نہ جا سکے ہوں۔ اور آج جان کے ادھ موئے جسم کو اِسی غذائی قلت کا سامنا تھا۔ سر سے پاؤں تلک درد اور کچھ ایسا کہ جسم کے مسام مسام سے جان نکالی ہی نہیں کھینچ کھانچ کر نکالی جا رہی تھی۔

اِس کیفیت میں مایوسی اور استرداد نے کچھ ایسا رنگ دکھایا کہ جان برنٹن کے لیے قدم اُٹھانا دوبھر ہو گیا۔ ایما کے در کی چوکھٹ ہی اُمید کی وہ آخری سجدہ گاہ تھی جس کے بعد مایوسی کے پاتال کی سیڑھیاں نیچے کے رُخ اُترنا شروع ہو جاتی تھیں۔ ایما کے دل کا در نہیں کھلا تو مقدر کا دروازہ قفل در قفل مقفل ہونا شروع ہو گیا۔ ایسے میں مَیری کا گزرے دنوں کا رویہ بوسیدہ مکان کے مٹی ہو چکے ملبے کی طرح سر پر گرنا شروع ہوا تو اُس کے بیٹے ولیم آرتھر کی معاندانہ روش نے جان برنٹن کے قدموں کے نیچے سے وہ تختہ ہی کھٹاک سے کھول دیا جس پر دہ گلے میں ہزیمت کا پھندہ ڈالے اور چہرے پر رسوائی کا سیاہ ماسک چڑھائے دوبارہ سے زندگی پانے کا منتظر تھا۔ اِس پس منظر میں جان کو انجینئر ولیم سینٹ جان گالوے ایک ایسے مہربان فرشتے کی مانند دکھائی دیا جس نے کم از کم اُس کی پیٹھ میں خنجر نہیں گھونپا تھا۔ پُشت پر وار کرنے والوں میں اگر اُسے ولیم آرتھر دکھائی دے رہا تھا تو نجانے کیوں ایما بھی اُسے ولیم آرتھر کے پیچھے چھپی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ جان نے پختہ چبوترے سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اِسی کوشش میں کچی زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

## ٣٢

سنگری کی عدت گزرنے کا دورانیہ بستی کے واسطے بھی اجتماعی بیوگی کا تاثر لیے ہوئے تھا جہاں تقریباً ہر گھر میں انسانی سانحہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہی نہیں بلکہ برپا تھا۔ کہیں کوئی اِس طرح زخموں سے چور کہ چلنے پھرنے سے معذور، کہیں کسی کی گم شدگی کا ماتم تو کہیں کسی کی گرفتاری کے بعد گھر والوں پر غربت اور فاقہ کشی کا عذاب اِس طور نازل تھا کہ زندگی چکی کے بے دانہ پاٹوں کے بیچ پس رہی تھی۔ بہت کم ایسا تھا کہ کسی گھر میں پسماندگان کو اُن کے کھانے کمانے والے کی موت کا کوئی سراغ مل سکا اور وہ بین بان کر کرا کے چُپ ہو گئے۔ کچھ گھر بستی میں ایسے بھی تھے جہاں نہ تو کوئی سہارا باقی رہا اور نہ لواحقین کے ہاں ضبط کا یارا۔

مولوی جائز اللہ کے قتل نے بھی اُس کی چار بیواؤں اور اُن کی اولاد کے درمیان اَن دیکھے تناؤ کی چادر تان رکھی تھی۔ وراثت کی تقسیم نے جہاں بیواؤں اور بیٹیوں کو محروم رکھا وہاں بیواؤں کے ہاں بیٹوں کی تعداد نے بھی فتنے کا بیج بو دیا تھا۔ جس کے بیٹے کم تھے وہ اَندر واَندری اُس سے نالاں تھی جس کے بیٹے دو یا دو سے زیادہ تھے۔ یہ ''اَندرواَندری'' بھی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی تھی اور چھوٹے چھوٹے آپسی لڑائی جھگڑوں میں دل کی بات زبانوں پر آنے لگی۔ سنگری تک ان باتوں کی سُن گُن پہنچنے تو لگی تھی مگر وہ ابھی تک کسی جانب سے بھی فریق نہیں بن پائی تھی اور نہ ہی بننا چاہتی تھی۔ اُسے غرض تھی تو اپنے بچے کی پرورش کی حد تک نان نفقے سے، اِس سے زیادہ کچھ

نہیں۔ایسے میں اُسے اُلجھن تھی تو منگر کے بار بار کے رابطوں سے۔ وہ ہر اُس شخص کو اپنے بیٹے سے دور رکھنا چاہتی تھی کہ جو اُس کی زندگی یا پرورش کے لیے خطرہ بن سکے۔ منگر تو اُس کے لیے دوہرا عذاب تھا۔ایک جانب اُس کا آنا جانا مولوی جائز اللہ کے خاندان کو موقع دے سکتا تھا کہ وہ اُس پر من چاہی الزام تراشی کر سکیں اور دوسری جانب انگریز انتظامیہ بھی اُس کے گھر کا راستہ دیکھ سکتی تھی جو پہلے ہی منگر کے کردار اور معاملات کی ٹوہ میں تھی۔

اُدھر مولوی اللہ بخش کو چھوٹے زنان خانے میں سنگری کی ماں کا رہنا بھی کھلتا تھا۔ وہ دوسرے تیسرے دن اپنے باپ کی ایسی بیوہ کی خبر گیری کے لیے وہاں آتا تھا کہ جو عمر میں اُس سے بھی چھوٹی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سنگری اُس کے آنے کو اپنی خیر خواہی گردانتی مگر مولوی اللہ بخش کا آنا ہر بار اُس کے گرد کچھ اَن دیکھی زنجیریں لپیٹ جاتا۔ جوں جوں اُس کا آنا بڑھ رہا تھا توں توں زنجیروں کی جکڑن اور اُن کے بوجھ میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اِن اَن دیکھی جکڑنوں میں بہت سی نوک دار سلاخیں چھپی ہوئی ہوتی تھیں جو گزرنے والے وقت کے ساتھ ساتھ کچھ سوالوں کی صورت سنگری کے سامنے واضح ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اِن سوالوں میں سب سے برہنہ سوال جو اُس کی آنکھوں ناچ رہا ہوتا، اُسے سنگری کے علاوہ نہ تو کوئی دیکھ پاتا اور نہ ہی اِس کا مفہوم جان پاتا۔ اِس سوال کے جواب کا نہ ملنا کچھ اور سوالوں کا در کھولتا جس میں سب سے نمایاں سوال امانت کا چھ ماہیا پیدا ہونا تھا۔ مولوی اللہ بخش چبا چبا اور چبول چبول کر پوچھتا کہ ''ہَیں جی! سُنا تو یہ تھا کہ چھ ماہیا بچہ بچ نہیں پاتا.... مگر یہ امانت ہے، بہت خوش قسمت کہ چھ ماہیا پیدا ہو کر بھی ماشاءاللہ بچ بچا گیا ہے۔''

سنگری جوں ہی چوٹ کھا کر اُس کی طرف دیکھتی تو وہ ڈسنے والے انداز میں مسکرا دیتا۔

''ویسے ماشاءاللہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ چھ ماہیا پیدا ہوا ہے.... قدبُت سے تو پورا پکا نو مہینے کا۔'' پھر مزید زہر اُنڈیلنے کے واسطے مسکراہٹ کچھ اور گہری کر لیتا۔ ''ویسے اللہ بخشے حضرت والد صاحب بھی خوب تھے... صلہ رحمی میں تو حد سے گزر جاتے تھے۔''

سنگری جب یہ وار بھی برداشت کر جاتی تو جاتے جاتے اُس کی ماں ملوکاں سے دعا

سلام کرنا نہ بھولتا۔ ''بہت مہربانی ہے آپ کی جو بیٹی کا خیال رکھا ہوا ہے .... کون رکھتا ہے اتنا خیال آج کل اپنا گھر بار چھوڑ کر .... لوگوں کی نہ سُنیں .... لوگ تو باتیں کرتے رہتے ہیں ...اب بڑھاپے میں بیٹی ماں کو نہیں کھلائے گی تو کون کھلائے گا!'' ... ہر بار، بار بار یہی سوال اور یہی الفاظ۔ ملوکاں کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے تو سنگری کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک گالی ہوتی جو وہ باقی سارا دن با آواز بلند جا چکے مہربان کی نذر کرتی رہتی۔

گالیوں کا یہ سلسلہ شاید جلد ہی گالم گلوچ میں بدل جاتا اگر سنگری تک اُس سازش کی بو نہ پہنچ پاتی جس کی رو سے بڑے زنان خانے میں امانت کو جان سے مار دینے کی باتیں زیرِلب ہونے لگی تھیں۔ سنگری نے حالات کی اِس نوعیت کی کروٹ کے بارے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا اِس لیے بُری طرح ہراساں ہو چکی اِس چھوٹے زنان خانے کی بیوہ کے پاس دو ہی راستے بچے تھے کہ یا تو مولوی جارُاللہ کے خاندان میں سے کسی ایسے بااثر شخص کو قابو کر لے جس کے خوف سے کوئی اور اُنہیں نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ ہی نہ سکے اور یا پھر اپنے بیٹے کو لے کر یہاں سے اتنی دور چلی جائے کہ کسی کو یاد ہی نہ رہے کہ چھوٹا زنان خانہ کبھی آباد بھی ہوا تھا یا نہیں۔ سنگری نے ماں کو صورتِ حال سے آگاہ کیے بغیر اپنے طور ہی جس قدر غور کیا اُسے دوسرا راستہ ابھی قبل از وقت دکھائی دیا۔ لیکن پہلی راہ پر چلنا بھی اِس قدر مشکل کہ تقریباً ناممکن۔ مولوی مرحوم کے خاندان سے جو کسی کا بنا اور بگاڑ سکتا تھا وہ اُس کا بڑا بیٹا مولوی اللہ بخش تھا لیکن اُس کا جتنا کردار اب تک سنگری کے سامنے آ چکا تھا اُس میں سے اپنے بچ نکلنے کی راہ نکالنا ایسے ہی تھا کہ جیسے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈال کر ہیروں کا ہار نکالنے کی کوشش کی جائے۔ وہ تو پہلے ہی اُسے اُس نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا کہ جیسے اپنے باپ کی بیوہ کو دیکھا جائے مگر اِس سے بھی بدتر اُس کا پیدا کردہ ملفوف خوف تھا جس کے ذریعے وہ امانت کو ناجائز اولاد ثابت کرنے کی دھمکی دے کر سنگری سے راہ و رسم بڑھانا چاہتا تھا۔ بہ صورت دیگر وہ کیا کر سکتا تھا، یہ پیغام وہ اچھی طرح سنگری تک پہنچا چکا تھا، کبھی اشارے کنایے سے اور کبھی طنزیہ جملوں کے تند مگر اوچھے وار سے کہ جنہیں صرف وہی سمجھ پاتی۔

بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے مولوی اللہ بخش کو تھوڑی ڈھیل دے کر دیکھنے کی کوشش

کی۔ پہلے وہ جن باتوں پر بظاہر کوئی نوٹس نہ لے کر اُن پر برا منائے جانے کا باقاعدہ اشتہار لگاتی تھی، اب اُن تمام باتوں کو سُن کر اُس نے کبھی ہلکی اور کبھی ہلکی سے کچھ زیادہ مسکان دینی شروع کر دی۔ اِس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ مولوی اللہ بخش نے امانت کے چھ ماہیا پیدا ہونے اور ملوکاں کو بیٹی کے گھر رہنے پر طنز و تشنیع کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ وہ حیران بھی تھا، خوش اور پُر جوش بھی۔ سنگری نے کچھ اور ڈھیل دی تو گھر میں وافر مقدار میں اناج اور اشیائے خورد نوش کی آمد ہونے لگی۔ خود مولوی اللہ بخش نے سنگری کے گھر پہلے روزانہ اور پھر دن میں کبھی دو اور کبھی تین مرتبہ آنا شروع کر دیا۔ ملوکاں مولوی اللہ بخش کی بڑھتی ہوئی مہربانیوں کو غور سے دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ اُسے یہ بھی ادراک تھا کہ اُس کے سنگری کے گھر قیام پر ناک بھوں چڑھانے والا اب ہنستے مسکراتے اُس کی خیر خیریت پوچھنے لگا تھا۔ اللہ بخش کے رویّے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے اُس نے کب تک بے خبر رہنا تھا۔ معمولی سے گویڑ نے کھرا سنگری کی مُسکان تک پہنچا دیا تو ملوکاں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''دو دھیلے کی روٹی کی اتنی بڑی قیمت؟''

سنگری نے ماں کے تیور دیکھے تو اُس کے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگی۔ ''یہ سب لوگ مل کر میرے منتو کو جانوں مار دینا چاہتے ہیں تا کہ مولوی کی وراثت اُس تک نہ پہنچے..... جب کہ یہ بخشو مجھ پر بدکاری کا الزام لگا کر اِس گھر سے نکالنے کے درپے ہے تو بتا میں کیا کروں؟ مجھے اپنے طریقے سے کام کرنا آتا ہے..... بس تو مجھ پر بھروسا کر..... میں کوئی ٹھنڈا اگراں نہیں کہ جو چاہے مجھے نِگل لے..... میں تو تر کنڈ مچھی کا کنڈا ہوں، ایک بار گلے میں پھنس گئی تو گلا چیر کر باہر آتی ہوں۔'' سنگری نے آنسو پونچھتے ہوئے ماں کے گوڈے پر سَر تو رکھ دیا لیکن اُس کی طرف دیکھے بغیر محسوس کر رہی تھی کہ اُسے بیٹی کی بات پر بھروسا نہیں۔

ملوکاں کچھ دیر تک تو سنگری کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی رہی۔ وہ بھی بیٹی کے سر کے سیک سے سمجھ رہی تھی کہ کہنے کو تو وہ بہت کچھ کہہ گئی ہے مگر ہے بالکل ہی یَبل، اُصلوں کملی۔ اُسے اپنے کہے پر بھی اعتماد نہیں۔ وہ نہیں جانتی کہ مرد ذات کتنی شاطر ہے؟ یہ میسنا مکار اپنا نقصان کر کے بھی فائدے میں رہتا ہے۔ خود لُٹ کر بھی عورت کو لوٹ لیتا ہے۔ یہ ہر چیز داؤ پر لگا دیتا ہے، گھر

بار، عہدہ سرکار، ملک بادشاہی حتیٰ کہ اپنا آپ بھی محض اُس عورت کی چمڑی تک رسائی کے لیے۔ جس کی صورت اُس کی آنکھ کے شیشے میں اُکر آئے یا نقش ہو جائے، یہ اُسے قبر تک نہیں چھوڑتا۔

سنگری کو اپنے سر کے بالوں میں ماں کی اُنگلیوں کا لمس اُن کے گھماؤ سے الگ محسوس ہوا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''ماں جو تو سمجھ رہی ہے ویسا کچھ بھی نہیں۔ جانتی ہوں کہ تو مجھے کمزور اور کم عقل سمجھتی ہے، ہے نا!''.... سنگری نے ماں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو اُس نے نگاہیں پھیر لیں۔ ''یہ مولوی بخشو بھی مجھے کمزور اور کم عقل سمجھتا ہے۔ ایک وہ کیا سارے مرد ہر جوان لڑکی کو کمزور اور کم عقل سمجھ کر دانہ پھینک رہے ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ لڑکیاں بھی اُنہیں اپنے کمزور اور کم عقل ہونے کا واپسی دانہ پھینک کر اُن کے یقین کو پکا کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ جو مرد ہوتا ہے نا! یہ بڑے فخر سے ہر عورت کے بارے میں اپنا ایک اندازہ لگاتا ہے، ایک رائے قائم کرتا ہے جب کہ عورت اُس کا وہی اندازہ، اپنے انکار کے جال میں لپیٹ کر اُس کے راستے میں بچھا دیتی ہے اور پھر صبر سے اُس کے پھنسنے اور لٹکنے کا انتظار شروع کر دیتی ہے۔ کون سی طلبیدہ عورت ہے جو نہیں جانتی کہ مرد کی ساری طلب، ساری رغبت اُس وقت تک ہے کہ جب تک وہ عورت حالتِ انکار میں ہے، جب تک وہ مرد کی ذات کی نفی کرتی رہے گی، اُس کے ہونے کے احساس کو رگیدتی رہے گی، وہ اُس کا طواف کرتا رہے گا مگر جوں ہی وہ مرد کے وجود اور اُس کی خواہش کے راستے سے انکار کا کانٹا نکال پھینکے گی، وہ اُسے طوائف بنا دے گا، جسمانی لحاظ سے بھی اور ذہنی طور پر بھی۔ اور ماں! اِسی لیے میں نے بخشو کی خواہش کے راستے میں سے انکار کے کنڈے پر مٹی ڈال دی ہے، اِس طرح کہ وہ موجود بھی ہو اور اُس بد بخت کو دکھائی بھی نہ دے۔ یوں اِس مُشکی کا پھیلا ہوا پھن، اُس کے انکاری نہ ہونے کے سبب، مزید پھیلنے کے بجائے اوقات میں آتا جائے گا اور پھر اپنی راہ لے گا۔''

''تو تو کملی ہے میری دھی! یہ مرد مُوا اِقرار کا ہے اور نہ ہی انکار کا اور نہ ہی اِس کا کوئی سِدھا پُٹھا۔ بخشو تو ہے ہی بے غیرت، تو دیکھ! کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو منہ دکھانے جوگی بھی نہ رہے۔ ویسے بھی تیری عدت ختم ہونے میں دو دن باقی رہ گئے ہیں، میری مان تو کچھ دن ٹھہر کر منگر سے حق

کر لے۔ وہ تجھے بھی پال لے گا اور تیرے بیٹے کو بھی۔''

ملوکاں نے بات کیا کی، اُس کے قدموں میں بیٹھی سنگری تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ ''اگر وہ کسی جوگا ہوتا تو میں یہ کالک پہلے ہی اپنے منہ پر نہ پھیر لیتی۔ مجھے کیا پڑی تھی اُس بوڑھے ریچھ کے سامنے چَڈّے کھولنے کی۔ ہے تو تو میری ماں مگر سمجھ تجھے ککھ کی نہیں، اِسی لیے ساری زندگی میرے باپ سے جوتے کھاتی رہی.... وہ تو خداؤں اُسے آئی تو تیری جان چھوٹ گئی ورنہ جوتے کھا کھا کر قبر میں اُس کی جگہ اب تو پڑی ہوتی اور وہ میرے وَٹے میں کسی چھوہر سے حق کر کے اُس کی چَس لے رہا ہوتا۔'' سنگری پھر سے ماں کے گوڈے کے ساتھ لپٹ کر زمین پر بیٹھ گئی اور اُسے سمجھانے کے سے انداز میں کہنے لگی۔

''مرد تو وہ کسی کام کا ہوتا ہے جو عورت کے تَرلے نہ کرے، نیچے لگا کے رکھے مگر پیار سے۔ تھپڑ مارے مگر جوتا نہیں۔ خود بے شک مار مار کر نیلو نیل کر دے، چمڑی اُدھیڑ دے مگر کسی اور کو اُنگلی نہ کھڑی کرنے دے۔ بستی کا وَڈ کا بھلے سے نہ ہو مگر وَڈکوں جیسا ہو، وہ گالیاں بھی دے تو کانوں میں ماکھی ٹپکے، ظلم کرے تو اُس پر پیار آئے۔ وہ قدم بھرے تو بھوئیں کو کانبا ہو۔ چاند نکلے تو وہ مُشکی سانپ کی طرح کالا لگے اور رات کالی ہو تو چاند بن جائے۔ پوہ میں ٹھنڈی لُوری چلے یا ہاڑ میں تتی لُو تو پورا پنڈا اُس کی تانگھ میں ہُوں ہُوں کرنے لگے۔ بدل گرجے تو وہ یاد آئے اور دریا چڑھے تو اُس کا سینہ سامنے ہو۔''

ملوکاں حیرت سے سنگری کی طرف یوں دیکھے جا رہی تھی کہ جیسے اُس کے اندر کوئی جِن حلول کرنے کے بعد اپنی جناتی زبان بولے جا رہا ہو۔ ایسی باتیں اُسے بھی جوانی میں محسوس تو ضرور ہوئی تھیں لیکن انہیں بولا کیسے اور کن لفظوں میں جاتا ہے، اِس کی اُسے کبھی خبر ہی نہ ہوئی۔ اُسے تو حیرت اِس بات پر بھی تھی کہ سنگری نے یہ باتیں کب اور کس سے سیکھ لیں؟ کیا مولوی جارُاللہ نے اُسے یہ سب کچھ سِکھا دیا؟ لیکن مولوی کو خود کہاں یہ باتیں معلوم کہ جو صرف ایک عورت ہی جانتی ہے مگر کہہ نہیں پاتی۔ ملوکاں نے سُن رکھا تھا کہ جو عورتیں ایسی باتیں سمجھ لیتی ہیں اور بول بھی لیتی ہیں، وہ زندہ نہیں رہ پاتیں، جوانی ہی میں ماری جاتی ہیں۔

''کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہے؟ کس نے سکھائی ہیں یہ تمہیں یہ گندی باتیں؟ بھول جا اِن کو، یاد رکھے گی تو ماری جائے گی۔ اور ہاں جیسا مرد تو چاہتی ہے نا! ایسے مرد صرف خوابوں میں ہوتے ہیں اور یہ جوتڑ لے والے ہر ویلے بُجے کھبے غٹرغوں کرتے رہتے ہیں نا! یہی ٹھیک ہوتے ہیں۔ عورت کو زندگی میں کبھی نہ کبھی اِن تڑلے والوں کی ضرورت ضرور پڑتی ہے مگر اُس وقت یہ تڑلے والے بھی نہیں ملتے صرف جوتے والے رہ جاتے ہیں قسمت میں.... جو چمڑی بھی اُدھیڑتے ہیں اور ذلیل بھی رَج کے کرتے ہیں۔''

''اُو میری اماں! تو تو جانتی ہے کہ یہ باتیں ہمیں اور کوئی نہیں سکھاتا، پیدا ہوتے ہی ہمارا عورت ہونا ہمیں یہ سبق پڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اب تو مکرے تو اور بات ورنہ یہ باتیں تجھے بھی معلوم ہیں اور مجھے بھی معلوم ہوتی جا رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تو انہیں زبان سے نکالنا نہیں چاہتی اور مجھے وہ حرامی سیدا زبان سے نکالنا سکھا گیا ہے۔ وہ ویسا ہی مرد تھا کہ جیسا میری طرح کی عورت کو چاہیے ہوتا ہے مگر اُس دھی چود کو میری ''نہ'' کو سمجھنا ہی نہیں آیا، بجائے میری چمڑی اُدھیڑنے کے، میرے اندر ہی تھوک کر چلا گیا اور وہ بھی زبردستی۔ اِن بھڑوے مردوں کو پتا ہی نہیں کہ عورت ہے کیا اور چاہتی کیا ہے؟ یہ عورت کو اُس کے چڈے چیر کر فتح کرنا چاہتے ہیں جب کہ عورت کہتی ہے کہ میرا دل چیر کر مجھے فتح کرو مگر یہ حرامی اپنی آکڑ خانی قائم رکھنے کے چکر میں نہ دیکھ پاتے ہیں اور نہ سُن پاتے ہیں، بس تڑلے کرتے ہیں، تلوے چاٹتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہ بن سکے تو جانوں مار دیتے ہیں۔''

ملوکاں بیٹی کی بات میں سیدے کے ذکر پر چونک اُٹھی تھی۔ اُسے پہلے ہی سے شک تھا کہ بستی میں تقریباً ایک برس قبل ہونے والے ریلوے لائن کے فسادات کے دنوں میں سنگری کے مزاج میں آنے والی تبدیلی اور اُس کے غیر لچک دار رویے میں اپنی گم شدگی کے باوجود کہیں نہ کہیں سیدا ضرور موجود تھا۔ سیدے کے ذکر کے بعد بیٹی کی زبانی ہونے والی باتوں کو وہ سُن تو رہی تھی مگر سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اُس کا دماغ سیدے سے آگے نہ تو کچھ سوچنے کو تیار تھا اور نہ ہی کچھ سمجھنے کو۔ جس روز پرانے قبرستان کے معاملے پر انگریز سرکار کی فوج نے بستی پر حملہ کیا اُس روز صبح سویرے

سنگری کا اُسے پریشان حالت میں ملنا بار بار یاد آ رہا تھا۔ سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ صدمے کی انتہائی حالت سے گزرتی ہوئی سنگری نجانے کیوں اُس کے اندر وہ حس نہ جگا سکی جو کسی انہونی کے ہو چکنے کے بعد گھر کے متعلقہ ترین افراد خاص طور پر ماں کے اندر جاگنی چاہیے تھی۔ ملوکاں اب اپنی سوچوں کی حساسیت کی بنیاد پر بالکل یقین سے کہہ سکتی تھی کہ سنگری کی زندگی میں جو بھی تبدیلی آئی تھی وہ اُسی روز کی دین تھی۔

''مگر ہوا کیا تھا؟..... کب ہوا تھا؟ سنگری تو رات بھر گھر پہ تھی..... تو کیا سیدا بھی اُس رات اُن کے گھر پر رہا تھا؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا سنگری تو اُس رات گھر سے باہر نہیں رہی؟ جب اُس نے سنگری کو عجیب سی حالت میں دیکھا کیا اُس وقت تو وہ گھر میں داخل نہیں ہو رہی تھی؟ اگر ایسا تھا تو وہ رات بھر کہاں رہی؟ کس کے ساتھ رہی؟..... سوالات کا ازدحام تھا جو ملوکاں کے ذہن کو جکڑے ہوئے تھا۔ اتنے میں اُس کی نگاہ روتے بسورتے ہوئے امانت پر جا پڑی جسے دودھ پلانے کے لیے اگرچہ سنگری اپنی قمیض کو تیزی سے اوپر کی طرف کھینچ رہی تھی مگر بھوک سے اُتاولا ہوا بچہ خوش ہوتے ہوئے بھی روئے چلا جا رہا تھا۔ ''تو کیا یہ حرامی سیدے کا نطفہ ہے؟'' ملوکاں کا سر بری طرح چکرانے لگا تھا۔

بچے کو دودھ پلاتی سنگری نے ماں کی طرف دیکھا۔ اگرچہ بظاہر وہ بے خیالی میں بیٹھی ہوئی تھی مگر اُس کی آنکھیں عجیب سے انداز میں امانت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ سنگری کو ماں کی آنکھیں بچے کے بجائے اپنے بدن میں چھید کرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ نجانے وہ کون سا احساس تھا جس کے تحت وہ اپنی ماں کی آنکھوں میں جھانکنے سے کترا رہی تھی۔ وہ ماں سے کہنا چاہ رہی تھی کہ امانت کو اِس طرح نہ دیکھے، نظر لگ جاتی ہے مگر وہ کہہ نہیں پا رہی تھی شاید اِس لیے کہ جانتی تھی کہ اِس طرح کے دیکھنے سے نظر نہیں لگتی۔ اتنے میں امانت کا سانس اُسے گڑبڑاتا ہوا محسوس ہوا۔ دودھ شاید اُس کی سانس کی نالی میں چلا گیا تھا۔ امانت کو اُتھڑوں آنے سے گھبرائی ہوئی سنگری نے جلدی سے اُسے بائیں کندھے سے لگا کر کمر پر چھوٹی چھوٹی تھپکیاں دی کہ دودھ کا آوارہ قطرہ سانس کی نالی سے نکل جائے۔ امانت دو تین بار ہلکا سا کھانسا، سانس بحال ہوئی تو وہ پھر سے دودھ

کے لیے رونے لگا۔ سنگری نے دوبارہ سے گود میں لٹا کر اب کے دایاں تھن اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اِس سارے عمل میں اُس کی آنکھیں بدستور ماں کے چہرے پر مرکوز رہیں۔ اب کے اُسے ماں کی آنکھوں نے بتا دیا کہ وہ سیدے کے کُھرے تئیں پہنچ چکی ہے۔



# ۳۳

جان برنٹن کو ہوش آیا تو وہ اِنڈس اسٹیٹ ریلوے کے بہاول پور آفس کی ڈسپنسری میں ایک بستر پر دراز تھا جہاں اُس کی تیمارداری کے لیے سوائے ایک میل نرس کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ جان کی آنکھیں کھلیں تو وہ کچھ دیر کے لیے اپنی یاداشت میں موجود آخری منظر نامے کو موجودہ منظر پر منطبق کرتے ہوئے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا مگر پھر بھی کچھ نہ سمجھ پایا۔ اُس کی آنکھوں کا اجنبی پَن بدستور باقی رہا۔ میل نرس نے ہوش میں آنے کے بعد بھی جان برنٹن کو کھوئی کھوئی سی حالت میں دیکھا تو اُس کے قریب آ کر کہا ''مسٹر جان! آپ ٹھیک ٹھاک ہیں اور کمپنی کی ڈسپنسری میں ہیں۔ دراصل آپ ڈپریشن اور نقاہت کے سبب بے ہوشی نما کیفیت میں تھے۔ اب آپ ٹھیک ہیں، چاہیں تو رات یہیں قیام کریں اور اگر گھر جانا چاہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔''

میل نرس کی بات سُن کر جان نے سامنے کی دیوار کو غور سے دیکھا اور پھر کچھ تلاش کرنے کی جستجو میں اِدھر اُدھر نگاہیں پھیریں۔ میل نرس مسکرا دیا۔ ''آپ شاید وال کلاک ڈھونڈ رہے ہیں۔'' پھر اُس نے اپنی گھڑی کو دیکھا اور کہا کہ اِس وقت رات کے نو بجنے والے ہیں۔'' جان نے اپنی جوابی مسکراہٹ سے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کی تو اُٹھا نہ گیا۔ ایک بار پھر میل نرس نے اُسے سہارا دے کر بستر پر نیم دراز کر دیا۔

''کوئی مجھے ملنے تو نہیں آیا؟'' یہ پوچھتے ہوئے مضمحل چہرے والے جان برنٹن کی

آنکھوں میں چمک سی جاگ اُٹھی تھی۔ ''کیا کسی نے آنا تھا؟'' میل نرس نے بھی سوال کے جواب میں سوال ہی کر دیا کہ شاید یہی مناسب جواب تھا۔ جان کی آنکھوں کی چمک پھر سے ماند پڑ گئی۔ اپنے بیٹے ولیم آرتھر سے تو شاید اُسے کوئی توقع نہیں رہی تھی لیکن ایما کی جانب سے ایسی بے اعتنائی کا اُس نے سوچا نہیں تھا۔ کیا ہوا کہ اُس کے خلاف دفتری اوقات میں ایک خانہ بدوش لڑکی کی صحبت میں رہنے کا اسکینڈل بنا دیا گیا تھا مگر ایما تو جانتی تھی کہ وہ ایسا نہیں تھا۔ ایک رمز شناس بیوی ہونے کے ناتے اُسے تو اُس کی صفائی میں سب سے آگے ہونا چاہیے تھا نہ کہ وہ اُس کا موقف سُنے بغیر ہی تمام تعلق توڑ لے۔ وہ ایما کے گھر کے سامنے کئی گھنٹے کچے چبوترے پر بیٹھا رہا اور پھر وہاں سے اُٹھتے ہوئے نیچے گر کر بے ہوش ہوا تو ایسے میں کیسے ممکن ہے کہ اُسے خبر نہ ہوئی ہو؟ جان برنٹن بُجھ کر رہ گیا۔

''میں آج رات اِدھر ہی رہوں گا۔'' جان برنٹن نے نیم دراز حالت میں آنکھیں موند لیں۔ یہ کہتے ہوئے شاید وہ میل نرس سے آنکھیں نہیں ملانا چاہتا تھا۔ ''بہتر! میں آپ کے لیے کھانا بھجواتا ہوں''..... میل نرس نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر اُس کے گھٹنوں تک چادر پھیلائی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ جان برنٹن نے اگرچہ دن بھر کچھ نہیں کھایا تھا مگر کھانے کی طلب اب بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ جن چیزوں کی طلب وہ محسوس کر رہا تھا وہ یہاں ڈسپنسری میں مہیا نہیں ہو سکتی تھیں۔ ہاں مگر ایما کی موجودگی اُسے اِن تمام ضرورتوں سے بے نیاز کر سکتی تھی لیکن بظاہر لگ یہی رہا تھا کہ ایما ہی اُس سے بے نیاز ہو چکی ہے۔

جان برنٹن کے سامنے اِس وقت سب سے بڑا سوال اُس کے اطمینان بخش ٹھکانے کا تھا۔ اگرچہ اپنے خلاف محکمانہ کارروائی کے اختتام تک وہ نہ صرف کمپنی کے سائٹ آفس میں بدستور رہائش رکھ سکتا تھا بلکہ کمپنی کے بہاول پور آفس میں بھی اُسے قیام کی یہ سہولت حاصل تھی۔ لیکن اُس کے لیے اِن دونوں جگہوں پر رہنا کارِ مذلت دکھائی دے رہا تھا۔ آج سے پہلے اُس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ کوٹری سے ملتان تک ریلوے ٹریک بچھائے جانے کے پروجیکٹ کی تکمیل سے پہلے ہی وہ اِس طرح ذہنی طور پر بے گھر کر دیا جائے گا کہ اُسے اپنی دفتری رہائش گاہ میں قیام کرنے میں

بھی اجنبیت اور اوپرے پن کا سامنا ہوگا۔ اُس نے شاید اپنے قیام کے مسئلے کو اِس لیے بھی ترجیحات میں سرفہرست کرلیا تھا کہ اب وہ ایما کے تصور تک کو بھی اپنے اندر سے کھرچ ڈالنا چاہتا تھا۔ اب تک اُس کی زندگی میں دو عورتیں اُس کی شریکِ حیات بن کر آئیں مگر دونوں نے نہ صرف اُس کی حیات بلکہ اُس کی وجودیت کی بھی نفی چاہی۔ وہ حیران تھا کہ انسانی تعامل کا یہ کون سا پہلو ہے جس میں ایک صنف دوسری صنف کی وجودیت سے وجود پا کر پھر اُسی وجودیت کی ہی منکر ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے ملاپ سے تشکیل پانے والے سنجوگ کا ملیا میٹ کر دیا جانا ہی بقا کی آخری صورت بن کر رہ جاتا ہے۔ مَیری اور ایما دونوں نے سنجوگ کے اِس کھیل میں صرف اپنی بقا کو ہی پیشِ نظر رکھا۔ ایما نے جان برنٹن کو اپنی زندگی میں سمونے کے نام پر وہی کام کیا جو مَیری نے اُسے ازدواجی زندگی کی دوئی میں سے نکال باہر پھینک کر انجام دیا تھا۔ اِس مہم جوئی کا مطلوب نتیجہ تو ایک سا تھا مگر اُس تک پہنچنے کا راستہ اور طریقہ کار جدا۔

جان برنٹن کو یوں لگا کہ عورت اُس کے لیے سگار اور شراب کے بعد جسمانی اشتہا کے بحران کا محض تیسرا انحصار یہ تھی۔ اگرچہ مَیری سے شادی کے وقت نہ تو اُس کی زندگی میں سگار تھا اور نہ ہی شراب مگر اِن دونوں کا اُس کی زندگی میں در آنا اُس عذاب سے نجات کا وسیلہ تھا جو مَیری کی صورت میں اُس پر نازل ہو چکا تھا۔ لیکن اِس کے برعکس ایما کا اُس میں دل میں گھر کر کے سگار اور شراب سے نجات دلانا کہیں اُس پر انحصار ہو جانے کی انتہائی صورت تھی۔ کیا المیہ تھا کہ ایک عورت نے اُسے خود سے بددل کر کے سگار اور شراب کی راہ پر لگایا اور دوسری نے شراب اور سگار سے چھڑا کر اپنے آپ سے جوڑ لیا۔ ہر دو صورتوں میں اگر کوئی بے حیثیت ہوا اور بے حیثیت ہی رہا تو وہ جان برنٹن تھا۔ پیشہ ورانہ اوجِ کمال پر پہنچا ہوا ریلوے ٹریک انجینئر جسے دشوار گزار جگہوں سے ریلوے لائن گزارنے کا ہنر آتا تھا۔

جان برنٹن نے اپنے آپ کو اُس صورتِ حال میں گھرا پایا جس میں گرفتگی کے بعد ہستی، نیستی کی طرف لڑھکنا شروع کر دیتی ہے۔ فنا کے خلاف مزاحمت کے اِن لمحات میں نجانے کون سے ہارمونز اُس کے دورانِ خون میں اُنڈ لنے کے واسطے اپنے بہاؤ کی جانب اِس طرح لپکے کہ اُس کے

اندر کا بے نفس ہوا شخص جہدِ زیست کو تیار ہونے لگا۔ جان نے اُنہی چند لمحوں میں پورے تیقن کے ساتھ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے خلاف ہونے والی انکوائری کا بھرپور طریقے سے دفاع کرے گا اور ہاں اِس دوران کہیں اور رہنے کے بجائے وہ اِنڈس اسٹیٹ ریلوے کے سائٹ آفس میں ہی رہائش رکھے گا، سب کے سامنے اور سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے دھڑلے سے۔ کیا ہوا کہ اُس کے پاس وقتی طور پر سائٹ پر اپنے فرائض سرنجام دینے کا اختیار نہیں رہا مگر ہے تو کمپنی کا آفیسر نا جسے نکال باہر کرنے کی کوشش میں کمپنی آپ اپنے کپڑے اُتارے چلی جا رہی تھی۔

اِن فیصلوں کے بعد جوں ہی جان مارٹن اُس بُری طرح اُلجھی ہوئی صورتِ حال سے باہر نکلا اُس کے اندر کا حریفانہ وار جستجو کرنے والا انسان بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے آپ کو تیس برس پہلے والا جان برنٹن محسوس کر رہا تھا کہ جو صرف اپنی حوصلہ نہ ہارنے والی سرشت کے نتیجے میں ناممکن کو ممکن بنا لیا کرتا تھا۔ یہ عمر کا وہ دور تھا جس میں ابھی تک کوئی عورت اُس کی زندگی میں دخیل نہیں ہوئی تھی اور اب کے پھر ایک بار اُس کی زندگی میں کوئی عورت نہیں تھی۔ شاید وہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ زندگی پھر سے سہاروں پر اُستوار ہو یا اُسے اپنے پروفیشن کی بجائے کسی ایسے رشتے کے لیے زندہ رہنا پڑے جو سرے سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ اب وہ رشتوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ کسی بھی قسم کے رشتے یا تعلق کے بارے میں کچھ بھی نہیں۔ جان کو محسوس ہو رہا تھا کہ توانائی اُس کے اندر یکسو ہو رہی ہے اور جسم کا بھاری ہو چکا ریشہ ریشہ اُسے قدم قدم گیند کی طرح اوپر اُچھالنے کو بے تاب ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد اُسے اپنے اوپر یقین کا اعتبار ہو چلا تھا۔

ایسے میں پہلا احساس جو بیدار ہوا وہ شدید بھوک کا تھا۔ جان کو یاد آیا کہ وہ میل نرس کو کھانے کا کہہ چکا ہے۔ اُس نے کسی کو بلانے کے لیے کمرے میں اِدھر اُدھر دستی گھنٹی کو تلاشنے کی کوشش کی تو دیکھا کہ سامنے تپائی پر کھانا چُنا ہوا تھا۔ شاید کوئی اِس طرح رکھ گیا کہ اُسے خبر تک نہ ہوئی۔ کمرے سے جڑے واش روم میں ہاتھ دھونے کے بعد وہ کھانے کی چھوٹی سی گول میز کی طرف بڑھا جس کے گرد دو کرسیوں کے رکھے جانے کی گنجائش تھی۔ کھانے کے دوران اُس نے ایک اور فیصلہ کیا کہ آج کی رات بھی ڈسپنسری کے اِس کمرے میں بسر نہیں کرنی۔ وہ اپنے حریفوں

کوخوشی کی اِس خبر سے بھی محروم کرنا چاہتا تھا کہ وہ بیمار ہے یا حوصلہ ہار چکا ہے۔

کھانے کے بعد جان نے میل نرس کو بلا کر اُسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا اور ڈسپنسری چھوڑنے سے متعلق کچھ رسمی کاغذات پر دستخط کر کے کمرے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ اُسے ہیڈ آفس سے کسی تعمیل کنندہ کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ جان برنٹن نے ڈاک منگائی تو وہ اُس کے اگلے دن صبح نو بجے بسلسلہ انکوائری ہیڈ آفس میں اتھارٹی کے سامنے پیش ہونے کا بلاوا تھا۔ جان نے میل نرس سے وقت معلوم کیا تو اُس نے دس بج چکنے کی خبر دی۔ وہ ایک بار پھر ذہنی دوعملی کا شکار ہونے لگا۔ اگلی صبح نو بجے پھر ہیڈ آفس آنے کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ سائٹ آفس جانے کے بجائے یہیں ڈسپنسری ہی میں رہ جائے۔ لیکن وہ سر جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ جان اب کسی طرح بھی اپنے ارادوں کو متزلزل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

رات بارہ بجے سے کچھ پہلے وہ اِنڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے سائٹ آفس کی حدود میں واقع اپنے خیمے میں اپنی مخصوص آرمز چیئر پر مکمل پرسکون چہرے اور متوازن ذہنی کیفیت کے ساتھ نیم دراز تھا اور اگلی صبح ٹھیک نو بجے کمپنی کے ہیڈ آفس میں ریجنل اتھارٹی کے کمرے سے ملحقہ انتظار گاہ میں مکمل ہشاش بشاش موجود تھا۔ اگلے لمحے اُسے اتھارٹی کے کمرے میں طلب کیا گیا جہاں ایما اور دو دیگر جونیئر آفیسرز موجود تھے۔ جان کو رسمی پروٹوکول کے تحت سب سے متعارف کرایا گیا اور درمیان میں رکھی کرسی پر بٹھانے کے بعد کمپنی کی پراسیکیوٹر ایما نے جان برنٹن کو اُس کے خلاف لگائے گئے الزامات پڑھ کر سنائے اور اُن کی صحت سے متعلق استفسار کیا۔ جان نے تو انکار ہی کرنا تھا۔ لہٰذا چارج شیٹ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اُسے اُس کے خلاف دستیاب شہادت کی تفصیل اور گواہان کے ناموں کی فہرست دی گئی اور انکوائری کی کارروائی کو استغاثہ کی شہادت کے لیے موخر کر دیا گیا گیا۔ اب کے جان کو دس دن کے بعد انکوائری آفیسر کے روبرو پیش ہونا تھا۔

جان کو چارج شیٹ پڑھ کر سنانے اور بعد کی رسمی کارروائی کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی ایما کے چہرے یا کسی اور جسمانی رویے سے ایسا نہیں لگا تھا کہ وہ جان برنٹن کو کبھی جانتی بھی تھی۔ اُس کا چہرہ عمومی دفتری تاثرات سے بھی عاری تھا کہ جو معمولاً اہلکاروں اور افسروں کے

چہروں پر درجہ بہ درجہ چپکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اِس دوران جان برنٹن نے بھی شاید اُسے ایک آدھ بار دیکھا ہو مگر صرف اُچٹتی ہوئی نگاہ سے اور بالکل اُسی کے سے انداز میں کہ کوئی شناسی سے کبھی گزرے ہی نہیں۔ جان برنٹن اگر آج اعصابی طور پر مضبوط تھا تو محض ایما کی بے مروتی کے ردِعمل میں۔ وگرنہ اِس دوران اُسے اپنے اندر کئی ایک بار دراڑیں سی پڑتی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن ہر بار اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ شاید وہ اپنے آپ کو ہر بار اُتنی مضبوطی سے نہ سنبھال پاتا اگر ایما کے چہرے پر لاتعلقی اتنی شدت سے محسوس نہ ہوتی۔

چارٹ شیٹ وصول کرنے کے بعد جان برنٹن انکوائری آفیسر کے کمرے سے نکلا تو صبح کے بمشکل ساڑھے نو ہوئے ہوں گے۔ مگر باہر نکلتے ہی اُس کی ساری بشاشت پژمردگی میں بدل گئی۔ وہ ایک بار پھر سے وہی جان برنٹن بنتا چلا جا رہا تھا جس کے ارادے متزلزل اور خود پر انحصار عنقا۔ اُسے پھر سے سگار اور شراب کی طلب ہونے لگی تھی کہ جن کا آخری سرا ایما سے جُڑا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ سائٹ آفس واپس جانا چاہتا تھا مگر اُس کے پاؤں بار بار ایما کے گھر کی جانب مڑنے لگے تھے۔ ایسے میں قوتِ ارادی ایک بار پھر اُس کے کام آئی اور ایما کا وہ لاتعلق چہرہ اُس کے روبرو لا کھڑا کیا کہ جو گذشتہ آدھے گھنٹے سے اُس کے سامنے رہا تھا۔ اگرچہ وہ عمر میں اُس سے آدھی سے بھی کم تھی مگر بے اعتنائی میں سنگدلی کی انتہا کو چھوتی ہوئی۔ ایما کی سرد آنکھوں اور منجمد چہرے کے تصور نے ایک بار پھر جان برنٹن کو اپنے قدموں پر رہنے کا حوصلہ دیا اور اُس کا رخ بجائے ایما کے گھر کے، کمپنی کے سائٹ آفس کی طرف ہو گیا کہ جہاں اُس کا اپنا کیمپ ٹھکانہ موجود تھا۔

کیمپ میں جاتے ہی وہ آرمز چیئر پر پھر سے نیم دراز ہو گیا اور آنکھیں موند لیں۔ تمام تر کوششوں کے باوجود ایما کا تصور پھر سے اُس کے سامنے موجود تھا مگر اب کے ایک نئے زاویے سے۔ جان سوچ رہا تھا آخر وہ کون سی کمی کا شکار ہے جس سبب ایما ایک اشتہا بن کر اُس کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے اور اُتارے نہیں اُترتی اور ٹیری کے ہاں ایسا کیا ہے کہ باہمی التفات کا بھرپور ماضی ہوتے ہوئے بھی اُسے اُس کی ضرورت تو کیا شناسائی تک کی آرزو نہیں رہی۔ یہ عورتوں کے پاس ایسا کیا ہوتا ہے کہ وہ پل بھر میں تعلقات کے چھتنار درخت کو جڑوں سے نکال

باہر پھینکتی ہیں اِس طرح کہ وہاں کی زمین بھی پَل بھر پہلے کسی درخت کے وجود کی گواہی دینے سے انکاری ہو جاتی ہے لیکن یہی واردات اگر مرد کرنا چاہے تو محض اوپری شاخوں کو ہی کاٹ چھانٹ سکتا ہے، تنا کاٹنے یا جڑیں نکالنے کا تو ذکر ہی کیا۔ ایسے میں برسوں پہلے کسی دوست کی کہی ہوئی بات اُسے یاد آئی کہ مرد اگر ترک تعلق کی بات کرتا ہے تو اس بارے ابھی سوچنا بھی شروع نہیں کیا ہوتا مگر جب عورت کرتی ہے تو پہلے سے ترکِ تعلق کر چکی ہوتی ہے۔

جان برنٹن کرسی سے اُٹھا اور بیتابانہ انداز میں اُس الماری کو کھنگالنے لگا کہ جہاں کبھی شراب رکھا کرتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی تلاش کے بعد آخر ایک بوتل اُس کے ہاتھ میں آ ہی گئی جس میں تین چار پیگ شراب موجود تھی۔ اُس کے چہرے کی تمتماہٹ دیکھنے لائق تھی جیسے ایما سے وقتِ وصال ہوا کرتی تھی۔ پہلا پیگ تیزی سے حلق میں اُنڈیلنے کے بعد دوسرا ہاتھ میں لے کر وہ پھر سے کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ اب کے اُس کے دوسرے ہاتھ میں چارج شیٹ اور گواہوں کی فہرست بھی تھی۔ چارج شیٹ کو ایک طرف پھینک کر وہ اپنے خلاف گواہوں کی فہرست دیکھنے لگا جس میں وہی دو نام ہی درج تھے یعنی اُس کا بیٹا ولیم آرتھر اور سائٹ آفس کا سیکورٹی انچارج جم۔ ولیم آرتھر کا نام سامنے آتے ہی اُس نے دوسرا پیگ بھی خلافِ رسم تیزی سے حلق میں اُنڈیلا اور اُس کی کڑواہٹ سے بُرے منہ کے ساتھ خودکشی کا لطف لینے کے سے انداز میں آنکھیں ایک بار پھر موند لیں۔ لیکن اِس بار ایما کی بجائے ولیم آرتھر کا بچپن اُس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ کیسے کیسے مرحلوں سے گزر کر وہ اُس مقام تک پہنچا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی اپنے سے بڑا انجینئر بنا سکے۔ اپنا گزرا ہوا کل اُس نے ولیم کے مستقبل کی نذر کیے رکھا۔ اپنی تمام تر خواہشات اور ضروریات بھی محض اس وجہ سے اپنے قریب نہ آنے دیں کہ کہیں وہ ولیم کے مستقبل کے راستے کی دیوار نہ بن جائیں۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اولاد پلتی تو باپ کی کمائی پر ہے مگر اُس کی فکری بڑھوتری ماں کے تعصبات کے سائے میں ہوتی ہے۔ ماں کا رویہ اگر باپ دشمن ہے تو بیٹا باپ دشمن اور اگر ماں اِس کے برعکس سوچتی ہے تو بیٹا بھی اُسی ڈھب پر۔ بہت کم ایسا دیکھنے میں آیا کہ اگر ماں نے اولاد کو شوہر سے عناد کی دھوپ میں پالا پوسا ہو اور اولاد پھر بھی باپ سے خیر خواہی کرے۔

مگر یہاں تو بیٹا پلا ہی باپ کے خلاف معاندانہ ماحول میں تھا تو اُس کے دل میں باپ سے محبت کا بیج کیسے پھوٹتا۔ جان برنٹن کے لیے اُس کے خلاف باندھے گئے طومار میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جسے وہ واقعاتی اور منطقی طور پر رد نہ کر سکے مگر اپنے بیٹے کی گواہی کا کیا کرے گا جب وہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کو بدکردار اور کمپنی کے مفاد کے خلاف کام کرنے کا مجرم ثابت کر رہا ہوگا؟ وہ کیسے بیٹے کو کاذب ثابت کرنے کے لیے اُس کی گواہی پر جرح کر پائے گا؟ جان برنٹن یہ بھی جانتا تھا کہ بیٹا تو محض اِس لیے اُس کے خلاف گواہ بنا ہے کہ جلد از جلد باپ کا منصب یعنی چیف انجینئر شپ سنبھال کر ماں کو اُس کے خوابوں کی تعبیر دکھا سکے مگر کیا وہ اُس بیٹے پر جرح کر کے چاہے گا کہ وہ کبھی چیف انجینئر نہ بن سکے یا ماں کا خواب پورا نہ کر سکے۔ یہ ولیم آرتھر کا پہلا معرکہ تھا جو وہ اپنے شان دار مستقبل کی بنیاد رکھنے کے لیے سَر کرنے والا تھا۔ تو کیا وہ ایک باپ ہوتے ہوئے چاہے گا کہ اُس کا بیٹا اپنے پہلے معرکے میں ہی شکست سے دو چار ہو؟ نہیں وہ تو ایسا نہیں چاہے گا لیکن ولیم کو انجینئر بناتے ہوئے اُس نے یہ بھی نہیں چاہا تھا کہ ایک دن وہ اُسے اُس کے منصب سے اتنی ذلت کے ساتھ بے دخل کرنے کی سازش کرے۔

جان برنٹن کو شدت سے سگار کی طلب ہونے لگی تھی۔ وہ کرسی سے اُٹھا مگر پھر یاد آیا کہ ایما سے ملنے کے بعد اُس نے سگار خریدنے چھوڑ دیے تھے۔ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد وہ مایوس ہو کر بے دلی سے کرسی پر گر گیا مگر کچھ سوچ کر پھر کھڑا ہوا اور بچی کچھی شراب کا ایک اور پیگ بنانے لگا۔ ''کاش! ایما اِس وقت میرے ساتھ ہوتی تو میں کچھ بہتر فیصلہ کر پاتا۔'' ایما کا خیال آتے ہی جان نے شراب کا بڑا سا گھونٹ لیا اور اپنی پوری ذہنی توانائی مجتمع کرنے کے بعد کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک باپ کی حیثیت سے اُس کے پاس انکوائری کا دفاع کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ انکوائری میں حجت کا مطلب اپنے بیٹے کے مستقبل سے کھلواڑ کرنا یا اُس کی کامیابی کی راہ میں مزاحم ہونا تھا۔ اور بیٹا بھی ایسا کہ جو اپنی اُس ماں کا خواب پورا کرنے جا رہا تھا جس نے کبھی اپنے شوہر کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ جان کو لگا کہ وہ اپنی جنگ ہار رہا ہے۔

# ۳۴

ملوکاں اگلے دو تین روز سنگری کے ساتھ اُکھڑی اُکھڑی رہی۔ وہ امانت کی ولدیت کے معاملے کو کھل کر معلوم کرنا چاہتی تھی لیکن بیٹی کے متوقع ردِعمل اور ردِعمل کے بعد کی ڈھٹائی سے خوف زدہ تھی جو آگے جا کر کہیں بغاوت میں بھی بدل سکتی تھی۔ معاملہ کسی اور کا ہوتا تو کچھ اور بات تھی لیکن یہاں تو سنگری جیسی لڑکی کا سامنا تھا جو اپنی آئی منوانے کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتی تھی۔ ملوکاں نے محسوس کیا کہ اپنی جگہ مضطرب تو سنگری بھی ہے مگر اِس کے باوجود وہ اپنے اضطراب کا احساس دلانے کو تیار نہیں تھی۔ ملوکاں کی نگاہ جب بھی امانت کے چہرے پر پڑتی تو اُس کی آنکھوں سے اُسے سیدا جھانکتا ہوا دکھائی دیتا۔ امانت کے چہرے مہرے میں نہ سہی مگر اُس کی آنکھوں میں سیدا اپنے پورے حرامی پَن کے ساتھ موجود تھا۔ یہ سیدے کا خوف تھا یا اُس سے نفرت کا اظہار کہ اُس دن کے بعد سے ملوکاں نے نہ تو امانت کو گود میں اُٹھایا تھا اور نہ ہی اُسے چھوا تھا۔

اُدھر چھوٹے زنان خانے میں مولوی اللہ بخش کا آنا جانا اِس طرح روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ صبح دوپہر اور شام کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی تھی۔ اُس کے اِس آنے جانے میں بڑھاوا سراسر سنگری کے خوش دلانہ رویے کا مرہون تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ شاید یہ بَلا بس زبانی جمع خرچ اور جی حضوری ہی سے ٹل جائے مگر جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا بخشو کی آنکھوں سے حیا کا پردہ

اُتر تا جا رہا تھا۔ سنگری نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک ایسا شخص جس کے سر پر باپ کی وراثت کی دستار بندھی ہو، اپنی نفسانی خواہشات کے سامنے اِس قدر بودا اور پست ہمت ثابت ہوگا کہ حلال اور حرام کی تمیز کھو بیٹھے گا۔ وہ جب بھی چھوٹے زنان خانے میں آتا اُس کی یہی کوشش ہوتی کہ اُسے سنگری کے ساتھ گفتگو کے واسطے تخلیہ مہیا ہو۔ برداشت اتنی نہ رہی کہ وہاں سے کبھی کبھار کا ملوکاں کا گزر بھی گراں گزرنے سے زیادہ چبھنے لگا تھا۔ امانت کو دودھ کی طلب ہوتو اُس کے سامنے پے وگرنہ باہر چارپائی پر پڑا مکھیوں کی کھینچا تانی میں روتا رہے۔ اِس کا نتیجہ سوائے اِس کے اور کیا ہوسکتا تھا کہ سنگری مکمل طور پر اُس کی خواہش کے آگے ہتھیار ڈال دے وگرنہ اُٹھا لے۔ مگر جن حالات کا سنگری کو سامنا تھا اُن میں دونوں میں سے کسی ایک پر بھی عمل کیا جانا سراسر خودکشی تھی، کسی کے پاس بھی کچھ نہیں بچ پاتا تھا۔

سنگری بخوبی جانتی تھی کہ بخشو نے اُس کی اپنے باپ سے شادی کو کبھی جائز نہیں سمجھا تھا۔ اُس کی حیثیت بخشو ہی کیا پورے بڑے زنان خانے میں مولوی جاراُللہ کی رکھیل سے زیادہ نہیں تھی جس سے نکاح کا ڈھونگ محض دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے رچایا گیا تھا۔ اِس سارے بیانیے کو تقویت مولوی جاراُللہ کی پہلی بیویوں کے چرچے سے مسلسل مل رہی تھی کہ جنہوں نے سنگری سے نکاح کے پہلے دن ہی دبی دبی زبانوں میں ہر طرف شہرہ کردیا کہ مولوی بے چارہ تو اپنی سن رسیدگی کے سبب کسی عورت سے مکمل جنسی تعلقات رکھنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ بخشو نے اسی بیانیے کو آگے بڑھایا اور یہاں تک لے گیا کہ سنگری نے اُس کے باپ سے فرضی نکاح کے ڈرامے میں کسی اور سے چکر چلائے رکھا اور پھر اُسی کی آڑ میں کسی اور کا نطفہ حرام مولوی خاندان کے سر تھوپ کر وراثت کی دعوے دار بن کر بیٹھ گئی ہے۔ اس بارے میں بخشو کا شک ہمیشہ سے منگر پر رہا تھا تبھی تو وہ اُس کا سایہ بھی چھوٹے زنان خانے پر پڑنے کا روادار نہیں تھا۔ سنگری یہ بھی جانتی تھی کہ مولوی بخشو کی اِس گھناؤنی پیش رفت میں اُسے اپنی ماں کی آشیرباد حاصل ہے جو اُسے تباہ و برباد کرانے میں کسی حد تک بھی جاسکتی ہے۔ بڑے زنان خانے کو کسی بھی قیمت پر نہ تو مولوی جاراُللہ کی کوئی چوتھی منکوحہ قبول تھی اور نہ اُس کا بیٹا کہ جو وراثت میں برابر کا حق دار ٹھہرے۔

جب کہ سنگری کی جانب سے بخشو کی پیش رفت کو دھیرے دھیرے مگر ایک حد تک قبول کرتے رہنا اُس حکمت عملی کے زمرے میں تھا جس کے ذریعے اُس کی بدزبانی اور بدگوئی کو قابو میں رکھا جا سکے وگرنہ وہ جس طرح سے اُس پر الزام تراشیوں کے انبار لگاتا چلا جارہا تھا، وہ چھوٹے زنان خانے میں تو کیا بستی میں رہنے کے قابل بھی نہ رہتی۔ مگر اب کے جب بخشو کی پیش قدمیوں نے اخلاقی حدود کی پامالی تک پہنچنا چاہا تو سنگری نے سب کچھ کھول کر ماں کے سامنے رکھ دیا اور اُسی سے مدد چاہی کہ اب کرے بھی تو کیا کرے؟

ملوکاں تو عرصے سے اِس لمحے کی منتظر تھی۔ کیسے کیسے ناموافق حالات میں اُس نے صبر کیا اور سنگری سے کچھ پوچھنا گوارا نہ کیا ما سوائے اُسے ہر ہر قدم مشورہ دینے اور دبے لفظوں میں تنبیہ کرنے کے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے سنگری اپنے آپ کو اُلجھنوں میں اُلجھاتی گئی مگر اُس نے اِس واسطے مداخلت نہ کی کہ بیٹی کے مطابق وہ اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی تھی۔ بخشو کے معاملے میں دن رات اُس کا خون کھولتا رہا مگر وہ اِس لیے لاتعلق رہی کہ بیٹی کو اپنے ہُنر پر ناز تھا۔ لہٰذا اِس پس منظر میں ملوکاں نے بیٹی کی بات تو سُن لی مگر پھٹ پڑی اور صاف صفا کہہ دیا کہ جو کچھ ہوا اُس میں قصور کسی اور کا نہیں صرف اُسی کا ہے۔ اُس کے نزدیک معاملہ چاہے منگر سے نکاح کے انکار کا تھا یا مولوی جاراُللہ سے بے جوڑ اور زبردستی کی شادی کا یا اُس کے مرگ کے بعد پھر سے چھوٹے زنان خانے میں رہائش کا، ہر مرحلے پر سنگری کی بے جا ضد ہی نے اُس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک گہرا گڑھا کھودا لیکن جس طریقے سے اُس نے مولوی بخشو کے معاملے میں رویہ اپنایا وہ تو ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ سنگری کی محدود حوصلہ افزائی نے اُلٹا بڑے زنان خانے کے اِس چرچے کو اور ہوا دی کہ وہ کس کردار اور کس قماش کی عورت ہے۔

''تو نے مجھے کسی کو شکل دکھانے جوگا چھوڑا ہے جو میں تمہیں اِس مصیبت سے نکلنے کا راستہ دکھاؤں.... میں تو خود منہ پر کالک مَل کر تمہارے ساتھ رہ رہی ہوں کہ آخر کو ہے تو بیٹی نا! .....اگر میں بھی درمیان میں سے نکل گئی تو یہ مُلوٹے تجھے کاٹ کھائیں گے۔ لیکن یہ جو پوچھ رہی نا! مجھ سے کہ اب کیا کروں؟.... تو بیٹی میرے پاس اِس کا کوئی جواب نہیں، تو نے پَخن چڑھایا ہے

اب تو ہی اِسے بھگت۔'' ملوکاں بیٹی کو یہ سب کچھ سُنا تو بیٹھی مگر پھر خود ہی پر پر آنسو بہانے لگی۔ مگر سنگری نے تو جیسے نہ رونے کی قسم اُٹھائی تھی۔ ماں کی تیز دھار خنجر جیسی باتیں سُن کر بھی نہ تو چہرے کا رنگ بدلا اور نہ ہی آنکھوں میں پانی نے ٹھُم ٹھُم کرنا شروع کیا۔ وہ چُپ کر کے ماں کے پہلو سے اُٹھی اور چار پائی پر پڑے رِیں رِیں کرتے امانت کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

اُس شام مغرب کے بعد بخشو چھوٹے زنان خانے میں آیا تو خاصا چہک رہا تھا۔ گھریلو استعمال کی اشیا اور سامانِ خورد و نوش میں لدا پھندا۔ آتے ہی سبھی کچھ سنگری کے سامنے ڈھیر کر دیا۔ سنگری نے لاکھ مسکرانے کی کوشش کی مگر اُس کے چہرے سے زچگائی کا تاثر مٹائے نہیں مٹ رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر وہاں سے جانے لگی تو مستی میں آئے ہوئے بخشو نے جاتی ہوئی سنگری کا ہاتھ پیچھے سے لپک کر پکڑ لیا۔ سنگری حیرت، غیرت اور شرم کے مارے وہیں سُن ہو کر رہ گئی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بخشو ایک ہی جست میں بے غیرتی کی اتنی حدیں بھی پھلانگ سکتا ہے۔ اُس نے پورے بدن کی طاقت سے ایک ہی لمحے میں اُس کا ہاتھ نوچ کر ایک طرف پھینکا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر برآمدہ نما چھتنی سے باہر جا کر پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ اُس کا سر شرم کے مارے اُٹھ نہیں رہا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونا چاہ رہی تھی مگر نہ تو آنسو اُس کی آنکھوں میں اُتر رہے تھے اور نہ ہی آواز گلے سے باہر آنا چاہ رہی تھی۔ سنگری کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اُس کے تمام تر احساسات ڈھٹائی اور بے شرمی کی موٹی کھال میں سی دیے گئے ہوں۔

لیکن حیرت کا ایک اور شدید ترین جھٹکا ابھی اُس کا منتظر تھا۔ بخشو کوٹھے سے باہر نکلا اور اُسے ڈھونڈتا ہوا اُس کے سامنے دھری بارش میں ٹیڑھی ہو چکی بان کی چار پائی کی سرہاندی کی طرف اُکڑوں ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک اُسی شانِ بے حیائی سے مسکرائے چلا جا رہا تھا۔ سنگری نے اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا تک گوارا نہ کیا اور شہادت کی انگلی سے زمین کو کریدنا شروع کر دیا۔

''اَڑی سُن! یہ نخرہ چھوڑ..... یہ بتا تمہاری شادی نہ کرا دوں؟''

سنگری نے حیرت سے بخشو کی طرف دیکھا کہ جیسے اُس کی بات کو تولنے کی کوشش کر رہی

ہو۔ اُس کی آنکھوں میں اُتری ہوئی ڈھٹائی دیکھ کر سنگری کا پورا اندر کڑواہٹ سے بھر گیا مگر وہ اِسے تھوک بھی نہیں سکتی تھی کہ کہیں چاٹنے کا پروانہ نہ پکڑا دیا جائے لیکن اِس کے باوجود وہ اپنی آنکھوں سے اِس قسم کے سوال کیے جانے کا مقصد نہ چھپا سکی۔

''دیکھ سنگری! ساری دنیا جانتی ہے کہ نہ تو میرے باپ کا تم سے کوئی حق کا رشتہ تھا اور نہ ہی میں تیرا کچھ لگتا ہوں مگر پھر بھی بڑے زنان خانے سمیت ہر کوئی اُنگلی کھڑی کیے رہتا ہے کہ میں تمہاری خبر گیری کو کیوں آتا ہوں۔ کیا زمانہ آ گیا کہ ننگے سر والی عورت سے کوئی ہمدردی بھی نہیں کر سکتا۔ دیکھ میں تیرا کچھ نہیں لگتا مگر ہمدرد تو ہوں نا!.. اِسی لیے کہتا ہوں کہ کسی سَترے بہترے سے حق کر لو.... تمہارا کام بھی سَر جائے گا اور میرا بھی کہ کوئی اُنگلی کھڑی نہیں کرے گا۔'' پھر بائیں آنکھ دبا کر بولا کہ ''ایک گھنڈا ڈھونڈ رکھا ہے میں نے تمہارے لیے..... وہ ہے نا! اپنا کوچوان آمدو .... چھڑا چھانڈ.... منہ میں کوئی دانت نہیں اور آنکھوں سے کچھ دِکھتا نہیں۔''

سنگری جو ابھی تک سب کچھ سُنتی آ رہی تھی، ایک دم ایسی بھڑکی کہ سامنے چارپائی کے سرہانے والے پائے پر اُکڑوں بیٹھ کر دانت نکوستے ہوئے بخشو کے منہ پر اتنے زور سے لپڑ جڑا کہ وہ گھومتا ہوا دوسری جانب جا گرا۔ یہ سب کچھ مولوی بخشو کی توقع کے برعکس ہی نہیں انتہائی برعکس تھا۔ پہلے تو اُسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ ہوا کیا ہے مگر جیسے ہی ہو چکی واردات کا ادراک ہوا مبہوت کھڑی سنگری کی جانب لپکا اور اُسے بے اندازہ تھپڑوں، گھونسوں اور لاتوں کی زد پر رکھ لیا۔

''حرام زادی، گشتی! پہلے میرے پارسا والد صاحب کو خراب کرنے کی کوشش کی مگر جب ناکام ہوئی تو میرے پیچھے پڑ گئی۔ مگر میں تمہاری شیطانی باتوں میں آنے والا نہیں.... میرا کردار مضبوط ہے۔ میں نے بہت حیا کی کہ اِس لاوارثی کو پناہ ملی رہے، بچہ حرام کا ہے تو کیا ہوا؟ اگر ماں باپ ہی منہ پر دانگی مَل لیں تو حرام کی اولاد کا کیا قصور؟ مگر آج تو اِس حرامن نے حد کر دی..... میں وضو میں تھا مگر مجھ جیسے پرہیز گار ہی پر دست درازی شروع کر دی۔ اب میں نے تجھے نہیں چھوڑنا، نکال باہر کرنا ہے اس گھر سے بھی اور بستی سے بھی۔ یہ شریفوں کی بستی ہے، بد کرداروں کی نہیں۔''

اِس سے پہلے کہ مولوی بخشو سنگری کو جان ہی سے مار دیتا، ملوکاں نے واویلا کیا، روئی پیٹی، چیخی چلائی اور آخر کار سنگری کو مولوی بخشو کے تشدد سے چھڑا لیا۔ منہ سے جھاگ بہاتے مُلا نے سنگری کو نیم بے ہوشی کی حالت میں اندھے زخموں سے چور دیکھا تو اُس کا اُبلتا ہوا خون پہلے گرمائش کی سطح پر آیا اور پھر وہاں سے جھاگم جھاگ ہوا تو اُس کی ہوش کی آنکھیں بھی کھلنے لگیں۔ بخشو کو محسوس ہوا کہ گھر کے باہر تک بلا راجانے کے سبب اگر کوئی باہر موجود نہیں تو متوجہ ضرور ہے، تبھی یہ تنبیہہ دیتا ہوا چلتا بنا کہ ''کل صبح تک گھر سے دفع دور ہو جاؤ ورنہ جوتے مار کر باہر نکالوں گا اور ہاں اُس حرام کے نطفے کو ساتھ لیتی جانا ورنہ دونوں کو بستی کے چوک میں سنگسار نہ کرایا تو میرا نام بدل دینا۔''

مولوی بخشو تو اپنا اصل دکھا کر چلتا بنا اب مسئلہ اگر تھا تو سنگری کے لیے جو پہلے ہی وحشیانہ دھنائی کے سبب باہر سے اچھی بھلی متورم اور اندر سے پھٹو پھٹ ہو چکی تھی۔ ملوکاں کچھ دیر تک تو بیٹی کو سینے سے لپٹا کر روتی رہی مگر اپنے ہوش بحال ہونے پر سنگری نے ماں کو کچھ کھچا کر ایک طرف کیا، اُلٹے ہاتھوں سے اپنے ٹپ ٹپ گرتے آنسو پونچھے اور کلائی سے شوں شوں کرتی ناک اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے قدموں پر خود ہی اُٹھ کھڑی ہوئی ایک غیر متزلزل دکھائی دینے والے عزم کے ساتھ۔

# ۳۵

منگر کو کسی اور نے نہیں بلکہ ملوکاں نے خبر کر دی کہ سنگری کس عذاب سے گزر رہی ہے اور اُس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ اُسے حیرت اس بات پر نہیں تھی کہ مُلا بخشو کس راستے پر چل پڑا ہے، وہ اگر مُنگ تھا تو سنگری کے رویے پر کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ آئے روز اپنے آپ کو ذلتوں کی نئی دلدل میں لتھڑا کر نجانے وہ کون سی تسکین اور کس قسم کی تشفی کے لیے سرگرداں ہے۔ اُسے سکون اور عزت والی زندگی کیوں نہیں چاہیے۔ وہ ہر سیدھا کام اُلٹے طریقے ہی سے کیوں کرنے کے درپے ہے؟ آخر وہ کون سا عذاب ہے جسے ثواب میں منقلب کرنے کے لیے اِن جغادریوں کی پناہ میں آنا پڑتا ہے؟ خرابی ہے کہاں جو اُسے اپنے جیسے لوگوں میں اپنی جیسی زندگی نہیں گزارنے دیتی؟ اُسے معمول کے حالات اور معمول کے ماحول میں چین کیوں نہیں پڑتا؟ کیوں طلب رہتی ہے اُسے ہمہ وقت ایک بے سبب ہنگام کی؟

اُس روز ایک مدت کے بعد بارش نے صرف بستی ہی کیا، حدِ نگاہ تک اپنے پر پھیلا رکھے تھے وگرنہ کئی برسوں سے تو ساون بھی بِنا برسے گزر جانے میں اپنی عافیت خیال کر رہا تھا۔ یہ تو لُسی جُھڑی کی روایتی مسلسل بارش تھی جس میں بادل جمعرات کی شام اُمڈتے ہیں اور پھر اگلی جمعرات تک پورے آٹھ دن کبھی ہولے اور کبھی تیز برسے ہی چلے جاتے ہیں۔ اِس دوران سورج مچلے یا جھگڑا مچیں، بادل ٹس سے مَس نہیں ہوتے۔ منگر کے اندر بھی ایک لُسی جھڑی تھی جو کئی برسوں

سے برسے ہی چلے جا رہی تھی مگر غبار تھا کہ بیٹھنے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔ کئی بار اُس نے سوچا کہ سنگری سے سنجوگ کے روگ کو وہ اُسی طرح پھر سے دل کے کسی گوشے میں دفن کیے رکھے کہ جیسے سیدے کے ہوتے ہوئے لیے پھرتا رہا اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہونے دی۔

سیدے کا خیال ذہن میں آتے ہی اُس کی آنکھیں نم ناک ہونے لگیں۔ منگر کو یقین تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اپنی جان کی قیمت پر بھی سنگری کو یوں در بدر نہ ہونے دیتا کہ آخر کو اُس کی منکوحہ تھی۔ مان لیا کہ انگریز حکومت اُس کے پیچھے پڑی تھی مگر اس کے باوجود سب جانتے ہیں وہ اِتنا اَڑ بنگ تھا کہ سنگری کو اپنے جیتے جی کسی اور کے نکاح میں نہ جانے دیتا۔ ''کاش سیدا زندہ ہوتا!''.... منگر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''سیدا زندہ ہوتا تو اِس دھادنی گھوڑی کو اپنی رانوں کے نیچے سے نکلنے ہی نہ دیتا.... پھر دنیا دیکھتی کہ یہ بہن سٹیک اَڑیاں کیسے کرتی ہے اور مَردوں کو پاؤں کی ٹھوکر میں کیسے رکھتی ہے؟''

''مگر مَردوں کو پاؤں کی ٹھوکر میں سنگری کہاں رکھے ہوئے ہے؟ وہ بے چاری تو خود ٹھوکروں میں ہے۔''... منگر کو ساری صورتِ حال اب ایک اور زاویے سے دکھائی دینے لگی تھی۔ کہیں کسی اور سمت سے اُس کے ذہن میں خیال لپکا کہ جس سیدے کے نہ ہونے کو وہ رو رہا ہے، وہ بھڑوا آج اگر زندہ ہوتا تو سنگری سے شادی تو دور کی بات، وہ اُس کا نام تک زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔ ''تو کیا وہ کسی اور کے ہانگے موترے ہوئے کو منہ پر ملنے کے لیے مرا جا رہا ہے اور وہ بھی اِن حالات میں کہ تمام تر خلوص کے باوجود اُس کی جھولی میں یہ گندگی بھی نہیں ڈالی جا رہی۔'' لیکن اپنے آپ سے کیے گئے اِس سوال کا جواب اُسے اندر سے عَود کر آنے والی لعنت ملامت کی صورت ملا۔ ''سنگری کہاں سے ہو گئی کسی کا ہانگا موترا؟ وہ تو سیدے کے نکاح سے بھی پہلے اُس کی اور اُس کی ماں کی نگاہ میں تھی۔ کسی کی نگاہ میں ہونا، کسی کے نکاح میں ہونے سے افضل درجہ ہے جس میں طلاق نہیں اور نہ ہی بیوگی کی کالک ہے۔ سیدا اگر آج زندہ بھی ہوتا تو سنگری کو اُس کے دل سے نہیں نکال سکتا تھا اور نہ ہی سیدے اور مولوی جارُ اللہ کے بعد سنگری اُسے زندگی بھر دور دھکیلے رہ سکتی تھی۔'' یہ سوچتے ہوئے منگر کو یوں لگا کہ سیدا ہو یا مولوی جارُ اللہ دونوں اُس کی آہوں

کی بھینٹ چڑھے ہیں ورنہ کیسے ممکن ہے کہ محض ایک ڈیڑھ برس کی مدت میں کسی عورت کے دو شوہر اپنی جان سے گزر کر پھر سے اپنی بیوہ کو ایک اور نکاح کے لیے اُس کے سامنے لا کھڑا کریں۔

منگر نے چاہا کہ ابھی جائے اور جا کر سنگری سے صاف صاف پوچھے کہ اُس کو اپنے سے دور رکھنے کے واسطے وہ اور کتنے لوگوں کا صدقہ کرنا چاہتی ہے؟ مگر اُس کے سامنے ایسی کوئی راہ نہیں رہی تھی جس پر چل کر وہ سنگری سے یہ سوال پوچھ سکتا جس نے اِن دنوں ماضی کی طرح ہر وہ راستہ بند اور ہر وہ در مقفل کر رکھا تھا کہ جو اُس کی جانب آ سکتا یا اُس کی جانب کھل سکتا۔ منگر کے لیے سنگری کا یہ رویہ باعثِ حیرت تھا کہ وہ ہر اُس شخص کے تلوے چاٹتی جو اُس پر ہر طریقے سے سوار رہتا اور ہر اُس شخص کو ذلیل کرتے پر اُدھار کھائے رہتی جو او کھے سوکھے ویلے اُس کی مدد کو پہنچتا۔ اِدھر سنگری مشکل سے نکلی دم سوکھا ہوا، اُدھر جھٹ سے اُسی لمحے اپنے مشکل کشا پر ہر قسم کے ربط اور رابطے کا دروازہ بند اور پھر تو کون اور میں کون؟

''کیا بنے گا ایسی عورت کا؟'' ..... سوال تھے کہ منگر کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ ''کیا بنے گا؟.... ہونہہ.... جو بھی بنے گا وہ اپنے آپ بنائے گی اور اُسی سانچے میں ڈھال کر بنائے گی جو اُسے پسند آئے گا..... اب رہا سوال جوتے کھانے کا تو بات صرف تلذذ کی ہے.... کچھ لوگ متشدد ہوتے ہیں، تشدد کرنا پسند کرتے ہیں اور کچھ لوگ تشدد کرانا پسند کرتے ہیں، تشدد انہیں راحت دیتا ہے اور تذلیل اُنہیں سکون.... اُنہیں مشکل کشا جیسے لوگ پسند نہیں ہوتے جو اُنہیں سکون جیسی اذیت دیتے ہیں اور محروم کر دیتے ہیں اُنہیں اُس لذت سے جو وہ تشدد اور تذلیل کے راستے کشید کرنے جا رہے ہوتے ہیں۔'' تو کیا سنگری اِن جیسے لوگوں میں سے ہے جو سو جوتے صرف اِس لیے کھاتے ہیں کہ اُس کے بعد سو پیاز کھانے کی ذلت سے بھی لطف اندوز ہو سکیں۔ لیکن سنگری کو اِس راہ پر مزید چلتے رہنے کی اجازت دینا بھی تو کسی طور روا نہیں تھا۔ اُخیر جو بھی ہو، سنگری ساتھ دے یا نہ دے مگر نتیجہ تو پھر بھی منگر جیسے مشکل کشاؤں کو ہی بھگتنا پڑتا تھا نا۔ یہ کہنا یا سمجھنا شاید درست نہ ہو کہ سنگری اپنے اِس طرزِ عمل کے لااُبالی پن کا ادراک نہیں رکھتی تھی۔ منگر جسے تلوے چاٹنا خیال کرتا تھا وہ دراصل سنگری کی مصلحت کوشی تھی جس کے سبب اُسے اپنا اُلو سیدھا

کرنے کا ہنر آتا تھا اور جسے وہ مشکل کشاؤں کی مہربانی گردانتا تھا وہ سنگری کا اُلو بنانے کا وصف تھا جس کے ہوتے ہوئے وہ کوئی نہ کوئی ایسا مہربان تاڑ ہی لیتی جو اُس کی مدد کرنے پر آمادہ پایا جاتا، چاہے سات کوس دور ہی سہی۔

منگر کے گویڑ کے مطابق سنگری ایک بار پھر اُسی گرداب میں پھنس چکی تھی جہاں اُسے کسی بچانے والے کی ضرورت پڑا کرتی ہے مگر حیرت یہ تھی کہ نہ تو وہ کسی کو مدد کے لیے پکار رہی تھی اور نہ اُس کے ہاتھ پاؤں مارنے کی آوازیں کسی کو سنائی دے رہی تھیں۔ منگر کے نزدیک اِس بار یا تو وہ کسی اور کو نشانے پر رکھ چکی تھی یا پھر اپنے تئیں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو چلی تھی۔ صورتِ حال جو بھی تھی، منگر کے واسطے خوش کن نہیں تھی۔

''تو کیا وہ اُسے اپنے حال پر چھوڑ دے؟''.... منگر نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''تو اور کیا کرے؟ کب تک اُس کے پیچھے بھاگا جا سکتا ہے؟''..... منگر اب کے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا مگر پہنچ نہیں پا رہا تھا۔

''لیکن یہ تو دیکھا جانا چاہیے کہ سنگری کی بے سبب چالاکیاں اُس کی کشتی کو ڈبونے تو نہیں جا رہیں؟''..... منگر کے دل میں ایک بار پھر سنگری کے لیے جگہ بننے لگی تھی۔ ''اگر ایسا ہونے جا بھی رہا ہے تو وہ کیا کر سکتا ہے کہ جب تک سنگری خود نہ چاہے۔ اگر سنگری خود ہی اُسے اپنے تک پہنچنے کا راستہ دینے کو تیار نہیں تو وہ کب تک دیواروں سے سر ٹکرا سکتا ہے؟''....... منگر پھر سے حوصلہ چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ مولوی جارُ اللہ کے بعد کوئی نہ کوئی ایسا ضرور اُس کی زندگی میں داخل ہو چکا ہے جس کے بعد اُسے مزید کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن اُس کے نزدیک اُلجھاؤ بھی یہی تھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جسے مولوی جارُ اللہ کا خاندان بھی قبول کرتا ہو وگرنہ بڑے زنان خانے والوں کی منشا کو دائیں بائیں کرتے ہوئے چھوٹے زنان خانے میں کیونکر رہا جا سکتا تھا؟ منگر کو یقین تو یہ بھی تھا کہ مولوی جارُ اللہ کی موت کے ساتھ ہی سنگری کو اپنی غلطی کا ادراک ہو جانا چاہیے تھا مگر بجائے اِس سے سبق حاصل کرنے کے وہ بدستور چھوٹے زنان خانے میں مقیم چلی آ رہی تھی۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ اب کے اُس کے ساتھ اُس کی ماں بھی رہائش

پذیر تھی۔ مگر منگر کے لیے اب بھی وہی اُلجھن کہ سنگری وہاں کس کے سہارے ٹکی ہوئی ہے؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ سنگری کا وہاں قدم جمائے رہنا محض اُس کے بیٹے کے حق وراثت تک کے لیے ہو۔ معاملہ جو بھی تھا اُس میں کسی ایسے مرد کی موجودگی ضرور تھی جس نے سنگری کو آڑ لگا ہوا تھا یا سنگری نے اُسے اپنی ہنرکاری سے ٹکٹکی سے باندھ رکھا تھا۔



## ۳۶

سنگری نے جتنے اندازے مولوی بخشو کو ٹرخائے رکھنے کے بارے میں قائم کیے تھے وہ سبھی پلک جھپکتے بے وقعت ثابت ہو چکے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ وہ بے غیرتی کی حدوں کو چھوئے گا ضرور مگر پار نہیں کرے گا لیکن اُس نے تو خلاف توقع پہلی ہی جست میں اِن حدوں کو چھونے کے بجائے پار کرنے کی ہی ٹھان لی تھی۔ اُس پر مُستزاد وہ جسمانی تشدد جو جب جب سنگری پر حد سے گزرا تب تب اُس کے مسام مسام میں گُھسا ہوا جنون بھی آمادۂ شورش ہوا۔ ہر بار سنگری کی زندگی میں یہ وہ مرحلہ ہوتا جب اُس سے کوئی ایسا فیصلہ سرزد ہو جاتا جس کا عام حالات میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سنگری سے سرزد ہو جانے والے یہ فیصلے بظاہر انتہائی طیش کے عالم میں کیے گئے دکھائی دیتے لیکن حیران کن طور پر طیش کی انتہا اُسے حد سے زیادہ پرسکون کر دیا کرتی تھی۔ شاید یہ وہ مقام ہوتا ہو گا جہاں بقائے ذات کی جہد ہی اُتم قرار پا کر اُن فیصلوں پر تصدیق کا ٹھپا لگا دیتی ہو گی یہ جانتے ہوئے کہ موجودہ گردِ حال سے نکلنے کی قیمت ایک اور بربادی، ایک اور عذاب بھی ہو سکتی ہے۔

سنگری اِس قسم کے فیصلے اِس یقین کے ساتھ کرنے کی عادی ہو چلی تھی کہ ہر بُرا فیصلہ بھی اپنے پیدا کردہ گرداب سے نکلنے کا راستہ ضرور رکھتا ہے، بس شرط صرف اُسے تلاشنے کی ہوتی ہے۔ اُس کے نزدیک ناکام شاید وہی رہتا ہے جو نکلنے کے راستے پر نگاہ نہیں رکھتا یا نہیں رکھ پاتا۔ مولوی

بخشو کو مقدور بھر سہولت دینے کے بعد بھی اُس کے آج کے طرزِ عمل نے سنگری کو ایسے ہی ایک فیصلے پر پہنچا دیا تھا جس کے بعد اُسے اپنے آپ کو مزید برباد کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لیکن اُسے یقین تھا کہ نہ صرف اِس گرداب سے بھی وہ بخوبی باہر نکل آئے گی بلکہ بربادی اُسے چھو بھی نہیں سکے گی۔ اور یہ فیصلہ تھا اپنے سابقہ دیور مُلا رکھے کی زوجیت میں آنے کا۔

بظاہر طیش میں کیے گئے اِس فیصلے پر وہ جتنا غور کرتی جا رہی تھی اُتنا ہی اُس سے کئی سمتوں کو نکلنے والے مامون راستے خود بخود اُس کے آگے بچھتے چلے جا رہے تھے۔ مُلا رکھا، سنگری کے مقتول شوہر مولوی جارُاللہ کا چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے خاندان میں ایک برتر حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اِس لحاظ سے بھی بااثر تھا کہ اُس کی سالی مولوی جارُاللہ کی دوسری بیوی رہی تھی۔ مُلا کے قتل کے بعد اُسے مسجد کا پیش امام نہ بنا کر بھی مولوی بخشو سمیت مولوی جارُاللہ کے سبھی وارثان اندرو اندری اخلاقی لحاظ سے احساسِ ندامت کا شکار ہو چلے تھے مگر باہر سے محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ اِسی سبب کو جانتے ہوئے مولوی رکھا اب اِن لوگوں سے اپنی ہر بات چڑھتی کرتے ہوئے منوانے لگا تھا اور یہ بات سنگری سے زیادہ کون جانتا تھا کہ ایسے میں اُس کی مُلا رکھے سے شادی پورے مولوی خاندان کو اُجاڑ کر رکھ دے گی۔ ایک جانب مُلا رکھا اُس کی گرفت میں آ کر نہال ہو گا تو دوسری جانب مُلا بخشو کی گرفت سے پھسل کر وہ اُسے دنیا ہی میں دن رات جہنم کی آگ میں جلتا بھنتا رکھے گی۔ یہ سنگری پر برسنے والی اُن لاتوں، مکوں اور گھونسوں کی قیمت ہو گی جو وہ زندگی بھر ادا کرنے کے بعد بھی ادا نہیں کر سکے گا۔ وہ جن جن باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اُسے خوف میں مبتلا کیے ہوئے تھا، شادی کے بعد اُن کی گواہی کے لیے مُلا رکھے جیسا گواہ موجود ہو گا جس کے سامنے پورے خاندان کی ایک نہیں چلے گی۔ اگر چلی بھی سہی تو مُلا خاندان کے ہو چکے اِن دو ٹکڑوں پر اگر کوئی عافیت کا محل تعمیر ہو گا تو وہ صرف سنگری کے واسطے ہو گا جس میں وہ اپنے مُنّو کے ساتھ سُکھ کا سانس لے سکی گی۔

ملوکاں کو سنگری کے ارادوں کا علم ہوا تو وہ ایک بار پھر منگر کی طرف بھاگی اور یہ بات سنگری بھی جانتی تھی کہ اُس کی ماں کی دوڑ کہاں تک ہے؟ اِسی لیے اُس کی واپسی تک وہ مُلا رکھے کو

اپنے ہاں آنے کا بُلاوا بھجوا چکی تھی۔ ملوکاں بھی واپس آئی تو اکیلی نہیں تھی منگر بھی ساتھ تھا لیکن سنگری نے اُسے گھر کی درسال کے باہر ہی روک دیا اور خود ڈیوڑھی نما پردے کی اوٹ میں ہوگئی۔ ملوکاں نے بہت کوشش کی کہ ایک بار وہ اُس کا سامنا کرلے لیکن سنگری نے سامنا تو کیا بالمشافہ بالواسطہ اُس کی بات سننے سے بھی انکار کر دیا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ منگر کے سامنے آنے پر وہ اپنے ارادوں میں کمزور پڑ جاتی بلکہ وہ مُلاں رکھے کی متوقع آمد کے پیش نظر اُسے یہی تاثر دینا چاہتی تھی کہ بستی میں اُس کا سوائے اپنی ماں کے کسی اور سے رابطہ باقی نہیں رہا۔

ملوکاں کی جانب سے کیے گئے ترلے کے نتیجے میں منگر سنگری کے چھوٹے زنان خانے کے دروازے پر چلا تو آیا تھا مگر اب بے کھونٹا ہو کر رہ گیا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے؟ ایک بار پھر خودکشی پر آمادہ سنگری کو سمجھانے بجھانے کی ذلت برداشت کرے یا اپنی عزت بچا کر چلتا بنے کہ اُس بی بی کی ضد کے آگے دم مارنے کی گنجائش ہوتی کہاں تھی؟ اتنا تو وہ بھی جان چکا تھا کہ مولوی اللہ رکھے سے نکاح کر کے ایک طرف تو وہ مولوی اللہ بخش کو جذباتی طور پر خاک چاٹنے پر مجبور کرنے جا رہی تھی اور دوسری جانب صرف یہی نکاح پورے مولوی خاندان کی بربادی کی پہلی اینٹ بھی ثابت ہو رہا تھا لیکن اِس کے باوجود یہ ایسا خودکش حملہ تھا جس میں دشمن کی جان لینے کے لیے اپنی جان دینا لازمی ٹھہرتا ہے۔ مگر اِس کے باوجود سنگری کو سمجھانے کی کوشش کرنا ریت پر گھی اُنڈیلنے کے مترادف تھا جس سے نہ کچھ حاصل اور نہ ہی وصول۔

تاہم اتمام حجت کے واسطے منگر نے بیرونی دروازے کو زور سے کھٹکا کر رواجاً منتو کو پکارا جس کا مطلب یہی تھا کہ گھر میں موجود اگر کوئی خاتون اُس سے بات کرنا چاہتی ہے تو کر لے۔ لیکن اندر سے کوئی خیری جواب آنے کی بجائے سنگری ہی نے واہی تباہی بکنی شروع کر دی اور منگر کو فوری طور پر دفع ہو جانے کو کہا۔ سنگری کی چیختی چنگھاڑتی آواز کے ساتھ ایک باریک اور منحنی آواز بھی بار بار اپنا وجود منوانے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ آواز تھی ملوکاں کی جو اُسے منگر کے ساتھ بدتمیزی نہ کرنے کا کہے جا رہی تھی لیکن سنگری تو سُننے سمجھنے کی تمام حسیات سے یوں بدگماں جیسے کبھی شناسائی تک نہ رہی ہو۔

معاملہ شاید کچھ دیر اور یوں ہی حشر کی طرح برپا رہتا مگر باہر سے ایک اور چیختی چنگھاڑتی آواز سے دب کر رہ گیا کیونکہ باہر سے اندر آنے والی آواز بلاشبہ سنگری کی آواز سے ہر لحاظ سے بلند اور برتر تھی۔ یہ آواز یقیناً مولوی اللہ رکھے کی تھی جو چھوٹے زنان خانے کے باہر دروازے سے لگ کر کھڑے منگر کو بلا حساب وشمار گالیاں بکے جا رہا تھا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ منگر اُس کی سابقہ بھر جائی کا دور پار کا کوئی رشتہ دار ہے مگر مُلا خاندان سے رشتے کی جڑت کے بعد جب لڑکیوں کے نزدیک کے رشتے بھی اجنبی قرار دے دیے جاتے تو ایسے میں یہ دور پار کا سانڈ کیسے زنان خانے کی درسال سے جڑ کر کھڑا رہ سکتا تھا؟ منگر نے چوکھٹ چھوڑنے میں قدرے تاخیر کی تو مولوی رکھے نے دو چار ہاتھ جڑ دیے کہ بھین تڑیک اِدھر کھڑا کیا کر رہا ہے؟ رکھے کے ہاتھ منہ پر پڑے تو منگر کے ہونٹ پھٹ گئے۔ توازن بگڑا تو زمین پر جا گرا اور جب زمین پر گرا تو آتے جاتے لوگوں نے بھی لپڑ رسید کرنے شروع کر دیے۔ باہر خاموشی ہوئی تو اندر بھی سناٹا ہو گیا لیکن اِس کے باوجود اس سناٹے میں اگر کوئی آواز متحرک تھی تو وہ مولوی اللہ رکھے کی تھی۔ اُسی گرج اور اُسی دھاڑ کے ساتھ وہ منگر کو مسلسل گالیاں دیتا ہوا دروازہ تھپتھپا کر چھوٹے زنان خانے میں داخل ہو گیا۔

سنگری نے مُلا رکھے کو اندر آتے دیکھا تو جھٹ دوپٹے کا گھونگھٹ نکال لیا جب کہ ملوکاں نے سر پر دوپٹہ کرنے ہی پر اکتفا کیا۔ مُلا رکھا اگرچہ مقتول مولوی جاڑ اللہ کا چھوٹا بھائی تھا مگر اُس کے بڑے بیٹے مُلا بخشو سے بھی چھوٹا ہونے کے ناتے عجیب سے احساس کمتری میں مبتلا ہو کر رہ گیا جس کا مداوا وہ بے تحاشا گالیاں بک کر اور حد سے زیادہ کھا کر کیا کرتا۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے سے مدھرے قد کا مُلا رکھا اپنی توند کی بے راہ روی کے سبب عجیب سی ہئیت کذائی بن بیٹھا۔ مگر اِس جثے اور اِس طرح کی ہئیت میں ہونے کی اُسے ذرہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو ہر قسم کی عطا کے لیے بس قسمت کے قائل ہوتے ہیں، منہ دھونے، کپڑے بدلنے یا خوشبو لگانے جیسی مشقت کے نہیں۔ خوش بختی کے ایسے مواقع جن کے لیے لوگ جان تک دے بیٹھتے ہیں، اِن کے پاس خود چل کر آتے ہیں، یہ کہیں نہیں جاتے۔ اِسی واسطے پھر جو بھی عطا ہوتا ہے اُسے بے دریغ رگیدتے ہیں کہ شاید پھر یہ موقع ملے یا نہ ملے۔ لیکن اِس کے باوجود قسمت

ایسے لوگوں پر ہمیشہ مہربان رہتی ہے اور بار بار رہتی ہے جیسا کہ سنگری کی صورت اب ہونے جا رہی تھی۔

مُلا رکھا زنان خانے میں داخل ہوتے وقت بھی بار بار کھنگورا مارنے کے ساتھ ساتھ منگر جیسے لوگوں کی ماں بہن سے مختلف نوعیت کے رشتے جوڑنے کی زبانی کوشش کیے جا رہا تھا۔ سنگری کو اُس نے آج تک دیکھا نہیں تھا بس سُن رکھا تھا کہ بڑی اُکھڑ سی جوان عورت ہے جس نے اپنے حسن کے بل بوتے پر اُس کے بڑے بھائی کو بڑھاپے میں بھی پھڑکا کر رکھ دیا تھا جب کہ اُس کی ماں ملوکاں کو تو اُس نے ایک دو بار مولوی مرحوم کے حجرے میں مختلف مسائل پر اُلجھتے دیکھ رکھا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ خاندان ہی جھگڑالو اور بے غیرت لوگوں کا ہے لہٰذا اِن سے دور دور رہنا ہی اچھا۔ اُس کی بیوی نے اُسے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ دونوں ماں بیٹیاں جادوگرنیاں ہیں، جادو کر کے دوسروں کے مردوں کو قابو کرتی ہیں اور پھر جیسے دل چاہے ویسے نچوڑتی ہیں۔ مُلا رکھے نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ سنگری نے کسی ولدالحرام کو بھی مولوی جاراللہ کی ولدیت دے کر وراثت کا فتنہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ بہر حال آج وہ سوچ سمجھ کر آیا تھا کہ اگر وراثت کے معاملے پر بات چلی بھی تو اِن سے کیسے نمٹے گا؟

لیکن مُلا رکھا اُس وقت سٹپٹا کر رہ گیا کہ جب سنگری نے خیر مقدمی انداز میں چہرے کو گھونگھٹ میں سے نیم نمایاں کرتے ہوئے اُسے بڑے ماچے پر بیٹھنے کو کہا اور خود لبوں پر کوئی مسکراہٹ لائے بنا ہی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گلہ کیا کہ بڑے مولوی صاحب کی وفات کے بعد اُس کی طرف سے کبھی اِس بے چاری کا حال تک نہیں پوچھا گیا۔ مُلا رکھے کو نہ تو سنگری کے اِس قدر حسین ہونے کی توقع تھی اور نہ ہی اُس کے اتنے مہربان رویے کی لہٰذا وہ بوکھلا کر اپنے آپ ہی کو گالیاں دینے لگا۔ سنگری حیران تھی کہ کیسا بے غیرت شخص ہے کہ جو بلا سبب اپنی ماں بہن کے اعضائے پوشیدہ کو بر سرِ عام برہنہ کیے جا رہا ہے۔ وہ جان گئی کہ اُس کی توقع سے بہت پہلے ہی وہ بوکھلا کر چت ہو چکا ہے اور ایسے عالم میں جو اُس کے پاس بہتر ہے اُسی کا اظہار کیے جا رہا تھا۔ مُلا رکھے سے مُلاقات کا پہلا مرحلہ سرعت سے طے ہو چکا تو سنگری نے دوسرے میں قدم

رکھ دیا۔ اب کے اُس نے دوپٹے کو دانتوں میں دبایا، آنکھوں میں آنسو بھرے اور پھر مُلا کی طرف برگشتہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اِس طرح رونا شروع کیا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

مُلا رکھا جو ابھی پہلی بوکھلاہٹ پر قابو نہیں پاسکا تھا سنگری کی دلخراش آہ وزاری سے خود استابدحواس ہوا کہ اُس کے منہ سے نکلنے والی گالیوں کی رفتار تیز اور لہجہ دھیما ہوتا چلا گیا۔ وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ ایسے میں کرے بھی تو کیا کرے۔ ملوکاں نے بیٹی کو یوں روتے دیکھا تو پریشان ہو کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ملوکاں کی موجودگی چونکہ کسی طور سنگری کی روداد کی اثر انگیزی سے لگا نہیں کھاتی تھی لہٰذا اُسے اِس طرح جھٹکا دیا گیا کہ وہ خاموشی سے دور جا کر ایک چھوٹی سی پیڑھی پر بیٹھی اور ہانپنے لگی۔ مُلا رکھا نے بھی عافیت اِسی میں جانی کہ وہاں سے نکل لے لیکن اُس کا ارادہ بھانپ کر سنگری اِس طرح اُس کے سامنے آئی کہ وہ پھر سے وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اب کے سنگری نے دوپٹے کو ہوا میں اُڑ جانے دیا اور خود ننگے سَر زمین پر مُلا رکھے کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ زار و قطار روتے ہوئے اُس نے ایک ایک کر کے مُلا بخشو کی ساری شیطانی حرکتیں مُلا رکھے کے سامنے کھول کر رکھ دیں۔

مُلا رکھا جو پہلے ہی سنگری جیسی تناور لڑکی کے اپنے قدموں میں بیٹھنے کے سبب جذباتی طور پر ڈھیر ہو چکا تھا، بخشو کی حرکات کا سُن کر باؤلا ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے رکنے کے سبب اُس کے منہ میں جمع شدہ گالیاں ایک دم پھر سے اِس طرح نکلیں کہ اُن میں سے کچھ الفاظ کی صورت اور کچھ باچھوں سے بہنے والے جھاگ کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ اب تو مُلا رکھے سے سنگری کے ہاں بیٹھے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے نکلنے والی تمازت بتا رہی تھی کہ وہ جاتے ہی مُلا بخشو کو اِس بے حیائی کی سزا دینا چاہتا تھا۔ اُس کے منہ سے نکلنے اور بہنے والی گالیوں کا رُخ اب کے مُلا بخشو کی جانب تھا۔ سنگری نے جیسا سوچا تھا، مُلا رکھے سے ملاقات کا دوسرا مرحلہ بھی اُسی طور مکمل ہو چکا تھا لہٰذا اُس نے احتیاط سے اپنا قدم تیسرے مرحلے میں رکھ دیا۔

مُلا رکھا جوں ہی اپنے بھاری بھرکم وجود کو اکٹھا کر کے ماچے سے نیچے اُترنے لگا سنگری نے جھٹ سے اُس کے پاؤں پکڑ لیے۔ زار و قطار روتی ہوئی سنگری کے ہاتھوں کا لمس مُلا کے

پاؤں اور پنڈلیوں میں اُترا تو اُس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کی اثر انگیزی ضرب در ضرب ہوتی چلی گئی۔ وہ اُسے اُٹھنے اور جانے سے روک رہی تھی اور وہ خود بھی اُٹھنے کی کوشش میں نہ اُٹھنے کی کوشش کیے جا رہا تھا۔ اِس کرشماتی لمحے کو طول دینے کے لیے وہ بار بار اُٹھنے کے لیے مچلتا اور سنگری اُتنی ہی سرعت سے پورے بدن کا زور لگا کر اُسے اُٹھنے سے روکنے کے لیے اپنے ہاتھ اور بازو اُس کی پنڈلیوں کے گرد حائل کر لیتی۔ اللہ رکھا جان گیا تھا کہ جوں ہی وہ دوبارہ سے جم کر بیٹھا سنگری کے ہاتھوں کے لمس سے محروم ہو جائے گا۔

سنگری بدستور روتے ہوئے اُسے واسطے دیے جا رہی تھی کہ وہ خدا کے لیے کوئی ایسا کام نہ کر دے جس کے سبب اُس کی زندگی، عزت اور مُلا خاندان کی حرمت پر کوئی حرف آئے۔ ''میں نے یہ سب کچھ آپ کو اِس لیے نہیں بتایا کہ آپ اُس شیطان کو جانوں مار دیں اور خود پھانسی چڑھ جائیں۔ اِس طرح تو آپ کا خاندان ٹکے کا نہیں رہے گا۔ لوگ تھوتھو کریں گے اور آپ لوگوں کی عورتیں آوارہ لوگوں کی شہوت تلے روندی جائیں گی۔ اللہ کے واسطے آپ کہیں نہ جائیں اور میری بات سُن لیں، ذرا حوصلے سے۔'' اللہ رکھے کے پاؤں اور پنڈلیوں کی حرکت رُکی تو اُس کی سانس پھول گئی۔ سنگری بھی اپنے بر بر آنسو ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے شُوں شُوں کرتی ناک کو کلائی سے رگڑنے لگی تھی۔ مُلا رکھے نے اپنے کندھے پر رکھا ململ کا صافہ ہاتھ میں لیا اور نجانے کیسے ہمت کر کے اُس کے گالوں پر ایک بار دائیں بائیں پھیرا اور پھر جلدی سے آنکھیں نیچی کر لیں۔ سنگری نے بھی حیران آنکھوں سے اللہ رکھے کی اِس حرکت کو دیکھا۔ اب وہ سر سے پاؤں تک مطمئن تھی۔ وہ اُس کے قدموں سے اُٹھ کر ساتھ ہی ماچے پر بیٹھ گئی۔

''مجھے بہت ارمان لگا تھا جب بڑے مولوی صاحب کی وفات کے بعد خاندان کی پگ آپ کے سر پر رکھنے کے بجائے اُس گاوے کے سر پر رکھ دی گئی جسے نہ تو ماں کا لحاظ ہے اور نہ ہی بہن کا۔ جو شیطان گھر میں رکھنے کے قابل نہیں اُسے امامت دے دی گئی۔ مانتی ہوں کہ آپ بہت شریف ہیں مگر ایسی شرافت بھی کس کام کی جس میں آدمی اپنا حق بھی نہ لے سکے۔ اب دیکھیں نا! میں چھوہر تھی، اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب نے حق کر لیا، اللہ نے ایک پُتر بھی دے دیا.... اب

اگر میں چاہوں تو کہیں بھی حق کروں یا منہ کالا کروں.... لیکن مجھے آپ کے خاندان کی شرافت کا لحاظ ہے۔ چھوٹے زنان خانے میں آئی تو یہاں سے میرا جنازہ نکلنا چاہیے لیکن لحاظ نہیں تو آپ کو نہیں.... کبھی سوچا کہ بڑے مولوی صاحب کا چھوٹا بھائی ہوتے ہوئے اُس کے بعد اگر کسی کو نکاح کا حق ہے تو وہ آپ کو ہے.... لیکن آپ کو تو ہر جگہ اپنا حق چھوڑنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اگر آپ مجھ سے حق نہیں کریں گے تو پھر کئی کُتے بِلے اِس چھوٹے زنان خانے کے دروازے کے سامنے کُوس کُوس کرتے پھریں گے.... مجھ سے حق کریں اور مجھے میرا حق دیں ورنہ یہ نہ کہیں کہ میں نے آپ کے خاندان کی عزت مٹی میں ملا دی.... اور ہاں! جو میں نے کہا اور جو آپ نے سُنا.... مجھ سے حق کریں یا نہ کریں دونوں صورتوں میں یہیں ختم..... آپ بزدل آدمی ہیں، کہیں بزدلی میں خاندان کو نہ برباد کر لیں۔"

سنگری کی باتیں سُن کر مُلا اللہ رکھے کا جہاں منہ کھلا وہاں دیدے بھی کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ کافی دیر تک کچھ بولے بغیر حیرت، ندامت اور شہوت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ سنگری کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ماچے سے اُٹھتے ہوئے کپکپاتی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہہ سکا کہ کب کرنا ہے نکاح میرے ساتھ؟

## ۳۷

جان برنٹن کے خلاف انکوائری کو شروع ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اِس ایک ماہ کے دوران سوائے اتوار کے اُسے ہر روز کمپنی کے بہاول پور آفس میں بلایا جاتا رہا۔ کبھی کچھ کارروائی آگے بڑھتی لیکن اکثر سارا دن انتظار کرانے کے بعد اُسے واپس بھیج دیا جاتا۔ چونکہ اُس کے خلاف نہ تو کوئی غیر جانب دارانہ شہادت تھی اور نہ کوئی ایسا ثبوت کہ جسے رد نہ کیا جا سکے اِس لیے صاف ظاہر تھا کہ اِس ساری کارروائی کا مقصد اُسے ذہنی طور پر خجالت اور اذیت سے اِس طرح دو چار کرنا تھا کہ وہ خود ہی ملازمت چھوڑ کر چلا جائے۔ جان برنٹن دفتری معاملات کے اِن تاریک گوشوں کو نہ صرف اچھے سے جانتا تھا بلکہ اُن لوگوں کو پہچانتا بھی تھا کہ جن کا مفاد جان برنٹن کی اہانت سے جڑا ہوا تھا۔ سو اُس سے روا رکھی گئی ہر قسم کی تذلیل اُسے ہر بار مزاحمت کا نیا حوصلہ عطا کرتی۔

اُس کے لیے سب سے بڑا امتحان اپنے بیٹے ولیم پر جرح کرنا تھا جو اُس کے خلاف بطور سرکاری گواہ کے پیش ہوا۔ اگرچہ تائیدی بیان قلم بند کراتے ہوئے اُس نے اپنے باپ کے ساتھ نگاہیں ملانے سے گریز کیے رکھا مگر جب اُسے جرح کے واسطے جان برنٹن کے حوالے کیا گیا تو دونوں کی آنکھیں آپس میں ٹکرا ہی گئیں۔ باپ کی آنکھوں میں حرفِ شکایت اور بیٹے کی آنکھوں میں شرمندگی تھی۔ لیکن جان کی جانب سے پوچھے گئے دو تین سوالوں کے بعد ہی نہ تو باپ کی

آنکھوں میں حرفِ شکایت باقی رہا اور نہ ہی بیٹے کی آنکھوں میں شرمندگی۔ جان برنٹن کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ولیم کے اندر اُس کی ماں مُیری کی روح حلول کیے ہوئے ہے۔ آنکھوں میں وہی حقارت، چہرے پر اُسی جیسی لاتعلقی اور زبان میں اُسی برانڈ کا زہر۔ اب تو وہ جان برنٹن کا سوال مکمل ہوئے بغیر اُسے جھپاک سے رد کرنے لگا تھا۔ جان برنٹن کو اپنی زبان لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہونے لگی کہ جیسے اُس کا دم نکلنا وہیں سے شروع ہو رہا ہو۔ ولیم کے جان دار لہجے اور کڑاک دھڑاک رویے سے وہ برحق اور جان برنٹن اپنے آپ کو بھی دروغ گو لگنا شروع ہو چکا تھا کہ جو جھوٹ کو چھپانے کی ناکام کوشش میں ہر گام ناکام ہوئے چلا جا رہا تھا۔ ولیم نے جرح میں اُسے ویسے ڈھیر کر دیا تھا کہ جیسے اُس کی ماں زندگی بھر اُسے کرتی آئی تھی۔ وہ سچ پر ہوتے ہوئے بھی مُیری سے کبھی نہیں جیت سکا تھا۔ وہ کبھی نہیں جان سکا تھا کہ سچ کو سچ ثابت کرنے کے لیے بھی اِس قدر زیادہ جھوٹ کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ مُیری کا چہرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے گھوما تو وہ جرح کے باقی سوالات بھول گیا۔ ذہن پر کافی زور دینے کے بعد بھی اُسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ کون سے سوال پوچھے جانا باقی تھے۔

جان برنٹن کٹہرہ چھوڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بری طرح ہانپنے لگا۔ انکوائری اُفسر کا کمرہ اُسے گھومتا ہوا محسوس ہوا تو اپنے حواس مجتمع کرنے کے واسطے اُسے شدت سے شراب کی طلب محسوس ہوئی۔ شراب نہیں تو سگار۔ سگار نہیں تو کم از کم ایما کی موجودگی۔ لیکن ایما تو اُس کے سامنے موجود تھی پراسیکیوٹر کے روپ میں اور ولیم، جان برنٹن کا بیٹا اُس کا گواہ تھا یعنی پراسیکیوشن کا گواہ۔ کیسا بدلاؤ تھا جس عورت سے شادی کے سبب ولیم اُس سے ناراض تھا، اب وہ اُسی کا گواہ بن کر اُسی کے ہاتھوں اپنے باپ کے خلاف گواہی دے رہا تھا۔ کمرے میں اگرچہ خاموشی تھی لیکن وہاں بیٹھے ہوئے سبھی لوگ جان برنٹن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی ترحمانہ اور کوئی استہزائیہ انداز میں۔ جان کے لیے نہ تو استہزا قابل برداشت تھا اور نہ ہی کسی کا ترحم۔ اُس کے کانوں نے سُنا کہ ایما اُس پر ترس کھاتے ہوئے انکوائری آفیسر سے کارروائی ملتوی کرنے کی استدعا کر رہی تھی۔ اِس سے پہلے کہ انکوائری آفیسر کوئی فیصلہ کرتا، جان برنٹن پوری قوت سے اُٹھ کھڑا ہوا اِس گذارش کے ساتھ

کہ وہ جرح کی کارروائی آج ہی مکمل کرانا چاہتا ہے۔ انکوائری آفیسر کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا اور یوں ایک بار پھر ولیم اپنے باپ کے ہر سوال کو ٹھوکروں میں اُڑائے چلا جا رہا تھا کسی ایسے ریسلر کی طرح جو جانتا تھا کہ اُس کا حریف شکست کی اُس منزل تک پہنچ چکا ہے جہاں کوئی بھی ٹھوکر اُس کے لیے آخری ٹھوکر ثابت ہو سکتی تھی۔

جان برنٹن سمجھ چکا تھا کہ بیٹا اب کسی بھی صورت ٹلنے والا نہیں۔ اُس کے ہاں باپ کے لیے رعایتی نمبروں کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی صلہ رحمی کی صورت۔ لہٰذا ایسے میں بہتر فیصلہ یہی تھا کہ اپنے پندار کو سلامت رکھا جائے۔ جوں ہی جان برنٹن اِس فیصلے پر پہنچا وہ جرح سمیٹتے ہوئے ایک قدم اونچے چبوترے سے نیچے اُترا، سینے پر ہاتھ رکھ کر احتراماً گردن کو ہلکا سا خم کیا اور انکوائری آفیسر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ ولیم آرتھر بھی چند لمحے گواہ کے کٹہرے میں کھڑے رہنے کے بعد انکوائری آفیسر کا اشارہ ملتے ہی فاتحانہ چال چلتا ہوا جان برنٹن کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے نگاہ بھر کر ایک بار پھر اپنے باپ کو دیکھا کہ جو اُسے بظاہر قائم و دائم مگر اندر سے مکمل طور پر اُدھڑا ہوا لگ رہا تھا۔ اُس ایک لمحے نے دونوں کے تصورات میں مَیری کو یک جا کر دیا تھا۔ جان برنٹن اُس کے سامنے حسبِ سابق شکست خوردہ اور دلدوز جب کہ ولیم آرتھر اپنی ماں کے روبرو کامیاب و سرخرو۔

جان برنٹن کو اَب انکوائری میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ایک بے معنی کارروائی جس کا اَنت اُس کا کمپنی کی ملازمت سے بے آبرو ہو کر فراغت پانا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ولیم آرتھر کی گواہی قلم بند ہونے سے پہلے وہ سمجھتا رہا تھا کہ وہ ایک ناراض بچے کی طرح اُس کی مخالفت کا کھیل کھیل رہا ہے۔ اگرچہ اُس کی ناراضی کی کئی وجوہات تھیں مگر اُن میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی کہ جسے اِس سطح کی معاندانہ روش کا جواز بنایا جا سکے۔ تمام تر خدشات کے باوجود ذہن کے کسی گوشے میں ایک آس سی تھی کہ ولیم اپنے بیان میں اپنے باپ کی عزت، آبرو اور نیک نامی کو کمپنی کے چند مہم جو لوگوں کے مفادات پر قربان نہیں کرے گا اور سچ بول دے گا۔ لیکن جو کچھ اُس نے کہہ دیا اور جس طرح سے کر دیا، اِس نوعیت کے رویے نہ تو ایک دن میں بَن پاتے ہیں اور نہ ہی پروان چڑھتے

ہیں۔ اُس کے پاس رہتے ہوئے بھی اور اُس کے ساتھ کمپنی میں جاب کرتے ہوئے بھی ولیم ایک خاص ذہنی روش کے تحت بسرام کرتا رہا لیکن محسوس نہیں ہونے دیا کہ اُس کے ذہن کا اندرونی خلفشار کس رُخ پر اور کس ڈھب پر چڑھاؤ میں ہے؟

''تو کیا اُسے واقعی نہ مردم شناسی آسکی اور نہ زن شناسی؟''.... جان برنٹن ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے بتایا گیا کہ اُس روز کی کارروائی ختم ہو چکی اور اگلی تاریخ کب ہوگی، یہ بتانے والی اور کوئی نہیں، اب تک اُس کی بیوی ایما تھی۔ ایما کا سپاٹ چہرہ اور سرد لہجہ اُس کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ اُس کی طرف دیکھے بِنا اور آدھے ہونٹوں کو حرکت میں لائے بغیر جان مسکرا دیا کہ اِس کا جواب اِس کے علاوہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ''انسانوں کے باہمی روابط میں مصلحت بہت کمال کردار ادا کرتی ہے جسے عرفِ عام میں لحاظ کا نام دیا جاتا ہے۔ مصلحت اور لحاظ ایسے بہت سے ناروا رویوں پر پردہ ڈالے رہتے ہیں کہ جن کا کہیں پہلے علم میں آجانا ضروری ہوتا ہے اِس لیے کہ انسان، انسانوں کے فریب سے بچا رہتا ہے۔ مگر کیا کیجیے جب کہیں آخر میں یہ پردہ اُٹھتا ہے تو فریبی کے پاس سوائے ڈھیٹ ہو جانے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا اور یوں فریب دینے والا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے اور فریب کھانے والا نگاہیں جھکا کر۔''

ولیم آرتھر کی گواہی کے بعد کی تاریخوں میں انکوائری جیسے تیسے چلتی تو رہی مگر جان برنٹن اِس سے حقیقی طور پر لاتعلق رہا۔ اب اُسے کسی سے گِلہ نہیں رہا تھا۔ کچھ کرنے اور زندگی کو آگے رواں رکھنے کی خواہش غرقاب ہوئی تو سطحِ آب پر کچھ نہ رہا۔ ہاں اگر کچھ تھا تو کبھی کبھی مزاج میں در آنے والی جھنجلاہٹ کہ تادیب کو تاخیر میں کیوں رکھا جا رہا ہے۔ جو کچھ ہفتوں بعد کرنا ہے وہ آج کیوں نہیں کر لیا جاتا۔ جان برنٹن کچھ عرصہ پہلے اِس کیفیت کا شکار ہوا تو ایما کی صورت اُسے زندگی کرنے کا وطیرہ ہاتھ لگا مگر اب تو کچھ ایسا بھی نہیں تھا اور نہ ہی اِس کا امکان کہ انسان کب تک تجربات کی نذر ہوتا رہے۔ جان برنٹن ویسے بھی خوش خوراک نہیں تھا اور نہ ہی بسیار خوار لیکن ولیم آرتھر کی گواہی کے دن سے دو تبدیلیاں خاص طور پر اُس کے مزاج کا حصہ بنیں۔ ایک تو اُس کا کھانا نہ ہونے کے برابر رہ گیا اور دوسرا شراب کی نسبت سگار نوشی دن بھر کی آکسیجن سے بھی متجاوز

ہوگئی۔ اُس کی کوشش ہوتی کہ کمپنی کے بہاول پور آفس سے آتے ہی ایک پیگ شیواز کا بنا کر تپائی پر رکھے اور اُس کے ساتھ دھری اپنی مخصوص آرمز چیئر پر بیٹھتے ہی سگار سلگا لے۔ اِس دوران اُس کا سابقہ خانساماں اُس کی پہلے سے کہی ہوئی ڈش جو عموماً بیف کباب اور موسمی سلاد پر مبنی ہوتی، لے آتا اور اُسے ڈسٹرب کیے بغیر اُسی تپائی پر رکھ کر چلا جاتا جہاں وہسکی کا ایک پیگ پہلے سے رکھا جان برنٹن کے سِپ لینے کا منتظر ہوتا۔ یہ منظر ایک تسلسل کے ساتھ رات گئے تک چلتا۔ اِس دوران نہ تو وہ کباب کو ہاتھ لگاتا اور نہ ہی شراب کو۔ مسلسل سگار پینے کے سبب خیمے میں دھواں بھر جاتا تو وہ باہر جانے کے بجائے اُٹھ کر خیمے میں ترپال کی بنی ہوئی کھڑکی سے پردہ ہٹا دیتا۔ جب کبھی طلب ہوتی تو کباب کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ کر اُس کا مزہ اس طرح لینے لگتا جیسے یہ ٹکڑا چبائے جانے کے بجائے محض چبولنے کے لیے ہے۔

اِک عمر جو اُس نے ریلوے اور ریلوے ٹریک کے جنون میں گزاری تھی ایک دم کہیں کھو گئی تھی۔ نہ صرف کھو گئی بلکہ حافظے سے یوں غتر بود ہوئی کہ یاد ہی نہ رہا وہ کرتا کیا تھا اور کہاں کہاں کیا کچھ کیا بالکل اُسی طرح کہ جیسے اگلی صبح پھانسی پر لٹکائے جانے والے قیدی کو آخری ملاقات کی اطلاع پا کر زندگی یا زندہ ہونے کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اُسے تو یہ احساس تک نہیں تھا کہ وہ دریائے ستلج کے کنارے انڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے سائٹ آفس میں کیا کر رہا ہے؟ ولیم آرتھر کے بیان سے قبل وہ حسبِ عادت کیمپ سے باہر نکل کر ایمپریس برج کے تعمیر کے کام پر اُسی طرح نگاہ رکھتا کہ جیسا پہلے رکھا کرتا تھا۔ مگر اب یہ احساس بھی اپنی حساسیت کھو چکا تھا۔ برج کا کام کہاں تک پہنچا کہاں نہیں پہنچا اُس کی بلا سے۔ جب وہ اُس کے روزمرہ کے شیڈول ہی میں نہ رہا تو اُس کی فکر کیا کرنی اُس کے بارے میں سوچنا کیا۔ ایمپریس برج کا ڈیزائن بنتے وقت ریلوے انجن پندرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پلوں سے گزرا کرتے تھے مگر جان برنٹن کا خیال تھا کہ ایک پرفیکٹ قسم کے ریلوے ٹریک کو بچھا کر انجن کو تیس میل فی گھنٹہ کی محفوظ رفتار سے گزارا جا سکتا تھا۔ کمپنی کے دوسرے انجینئرز کے نزدیک یہ ایک ایسے دیوانے کا خواب تھا جو کسی وقت بھی سینکڑوں لوگوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال سکتا تھا لیکن ساتھیوں کی تنقید سے قطع نظر وہ ہر

قیمت پر اپنے اِس جنون کی تکمیل کی جستجو میں تھا۔ مگر ولیم آرتھر کے بیان کے بعد اب اگر اُسے فکر ہوا کرتی تو محض اِس بات کی کہ اُس کے سگار باکس میں کتنے سگار باقی رہ گئے ہیں۔ ایمپریس برج پر ریلوے انجن کی رفتار سے اُس کا وابستہ جنون، ہذیان آفرینی کے دائرے سے بھی نکل چکا تھا۔

اُس شام آدم واہن کے ریت کے دیوہیکل ٹیلوں سے اُٹھنے والی طوفانی آندھی نے اِنڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے سائٹ آفس کو اُجاڑ پچھاڑ کر رکھ دیا۔ اگر چہ خیمے اُکھڑنے سے محفوظ رہے مگر باقی جو کچھ ہونا ہوتا ہے وہ سب کچھ ہو کر رہا۔ جان برنٹن گذشتہ تین برسوں سے یہاں کے صحرائی موسم کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اُسے زمینی تبدیلیوں اور آسمانی تغیرات سمیت سبھی ماحولیاتی رجحان معمول کا حصہ دکھائی دینے لگے تھے۔ صحراؤں میں اُٹھنے والی آندھیاں چونکہ بارشوں کو جلو میں لے کر نہیں چلتیں اِس لیے اُن کا زور ٹوٹنے تک بہت سی ریت اپنا مقام بدل چکی ہوتی ہے۔ لیکن جان کا خیمہ پھر بھی قدرے بچا رہتا کہ ریت نہ تو اِس کے اندر داخل ہو پاتی اور نہ ہی اُس کے اوپر ٹھہر پاتی، بس چھت کی ڈھلوان اطراف سے نیچے گرتی رہتی۔ جان برنٹن طوفان کی شدت، رفتار اور اوقات سے قطع نظر سگار کے دھوئیں پر نظر رکھے ہوئے تھا کیونکہ ہوا کا بیرونی کم دباؤ، سگار سے اُٹھنے والے دھوئیں کی ہیئت اور تحلیلی گھماؤ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ سگار پیتے ہوئے نجانے کیسے اُسے ریت کے ذرات کا ذائقہ اپنی زبان کی نوک اور لبوں کی اندرونی جانب محسوس ہوا تو اُس نے برا سا منہ بنا کر سگار کو ایش ٹرے کے کونے پر دھیرے سے دھر دیا اور تپائی پر کافی دیر سے رکھا ہوا شیواز کا پیگ اُٹھا لیا۔ اُس کی چسکی لینے کے لیے جوں ہی وہ لبوں تک آیا تو اُس کی نگاہ پیگ میں موجود شراب کی اوپری سطح پر پڑی جہاں گرد کی ایک لطیف سی تہہ آئی ہوئی تھی۔ باہر آیا ہوا ریت کا طوفان تمام تر انسانی کوششوں کے باوجود خیمے کے اندر اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

جان برنٹن نے ہاتھ میں لیا ہوا پیگ واپس تپائی پر رکھ دیا۔ اب خیمے کے باہر اُڑ رہی ریت اُسے اپنے چہرے پر، ناک کے نتھنوں میں، آنکھوں کی پلکوں پر ہلکی سی تہہ بچھاتی محسوس ہونے لگی تھی۔ اُس نے خیمے میں اِدھر اُدھر نگاہیں گھمائیں مگر کہیں سے بھی دراندازی کا کوئی امکاں

نہ تو دکھائی دیا اور نہ ہی سُجھائی پڑا۔ مگر اس کے باوجود طبیعت بدمزہ ہونے لگی تھی۔ اُس نے پتلون کی سائیڈ جیب میں ہاتھ ڈال کر سفید رنگ کا نفیس سا رومال نکالا اور تیزی سے اُسے چہرے پر ملا اور پھر مل کر غور سے دیکھا۔ گرد کی ہلکی سی تہہ اُس کے چہرے سے رومال پر منتقل ہو چکی تھی۔ جان برنٹن نے آرمز چیئر سے اُٹھ کر خیمے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اضطراب کی شدت اُس کے چہرے سمیت پورے بدن سے ہویدا تھی۔ نجانے کہاں سے اُسے ایمپرس برج کی بنیادوں کی ساخت کا خیال آ گیا تھا۔ اُسے گماں سا ہونے لگا تھا کہ اُس کے بیٹے ولیم آرتھر سمیت باقی سبھی انجینئرز جو ولیم سینٹ جان گالوے کو چیف انجینئر دیکھنا چاہتے ہیں ضرور کچھ ایسا کر گزریں گے کہ برج پر سے گزرنے والے انجن کی رفتار تیس میل فی گھنٹہ نہ ہو سکے۔

طوفان تھمنے تک کا عرصہ گزارنا جان برنٹن کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ کئی بار اُس نے باہر نکلنے کی کوشش بھی کہ پُل کے ستونوں کی بنیادوں کو جا کر اچھی طرح سے دیکھے کہ اُن کی بھرائی طے شدہ معیار کے مطابق ہو رہی ہے کہ نہیں لیکن ہر بار یہ سوچ کر ٹھہر جاتا کہ ریت کے طوفان میں پل کے ستونوں تک کیسے پہنچ پائے گا؟ چند ساعتوں کے بعد اُسے احساس ہوا کہ آندھی ختم ہو چکی اور طوفان تھم چکا۔ وہ خیمے کے دروازے کی زپ کھول کر ترپال کی بنی ڈیوڑھی میں آیا اور پھر ڈیوڑھی کے بند ہٹانے کے بعد راہ داری میں نکل آیا جو آگے جا کر کھلے آسمان تلے کھلتی تھی۔ باہر آ کر معلوم ہوا کہ آندھی تو بدستور چل رہی تھی مگر اُس کا زور قدرے ٹوٹ چکا تھا۔ ریت کا اُڑنا بھی بہت حد تک کم ہو چکا تھا مگر پھر بھی جان برنٹن کے کپڑے، بال اور چہرہ اُڑتی ہوئی ریت اور مٹی سے اَٹ گئے۔ آنکھوں میں ریت گھسی تو خیال آیا کہ وہ تو انکوائری شروع ہوتے ہی اپنے عہدے سے ہٹایا جا چکا ہے تو اب کس طور اور کس حیثیت میں تعمیراتی کام کا جائزہ لے سکے گا؟ یہ خیال آتے ہی جان برنٹن دل مسوس کر رہ گیا۔ کچھ دیر وہیں رُکا رہا اور پھر واپس اپنے خیمے کی طرف چل پڑا۔ آندھی اب بالکل ختم ہو چکی تھی مگر جان پورے کا پورا گرد آلود ہو چکا تھا۔ چہرہ صاف کرنے کے لیے اُس نے جیب سے رومال نکالنا چاہا مگر جیب خالی تھی۔ رومال شاید خیمے میں رہ گیا تھا۔

جان برنٹن ابھی واپس اپنے خیمے میں داخل نہیں ہو پایا تھا کہ کمپنی کا ہرکارا سامنے تیز تیز

قدموں سے اُس کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ جان رُک گیا۔ ہرکارا پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اُس کے پاس پہنچا، سلام کیا اور خاکی رنگ کا ایک سر بمہر لفافہ اُس کے ہاتھ میں تھما کر دستخط بھی لے لیے۔ جان لفافہ ہاتھ میں تھامے خیمے میں آیا تو سب سے بڑا مسئلہ آنکھیں صاف کرنے کا تھا کہ جنہیں دھوئے بنا صاف کرنا ممکن نہیں تھا۔ مگر پھر نجانے کیا خیال آیا کہ آنکھیں رومال سے صاف کر کے لفافے کو ایک کونے سے پھاڑا اور اندر رکھا ہوا ٹائپ شدہ کاغذ نکال کر آنکھوں کے قریب کرلیا۔

یہ چیف انجینئر جان برنٹن کے نام انڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی کی ملازمت سے فوری برطرفی کا حکم نامہ تھا جسے تین دن کے اندر کمپنی کے ساتھ اپنے مالی معاملات طے کرنے اور سائٹ آفس میں رہائش گاہ خالی کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اِسی حکم نامے میں ولیم سینٹ جان گالوے کو کمپنی کا نیا چیف انجینئر مقرر کرتے ہوئے فوری طور پر چارج سنبھالنے کی تاکید بھی موجود تھی۔ اِس تحریر کو دو تین بار پڑھتے ہوئے جان برنٹن کی گرد آلود آنکھیں نم آلود بھی ہو چکی تھیں۔ اُسے اپنی برطرفی کا یقین تو پہلے سے تھا مگر یوں اِس طرح اچانک سے ہو جائے گا، اِس کا یقین نہیں تھا۔

# ۳۸

سنگری سے مُلا اللہ رکھے کے نکاح کی خبر نے مولوی خاندان میں ایک قیامت سی برپا کر دی۔ مُلا بخشو نے اپنے سے چھوٹی عمر کے چچا کی اِس حرکت کو طاغوتی روش قرار دیتے ہوئے اُس کی پہلی بیوی کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ فوری طور پر مُلا اللہ رکھا سے طلاق لے وگرنہ اُس کا بھی حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ مُلا اللہ رکھے کی پہلی بیوی، رشتے میں چونکہ مولوی جارُ اللہ کی دوسری زوجہ کی ہمشیرہ تھی، اِس لیے بڑی مُلوانی نے بھی چھوٹی بہن کو پیغام بھجوا دیا کہ اللہ رکھے سے طلاق لینے تک اُس کا بڑے زنان خانے میں داخلہ بند رہے گا۔ اِس کے ساتھ ہی مُلا بخشو نے خاندان کے علاوہ اپنے والد مرحوم کے قریبی رفقا تک بھی یہ خبر مختلف ذرائع سے پھیلا دی کہ سنگری اُس کے باپ سے نکاح سے قبل کسی بدقماش کے ساتھ زنا کی مرتکب ہو چکی ہے اِسی لیے تو اُس کا بیٹا مَنّو چھ ماہیا پیدا ہوا تھا۔ سنگری پر یہ الزام بھی لگا دیا گیا کہ اُس نے ضعیف العمر مولوی ڈِتّن کو دھوکا دے کر نکاح کر لیا تا کہ بچے کو حلالی ثابت کیا جا سکے۔ اِس کے ساتھ ہی ایک پیغام سنگری کو بھی بھجوا دیا کہ اُس کی چال اُسی پر اُلٹ کر اِس طرح برباد کیا جائے گا کہ دنیا عبرت حاصل کرے گی۔ مُلا بخشو نے اِسی قسم کی ایک تنبیہ اپنے چچا مُلا اللہ رکھے کو بھی پہنچوا دی کہ اُس حرام زادی کو طلاق دے کر اپنے آپ کو پاک صاف کرے وگرنہ بستی آدم واہن سے نکال باہر کرایا جائے گا۔ طیش کی شدت سے مُلا بخشو کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُس کا کون سا حربہ کارگر ہو جس کے نتیجے میں سنگری پھر سے اُس

کے ہاتھ میں کُٹی کبوتری کی طرح مسلسل پھڑ پھڑاتے رہنے کے لیے مجبور ہو جائے۔اُس کے اِس پاگل پن میں اُس کی ماں بوجوہ بھرپور ساتھ دے رہی تھی جسے چھوٹے زنان خانے کے لیے بربادی کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔اُس کے لیے اِس سے آگے سوچنا ہی ممکن نہیں رہا تھا کہ ایک جوان چھوکری نے محض اپنی کمسنی کی طاقت سے اُس کے بڑھاپے ہی کو نہیں بلکہ عرصے سے قائم عائلی استعمار کو چاروں شانے چت کر کے رکھ دیا تھا۔لہٰذا سنگری اور اُس کے کتورے کو قبر تک پہنچانے کے لیے حرام کاری اور چھ ماہیا بچہ پیدا کرنے جیسے الزامات اور اُن کا چرچا، اِسی خاتون کے ذہن رَسا کی پیداوار تھے۔لیکن طومار کا یہ ماحول زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔

مُلا اللہ رکھا جو تمام تر ہنگامہ آرائی، گرد اُڑائی اور الزامات کی بوچھاڑ کے باوجود نکاح کے بعد سے مسلسل چھوٹے زنان خانے میں بند رہا تھا، تین دن کے بعد ہانپتا کانپتا بڑی مشکل سے اپنے پاؤں پر چل کر بڑے گھر پہنچا تو غصے اور انتقام کی آگ میں کھولتی ہوئی اُس کی بیوی نے اُسے اِس طرح لتر ولتر کر کیا کہ وہ زمین پر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔مُلانی اِس قدر غضب ناک تھی کہ وہ بے ہوش پڑے گوشت کے پہاڑ کو بھی پاؤں کی ٹھوکروں میں لیے رہی کہ جب تک اُس کے بیٹے نے آ کر اُسے پکڑ کر کمرے میں نہ بند کر دیا۔بڑی مشکل سے بے ہوش مُلا رکھے کو اُٹھوا کر ماچے پر ڈالا گیا اور حکیم کو بلوانے کے بعد کہانی یہ گھڑی گئی کہ مُلا بے چارہ نو بیاہتا بیوی کے گھر سے آتے ہوئے ڈیوڑھی ہی میں گر کر بے ہوش ہو گیا ہے۔

مُلا رکھے کی باچھوں سے مسلسل بہتی جھاگ اور نبض کی رفتار دیکھنے کے بعد حکیم کا خیال تھا کہ خواہشِ جماع کی شدت اور کوششِ جماع میں ناکامی کے سبب کسی اناڑی حکیم کا بنا ہوا شنگرف کا کچا کشتہ کھایا گیا ہے جو پوری طرح مرا ہوا نہیں تھا۔اِس کچے کشتے نے جگر اور گردوں کو اندر سے گھول کر اِس طرح لُغد ابنایا کہ اب مُلا اللہ رکھے کا بچنا مشکل ہو گیا تھا۔حکیم ابھی رُخصت نہیں ہوا تھا کہ مُلا بخشو بھی چاچے کا احوال سُن کر وہاں آن پہنچا۔مُلا رکھے کو اِس حالت میں دیکھا تو اندرو اندری سر سے پاؤں تک نہال ہو گیا مگر اوپر اوپر سے دُکھارا ہو کر مُلا بخشو نے حکیم سے علاج معالجے کا پوچھا تو اُس نے علاج کے بجائے دعا کرنے کا مشورہ دیا اور وہاں سے کھسک لیا لیکن

کھسکتے ہوئے حکیم کو مُلا بخشو نے اِس طرح دبوچا کہ بیرونی دروازہ عبور کرنے سے پہلے ہی اُسے جتا دیا کہ خبردار کسی سے گشتے دُشتے کی بات نہیں کرنی۔ بات کرنی بھی ہو تو صرف اتنی کہ مُلا اللہ رکھے کو پچھلے آٹھ پہروں میں سنکھیا کھلایا گیا ہے۔ یہ کہہ کر بخشو نے حکیم کو اِس طرح دھکا دیا کہ وہ کواڑ سے ٹکراتا ہوا چوکھٹ پر جا گرا۔ اِس سے پہلے کہ حکیم کپڑے جھاڑ کر پھر سے کھڑا ہوتا، مُلا بخشو اندر زنان خانے میں جا چکا تھا۔

اُدھر باپ کو آخری دموں پر دیکھا تو مُلا اللہ رکھے کا بیٹا کمرے کی طرف دوڑا، اُس کی کنڈی کھولی اور ماں کو باہر نکالا۔ ماں جواب تک طیش میں تھی اُس نے اب کے بیٹے کو گریبان سے پکڑا اور جوتا اُتار کر لتر پولا کرنے ہی لگی تھی کہ اُس نے ماں کی کلائیاں اِس طرح قابو میں کیں کہ وہ بیٹے کی جکڑن میں آ کر ہانپنے لگی۔ ''کیوں پھٹنے لگتی ہے ماں ابے کو قتل کرنے کے جرم میں؟ تم نے جس طرح اُس بیمار کو مارا ہے نا وہ اب مرنے جا رہا ہے۔ اُس کی وکھیاں اندر سے کھل گئی ہیں، گُردے ختم اور کلیجہ پھٹ گیا ہے۔ اب تو کچھ ہوش کر، ٹھنڈی ہو ذرا اور جا کر دو چار آنسو بہا لے تا کہ عزت رہ جائے۔'' یہ کہہ کر حیرت سے کھلی آنکھوں والی مُلانی کو اُس کے بیٹے نے ہلکا سا دھکا دے کر ایک طرف کر دیا۔

مُلانی چند لمحے تو بیٹے کو حیرت سے دیکھتی رہی کہ وہ کہہ کیا رہا ہے مگر جیسے ہی اُس کی بات پلے پڑی وہ چپٹ سے سینہ تان کر سامنے آ گئی کہ بکواس نہ کر... میں نے اُسے کچھ نہیں کہا ..... خود ہی کچھ کھا مر کے آیا ہے اُس ڈائن کے گھر سے۔ بیٹے نے مگر ماں کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور جا کر باپ کی سراندی کی جانب سے کھڑا ہو کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا جب کہ مُلا بخشو پہلے ہی موڑھا گھسیٹ کر بے ہوش چاچے کے دائیں جانب بیٹھ کر کسی ورد میں مصروف تھا۔ مُلانی بھی بیٹے کے پیچھے پیچھے تیز قدموں سے آئی اور وہاں کا منظر دیکھ کر چھاتی پیٹ پیٹ کر کُرلانے لگی۔ اِس کُرلاہٹ میں اگر کوئی الفاظ سمجھ میں آ رہے تھے تو وہ بددعائیں تھیں جو سنگری اور اُس کے حرام کے کتورے کے نام کی جا رہی تھیں۔

مُلا اللہ رکھا اپنے گھر والوں کی توقعات کے برعکس دو دن اور جی لیا مگر یہ دو دن جہاں

مُلا کے اپنے گھر والوں کے لیے امتحان سے کم نہیں تھے وہیں سنگری اور اُس کی ماں کے لیے بھی مسلسل عذاب کی صورت نازل رہے جس دوران اُنہیں ہر قسم کی دھمکیاں نہ صرف مُلا اللہ رکھے کی بیوی اور بیٹوں کی جانب سے موصول ہوتی رہیں بلکہ مُلا بخشو کی جانب سے پہنچائی جانے والی دھمکیاں تو اِس قسم کی تھیں کہ نہ جینا سوکھا اور نہ ہی مرنا آسان۔ سیدھا سادھا الزام تھا کہ مولوی جارُاللہ کی جائیداد ہتھانے کے بعد اِس بدکردار عورت نے مولوی اللہ رکھے کی جائیداد سے بھی حصہ لینے کا سوچا مگر لالچ میں جلدی کر بیٹھی اور نکاح کے دوسرے روز ہی اُسے سنکھیا کھلا دیا۔ اب دھمکی یہ دی جارہی تھی کہ اِسی بات کو سچ مان لے ورنہ داروغہ کو سچ منوانا اچھے سے آتا ہے۔

دو دن بعد مُلا اللہ رکھا مُکلایا تو داروغہ اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ چھوٹے زنان خانے کی ڈیوڑھی میں آن بیٹھا۔ مُلا بخشو کو اپنے چاچے کی قل کندھائی سے زیادہ اِس بات کی فکر تھی کہ سنگری کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ لہٰذا جیسے تیسے جنازے سے فارغ ہو کر پھر سے چھوٹے زنان خانے میں آن گھسا۔ اَب کے اُس نے شرم بھرم سب ایک طرف رکھ چھوڑا اور سیدھے سفانے کمرے کے ایک کونے میں دُبکی بیٹھی سنگری کے سرہاندی ہو گیا۔ سنگری نے آنکھ اُٹھا کر مُلا بخشو کی طرف دیکھا تو آنسو اُس کے گالوں پر بہہ نکلے۔ سنگری کا خیال تھا کہ اُس کا دل پسیج جائے گا مگر بھول گئی کہ ایسے لمحات میں سن رسیدہ مرد ہی کمزور پڑتے ہیں بخشو کی طرح کے سانڈ نہیں۔ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ اکڑ کر کھڑا ہو گیا اور آنکھیں گھماتا ہوا بولا ''اب بھی وقت ہے کہ دماغ کی بکلی کو میرے حق میں ٹھیک کر لے اور آرام سے چھوٹے زنان خانے میں بیٹھ کر چاچے رکھے کی عدت گزار ورنہ داروغہ تو باہر بٹھایا ہوا ہے، ایک اشارے پر چوکی لے جائے گا اور پھر ساری عدت چھت سے اُلٹا لٹکتے ہوئے گزرے گی۔'' سنگری کا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے اور اِس کمینے کا منہ نوچ لے۔ ''شکل دیکھی ہے اپنی، کیوں شکل سے بدشکل ہو کر پھٹے لگنا چاہتی ہے.... اور تیرا یہ جو کتورا ہے نا! یہ تیرے مرنے سے پہلے مارا جائے گا کسی میرے جیسے کے ہاتھوں۔'' بخشو طیش میں کچھ اِس طرح سے تھا کہ اپنے ہی ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں مسلے جا رہا تھا۔

سنگری نے منتو کو مارنے کی دھمکی سُنی تو ایک دم ہوشیار ہو کر اُٹھ بیٹھی اور جلدی جلدی

اُلٹے ہاتھوں سے گالوں پر بہنے والے آنسو پونچھنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اُس نے خوف زدہ ہو کر یا خوف زدہ نہ ہوتے ہوئے اپنے آپ میں کچھ طے کر لیا تھا۔ مُلا بخشو نے غور سے سنگری کے چہرے کو دیکھا مگر کچھ اندازہ نہ کر سکا کہ ہوا کیا ہے؟ لیکن اتنا یقین بہر حال اُسے تھا کہ کچھ ہوا ضرور ہے جس نے سنگری کے اندر دراڑ ڈال دی ہے۔ اُس نے ایک بار پھر غور سے سنگری کے چہرے کی طرف دیکھا تو اُس کا خود پر اعتماد ڈول گیا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سنگری کے اندر دراڑ آنے کی بجائے اُلٹا کچھ جُڑ گیا ہو۔'' اُس نے اپنا ہر شک ڈالنے کے لیے ایک پینترا اور بدلا۔ ''اور سُن! باہر بیٹھے ہوئے داروغہ کو بُلایا بھی میں نے ہے اور واپس بھی میں نے بھیجنا ہے۔ بس مجھے اپنی، کلی کے ٹھیک ہونے کا یقین کرا دے، صوبیدارا بھی کا ابھی گلٹی۔'' لیکن اِس بات کا سنگری پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ''دیکھ! تیرے پاس اگر کچھ نہیں تو وقت زیادہ نہیں.... شام سے پہلے پہلے میں نے طے کرنا ہے کہ چاچے رکھے کو تو نے زہر دیا ہے یا وہ خود ہی کشتہ کھا مرا ہے.... اور ہاں! پورے خاندان نے، پوری بستی نے، سب چھوٹے بڑے نے میری بات سُننی ہے میری بات ماننی ہے.... نہ تیری کسی نے سُننی ہے نہ تیری کسی نے ماننی ہے.... تو عقل کر! تُو بھی میری مان لے اور جان چھڑا۔''

سنگری کے چہرے کے ٹھہراؤ نے اُلٹا مُلا بخشو کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ وقت دراصل اُس کے پاس نہیں رہا تھا۔ اگر سنگری اپنے شوہر کو زہر دینے کے الزام میں گرفتار ہو جاتی تو معاملہ کم از کم بخشو کے ہاتھ سے نکل جانا تھا۔ کیونکہ گرفتاری کی صورت میں فیصلہ عدالت میں ہونا تھا جہاں نہ تو وہ چشم دید گواہ اور نہ ہی چاچے رکھے کا ولی وارث۔ اُس کے اپنے بیٹے بیٹیاں بہت تھے قضیہ چکانے کو۔ ''تو وہ کیا کرے؟ بچالے سنگری کو چاچے رکھے کے قتل کے الزام سے؟ ہو سکتا ہے کہ اِس احسان کے سبب عدت گزارنے کی مدت میں اُس کے دماغ کی پھرکی اُس کے حق میں گھومنا شروع کر دے اور وہ اُس کی حیثیت کو قبول کر لے.... لیکن ہے تو حرامی عورت.... عین وقت پر کچھ ایسا داؤ لگاتی ہے کہ سب کچھ اُلٹا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ عدت گزارتے گزارتے وہ کوئی اور گُل کھلا لے۔''

بخشو اگرچہ گہری سوچوں میں تھا لیکن سنگری کو اِس کا تاثر نہیں دینا چاہتا تھا۔ بہر حال یہ

پھر ایک جوا تھا جس میں بظاہر پلڑا سنگری کے ہاتھ میں آ جانا تھا کہ وہ اُسے جس جانب چاہے جھکا دے۔ لیکن اِس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں رہا تھا۔ مُلا بخشو کی حکمت عملی کی ساری ساری عمارت اُس خوف پر استوار تھی جسے سنگری نے اپنے قریب ہی نہیں پھٹکنے دیا تھا لیکن اِس صورتِ حال کے فطری ردِعمل میں خوف کی ایک مہیب دیوار اَب مُلا بخشو کے اطراف میں حائل ہو چکی تھی۔ سنگری کو دھمکاتے یا دہشت زدہ کرتے ہوئے اُس نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ اگر وہ اپنی آئی پر قائم رہی اور مُلا کے ڈراوے سے ڈرنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟

اندر وائندری ہتھیار ڈال چکے ہونے کے باوجود ایک اور چھل ایک اور فریب بخشو کے ذہن میں کُلبلانے لگا۔ ''کیوں نہ کسی حیلے بہانے چاچے اللہ رکھے کے گھر والوں کو سنگری کے سامنے مدعی بنا کر وہ خود کھل کھلا کر اُس کی حمایت میں آ جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اِس طریقے سے وہ اُس پر مہربان ہو جائے۔'' خیال تو یہ بھی بخشو کے دل کو ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا مگر مسئلہ سنگری کے اعتماد کا تھا جس کو وہ ایک بار نہیں بار بار زک پہنچا چکا تھا جس کے نتیجے میں وہ اب پوری طرح چِھڑ کی ہوئی تھی۔ ہر ایک بات پر بدک رہی تھی۔ ''ابھی فوری طور پر پینترہ بدلنے سے بہتر ہے کہ صورتِ حال کو جوں کا توں چھوڑ کر شام تک کا انتظار کر لیا جائے.... ہوسکتا ہے کہ اِس دوران کوئی اور کارگر خیال ذہن میں آ جائے جو سنگری جیسی حرافہ کو اُس کے تمام تر چلتروں سمیت باندھ کر رکھ دے۔''

اتنے میں اچانک منتو کے رونے کی آواز نے بخشو اور سنگری دونوں کو چونکا کر رکھ دیا۔ سنگری نے منتو کو اُٹھا کر اُلٹا کندھے پر ڈالا اور زور زور سے تھاپنے لگی۔ سنگری نے منتو کو تھاپتے ہوئے ایک بار پھر مُلا بخشو کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا لیکن اِس بار اُس کے دیکھنے میں نہ تو کسی قسم کی التجا تھی نہ ہی اَرداس یا صلۂ رحمی کی درخواست۔ اِس کے بجائے وہاں بے خوفی، بے رحمی اور عجیب نوعیت کی کسیلی کڑواہٹ در آئی تھی۔ مُلا بخشو بظاہر تو قائم تھا مگر اندر سے لرز کر رہ گیا۔ وہ کوشش کے باوجود سامنے سے اُس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ پا رہا تھا سو کنکھیوں سے جھانکا۔ ''یہ عورت کسی کے قابو میں آنے والی نہیں، کبھی بھی کچھ بھی کر سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ چاچے رکھے کو سولہ آنے اِسی حرامن نے مارا ہے... اِس لیے پھٹے لگے تو ٹھیک.... بچ گئی تو نجانے کتنے اور جان سے جائیں

گے۔‘‘مُلا بخشو نے واپس پلٹی کھائی اور اپنی مردانگی کی برتری باقی رکھنے کے لیے سنگری کو پھر سے سخت الفاظ اور اونچے لہجے میں کھڑکانا چاہا مگر آواز اُس کے حلق ہی سے نہ نکل سکی۔ اپنی خفت مٹانے کے لیے اِس کوشش کو اُس نے کھنکارنے میں بدل لیا اور زمین پر تھوک کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ڈیوڑھی میں داروغہ اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ خاصی بے تابی سے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے آنکھوں آنکھوں میں مُلا سے استفسار کیا تو مُلا نے بھی آنکھوں آنکھوں میں اُسے کچھ مزید انتظار کرنے کو کہا۔ سنگری کے سامنے سے ہٹتے ہی اُس کے ارادے پھر سے ڈولنے لگے تھے۔’’یار ایسی عورتیں پھانسی لگانے کے لیے نہیں ہوتیں۔‘‘ بخشو کے چہرے پر موہوم سی مسکراہٹ لپکنے لگی تھی۔ ’’کیسی عورتیں؟‘‘ سوال اب بھی داروغہ کی آنکھوں میں تھا۔’’حرامی عورتیں... جنہیں پتہ ہو کہ وہ سونی کتنی اور اُن کا مُل کیا ہے۔‘‘

داروغہ نے بخشو کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور واپس مُڑ کر ڈیوڑھی کے دروازے کے دونوں کواڑ کھول دیے۔ چھوٹے زنان خانے کے باہر بستی کے لوگ ایک ہجوم کی صورت جمع ہو چکے تھے۔ اُن کے چہروں پر پھیلا ہوا طیش صاف بتا رہا تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ مُلا بخشو اِس منظر کی توقع نہیں کر پا رہا تھا۔ اُس کا چہرہ زرد پڑا تو ہاتھ بھی کپکپانے لگے۔ کھیل اُس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ چونکہ مُلا اللہ رکھے کے گھر والوں کے مطابق سنگری ہی اُس کی قاتلہ تھی لہٰذا چھوٹے زنان خانے کے باہر بھرا ہوا ہجوم بھی سنگری کو مُلا رکھے کی قاتلہ تسلیم کر چکا تھا۔ مُلا بخشو نے داروغہ کی آنکھوں میں اِس طرح دیکھا کہ جیسے اُسے من مانی کرنے کی اجازت دے رہا ہو لیکن ایسا کہتے ہوئے بھی اُس کی آنکھیں پانی سے ڈبڈبا گئیں جو نجانے کہاں سے آنکھوں میں اُتر آیا تھا اور پھر اُترے ہی چلا جا رہا تھا۔

داروغہ نے کچھ تاخیر کیے بغیر سپاہیوں کو ہاتھ کے اشارے سے ساتھ لیا اور چھوٹے زنان خانے میں گھس گیا۔ باہر موجود لوگوں کے چہروں پر پھیلا ہوا اشتعال ایک دم کم ہو گیا تھا۔ مُلا بخشو وہیں ڈیوڑھی میں ساکت سا ہو کر رہ گیا مگر آنکھوں میں بھر جانے والا پانی ٹھہر نہ پایا اور باہر کو

چھلک پڑا۔ ہجوم نے اپنے چچا کی الم ناک موت کے غم میں مُلا بخشو کو یوں آنسو بہاتے دیکھا تو اُس کے حق میں تعریفی نعرے لگانے لگے۔ مُلا بخشو کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ وہاں ٹھہرے یا مسجد کی طرف نکل لے۔ اگر وہ ڈیوڑھی میں موجود رہتا ہے تو ابھی چند لمحوں بعد گرفتار ہو کر باہر آنے والی سنگری لوگوں کے سامنے اُس کے خلاف کچھ بھی بک سکتی ہے اور اگر وہ یہاں سے کہیں جانے کی کوشش کرتا ہے تو سامنے ہجوم ہے، جس کا رویہ کسی وقت بھی کچھ سے کچھ ہو سکتا ہے۔

وہ ابھی اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ اندر سے داروغہ بھی دونوں سپاہیوں کے ہمراہ باہر آ گیا۔ اُس کے چہرے کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی متغیر اور کبھی جوش کی تمتماہٹ۔ خلاف توقع سنگری اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ مُلا بخشو کا دل ڈولنے لگا۔ "کیا اُس نے اُسی پر تو الزام نہیں لگا دیا.... وہ حرام زادی کچھ بھی کر سکتی ہے۔" بخشو نے پریشان ہو کر داروغہ کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھیں سورج کی روشنی میں سورج سے بھی زیادہ چمک رہی تھیں۔ مُلا نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ اُس سے داروغہ کی آنکھوں دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اُسے یوں لگا کہ ابھی دونوں سپاہی اُسے پکڑ کر اُس کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے رسیوں سے باندھ کر مشتعل ہجوم کے حوالے کر دیں گے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وحشی ہوئے لوگ اُس کا بھرکس نکال دیں گے۔ اِسی اثنا میں داروغہ نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھے تو مُلا بخشو کپکپا کر رہ گیا۔ اُس نے کافی مشکل سے آنکھوں پر پڑا ہوا بوجھ اُٹھایا تو داروغہ بدستور پر جوش چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔

"سب کچھ صاف صاف بتا دیا ہے عورت نے کہ مولوی صاحب کو کس نے اور کب قتل کیا۔" مُلا بخشو کا چہرہ ایسے اُترا کہ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قتل کا یہ مقدمہ پہلی تفتیش میں اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا کہ چشم دید گواہ کو بھی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ مولوی اللہ رکھا تھا کوئی نیک روح کہ اپنا مجرم قبر میں اُترتے ہی اِس طرح پکڑوا یا کہ کسی بے گناہ کو لتر پولے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔" داروغہ کی بات ختم ہوتے ہوتے مُلا بخشو کا ماتھا پسینے سے اِس قدر شرابور ہوا کہ ٹپ ٹپ کرتے پانی نے اُس کے گال بھی تر بتر

کر دیے۔

''عورت ہے تو ویسے چلتر لیکن میرے سامنے چوں تک نہیں کی.... سب کچھ کھول کر بتا دیا کہ منگر نام کا ایک رذیل رشتے دار کس طرح اُس کے ساتھ شادی کے لیے جنونی ہوا پھرتا تھا۔ مگر جب اُس کی شادی مولوی رکھے سے ہوگئی تو اُس سے پرانی یاری دوستی نکال کر ملنے کے بہانے آیا اور شادی کی مبارکی کی آڑ میں مُلا صاحب کو کسی کُشتے کے گُھ بھی کھلا گیا لیکن جاتے جاتے مجھے بتا گیا کہ وہ اُسے کُشتے کی بجائے سنکھیا دے کر جا رہا ہے تا کہ وہ مر جائے اور اُس کا رستہ صاف ہو۔ اس کے بعد جیسے ہی وہ مویا گھر سے دفع ہوا تو مُلا صاحب کی طبیعت بھی خراب ہوگئی۔''

مُلا بخشو کا چہرہ ایک دم کھل اُٹھا ''میں نہ کہتا تھا کہ قتل اِس حرامن کے پیٹ میں ہے... مروا دیا نہ میرے چاچے کو اپنے یار سے... داروغہ صاحب! چاڑھ دو اِس کو بھی پھٹے پھانسی کے۔''

''مولوی صاحب! وہ کیسے پھٹے چڑھے گی، وہ تو چشم دید گواہ ہے.... پھانسی کے پھٹے پر تو منگر چڑھے گا.... اُس کا عاشق!''

داروغہ کی بات سُن کر مُلا بخشو کے پیر زمین پر نہ لگ رہے تھے۔ وہ حیران تھا کہ کہاں سے نکال لائی ہے اُس نامراد منگر کو۔ شاید اُس کے راستے کا آخری کانٹا بھی صاف کرانے۔ ''لیکن داروغہ صاحب! ایک بات ہے.... اگر اِس عورت کو پتا چل گیا تھا کہ چاچے کو منگر نے زہر کھلا دیا ہے تو اِس نے واویلا کیوں نہیں کیا؟... کسی حکیم کو کیوں نہیں بُلایا؟''

''وہ کہتی ہے کہ جیسے ہی میں واویلا کرنے لگی تو مولوی صاحب اُس کے منع کرنے کے باوجود بڑی بیوی کے پاس چلے گئے... تو پھر وہ کیا کرتی۔ دوسرے گھر جاتی تو وہ اِس کے ٹوٹے نہ کر دیتے۔'' داروغہ نے سنگری کا پورا بیان مُلا بخشو کو سنا دیا۔

مُلا بخشو نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا ''کہتی تو ٹھیک ہے وہ عورت.... جو بھی کہتی ہے۔''

## ۳۹

اگرچہ رات کے دونوں پہر جان برنٹن کے لیے ایک عذاب کی صورت آندھی کے ساتھ زمین پر اُترے تھے مگر اُن دونوں پہروں کو اپنے اوپر جھیلتے جھیلتے اُس کے اندر اتنی توانائی پھر سے اُگنا شروع ہو چکی تھی جس نے نہ صرف اُسے صبح ہونے سے پہلے کی کچھ گھڑیاں انتہائی گہری نیند کی آغوش میں دھکیل دیا بلکہ اگلی صبح کے لمحات لپیٹے جانے تک اُسے اِس طرح تر و تازہ کر دیا جیسے معمول سے ہٹ کر کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ویسے تو وہ کافی صبح اُٹھتے ہی لیا کرتا تھا کہ رات بھر کی کسل مندی سے چھٹکارا ہو سکے لیکن آج اُس نے چاہا کہ سب سے پہلے باتھ لیا جائے تا کہ کافی سے لبوں کا معانقہ نہائے دھوئے انداز میں ہو۔

جان برنٹن کا آج کا باتھ بھی معمول سے مختلف تھا۔ کافی عرصے کے بعد وہ کافی دیر تک نہاتا رہا۔ انڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی کی ملازمت کے دورانیے کی ساری تھکن اگرچہ ایک باتھ سے اُتارنا ممکن نہیں تھی مگر کوشش کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ سو اُس نے باتھ روم میں غسل کی غرض سے اسٹور کیے گئے پانی کا اِس طرح استعمال کیا کہ جیسے سائٹ آفس چھوڑنے سے پہلے غسل آخر میں کیا جانا چاہیے تھا۔ جان کو یاد آیا کہ اِس قسم کا غسل وہ ہر جماعت کے امتحان سے فراغت کے بعد کیا کرتا تھا۔ غسل ختم ہوا تو کافی دیر تک بدن کو تولیے سے اِس طرح صاف کرتا رہا کہ جیسے کالک زدہ برتن کو مانجھ رہا ہو۔ ایسا کرتے کرتے جب اُس کی سانس پھولنے لگی تو ایک لمحہ رُک کر

اپنے آپ ہی پر ہنس دیا۔ کیا وہ یہاں آج اپنی آخری صبح کے معمولات کو غیرارادی طور پر طول دے رہا تھا؟ اگرچہ اُس کے ذہن میں اُبھرنے والا فوری جواب نفی میں تھا لیکن اُس کے پاس اِس بات کی کوئی توجیہ نہیں تھی کہ وہ کموڈ پر کیوں کافی دیر تک بیٹھا رہا؟ اتنی دیر تک کہ اُس کی رانوں کے عقبی عضلات تھکنے کے سبب دُکھنے لگے تھے۔ وہ ایک بار پھر مسکرا دیا۔

جتنا سامان ساتھ لے جانا مطلوب تھا وہ بہ آسانی دو چرمی بیگز میں آ چکا تھا۔ اِس قسم کے ضروری کام وہ ہمیشہ بحرانی کیفیت میں اچھے سے کرنے کا عادی تھا سُو دونوں بیگ گذشتہ شب کے اُن لمحات میں ہی پیک کر لیے گئے جب اُسے کرنے کو اور کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ لہٰذا اب بھی اُسے سوائے لباس تبدیل کرنے کے اور کچھ نہیں کرنا تھا۔ چونکہ غسل کے بعد اُس کے بدن پر سوائے تولیے کے اور کوئی لباس نہیں تھا لہٰذا جان لباس تبدیل کرنے کی بجائے لباس پہننے کے عمل میں بھی معمول سے زیادہ وقت لے رہا تھا۔ ایک بار پھر اُس کے ذہن نے اِس غیرارادی رویے کی توجیہ ڈھونڈنی چاہی۔ شاید اُس مقام اور اُن اشیا سے ہمیشہ کے لیے بچھڑنے کا احساس جو ایک عرصے سے اُس کی ذات اور دن بھر کے معمولات کا جزو رہ چکی تھیں یا شاید وہ اپنے آپ کو سلو ڈاؤن کر کے ہمیشہ سے زیادہ توانائی اپنے اندر اسٹور کر کے دن بھر ہیڈ آفس والوں کے سامنے کسی مردِ بحران کی مانند زیادہ ہشاش بشاش اور زیادہ تر و تازہ دکھائی دینا چاہتا تھا۔ وہ اُن تمام لوگوں کو مایوس کرنا چاہتا تھا جو اُسے ایک مرے ہوئے ناکام و نامراد شخص کے طور پر دیکھنا چاہ رہے ہوں گے۔ شاید اِسی لیے آج اُس نے اپنی سب سے اچھی شرٹ، پتلون اور سب سے اچھے بوٹ نکالے ہوئے تھے جب کہ گولڈن کف لنکس اُسے شادی کے موقع پر مَیری نے گفٹ کیے تھے اور یہ بات یہاں سوائے اُس کے بیٹے ولیم آرتھر کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

اگرچہ جان برنٹن نے اپنی مرضی کے مطابق خود کو تیار کر لیا تھا مگر نجانے کیوں تشفی نہیں ہو رہی تھی۔ جب اُسے باہر سے کچھ بجھائی نہ دیا تو اندر سے بھوک کا احساس شدید ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اگرچہ اُس نے کل شب سے کچھ نہیں کھایا تھا مگر اب بھی اِتنی زیادہ بھوک کے ہوتے ہوئے اولیٰ طلب کافی کی تھی۔ کافی کی طلب اور بھوک کی ایک دم محسوس ہونے والی شدت نے یاد دلایا کہ

آج اُس کا سابقہ کنگ وقت زیادہ ہونے کے باوجود کہیں بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ''آج اُسے کیوں آنا چاہیے تھا؟'' ...وہ کنگ جیسے چھوٹے ملازم کی سمجھ داری، اُس کے نزدیک وفاداریوں کی ترجیحات اور اُن کی فضیلت پر مسکرادیا کہ اِس میں کچھ بھی غیر معمولی یا انہونی نہیں تھی۔

اِس دوران خیمے کے بیرون اطلاعی گھنٹی بجی۔

''اِس وقت کون ہوسکتا ہے؟ شاید کنگ ناشتہ لے کر آیا ہو.... لیکن اِس وقت اُس کا آنا امکانات میں سے نہیں تھا۔ تو کون ہوسکتا ہے!!!'' اِسی خیال کو قلا بازیاں کھلاتے جان برنٹن نے خیمے کے کوریڈور سے گزر کر باہر کے داخلی راستے کی زپ کھول دی۔ باہر اُس کا بیٹا ولیم آرتھر چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ موجود تھا۔ اُس کے عقب میں سائٹ آفس کے آفیسرز میس کا کنگ تھا جس نے ہاتھ میں ناشتے کے برتن اُٹھائے ہوئے تھے۔

حواس پر ہمیشہ سے تمام تر قابو کے باوجود جان برنٹن کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اُس کے نزدیک اِس وقت باہر ولیم آرتھر کا ہونا امکانات سے ماوراواقعہ تھا۔ جان کی حیرت زدگی سے قطع نظر ولیم اُسے بدستور ہلکی سے مسکان کے ساتھ کچھ دیر دیکھتا رہا اور پھر ناشتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''بابا! آپ کے لیے ناشتہ!''

''اُوہاں! ناشتہ.... اِس کی کیا ضرورت تھی؟'' ..... جان برنٹن نے حیرت زدہ چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کنگ کو اندر آنے کا راستہ دے دیا مگر ولیم چہرے پر اُنہی تاثرات کے ساتھ وہیں کھڑا رہا۔

''تم نہیں آؤ گے ولیم اندر!'' جان برنٹن اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کرر ہا تھا۔

ولیم کچھ کہے بغیر اندر چلا آیا جب کہ کنگ ناشتہ میز پر رکھنے کے بعد پہلے ہی واپس جا چکا تھا۔ جان برنٹن نے ایک بار پھر سے بیٹے کے چہرے پر پھیلی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ کی نوعیت کو پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اِس سے زیادہ سرد چہرہ اور اِس سے زیادہ بے ابلاغ مسکراہٹ اُس نے شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔ پھر اُسے یاد آیا کہ اِسی قسم کے چہرے اور اِسی نوعیت کی مسکراہٹ کا مشاہدہ پہلے سے بھی اُس کے حافظے میں موجود ہے۔ اُسے یوں لگا کہ ولیم کی ماں مُیری ایک بار پھر

ہر قسم کے تعلق کے خاتمے کی دستاویز نئے سرے سے لے کر اُس کے روبرو ہے۔ ''کس قدر مشابہت تھی ماں بیٹے کے چہروں پر در آنے والے مخصوص تاثرات میں جب اُن کے پاس تاثر دینے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ کس قدر سفاکیت تھی ماں بیٹے کے حُسنِ اخلاص اور حُسنِ تہذیب میں۔ جان کو یقین ہو گیا کہ ولیم کی اِس اخلاقیات کے پس منظر میں اُس کا خُبثِ باطن تھا۔ وہ جان کنی کے عذاب میں گرفتہ اپنے پہلے شکار کے تڑپنے اور پھر جاں سے گزرنے کے نظارے سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔ باپ نے بھی ایک بار پھر سوچ لیا کہ ماں کے جذبہ اُنتقام کی حدت میں پل کر جوان ہونے والے بیٹے کے سامنے اُس نے کسی طرح بھی اپنے آپ کو جان کنی کے عذاب میں گرفتہ دکھائی نہیں دینا۔ اور واقعی وہ ایسا دِکھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ تو صبح تیار ہی معمول سے ہٹ کر ہوا تھا۔ جان برنٹن مزاجاً ایسا شخص تھا کہ جو بقائے زندگی کی جہد میں ہمیشہ اور ہر بار سلامت بچ نکلتا رہا تھا۔

جان نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ناشتے کی چھوٹی ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے دائیں بازو کے کف لنکس کو اِس طرح ٹھیک کرنے کی کوشش کی کہ جیسے واقعتاً ولیم آرتھر کو دکھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ جب کہ اُس کی اپنی نگاہیں بھی اِس انداز میں ولیم کی نگاہوں کے تر چھے تعاقب میں تھیں کہ وہ کب اور کس طور اُن پر نگاہ ڈالتا ہے؟ وہی ہوا کہ ولیم نے جوں ہی خفی انداز میں جان برنٹن کے کف لنکس کی جانب نظر گھمائی، اُس نے اُسی لمحے ایک شانِ بے نیازی سے ولیم کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر بولا.... ''سونے کے ہیں، تمہاری ماں نے شادی کے موقع پر مجھے گفٹ کیے تھے۔'' مگر یہ جملہ سننے کے باوجود ولیم کا چہرہ اِس طرح جوں کا توں رہا کہ جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔ ولیم کا خیال تھا کہ یہ چالاک بوڑھا اُسے اُس کے ساتھ اپنا رشتہ یاد دلا کر جذباتی لحاظ سے مغلوب کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اِس مرحلے پر بہر صورت وہاں غالب رہنے کے لیے آیا تھا، مغلوب ہونے کے لیے نہیں۔

مگر جان برنٹن تو شاید اِن ٹوٹتے ہوئے لمحات میں خود شفقتِ پدری کے ہاتھوں مغلوب ہو کر کچھ نہ کچھ جوڑنے یا جڑے رکھنے کی فکر میں تھا۔ اُس نے اپنی کوشش رائیگاں جاتی

دیکھی تو ناشتے کی میز کی طرف جانے کے بجائے ولیم کے مقابل آ کر ٹھہر گیا اور اپنی بوڑھی آنکھوں کو اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی دھار پر رکھ لیا۔ ''ولیم! میرے پاس بہت کچھ ہے کہنے کو.... بہت کچھ ہے سُنانے کو... مگر حال کا یہ لمحہ جو نہایت تیزی سے ماضی میں منقلب ہوتا جا رہا ہے، اس کہے سُنے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا.... سُو ایک باپ اپنے بیٹے کو غالب و سُرخرو دیکھنے کی خواہش میں اِس تمام تر روداد کو آنے والے کل کے اُس لمحے کے پاس امانت چھوڑے جا رہا ہے کہ جب سب کچھ اِسی طرح ہو گا مگر میرے مقام پر... اِس جگہ یہاں.... میں نہیں ہوں گا تم ہو گے۔''

جملہ ختم ہوتے ہوتے ولیم آرتھر کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ جان برنٹن کے لبوں پر منتقل ہو چکی تھی۔ جان نے اپنے دونوں ہاتھ نہایت نرمی سے ولیم کے تنے ہوئے کندھوں پر رکھ دیے... ''اور ہاں! ناشتے کے لیے بہت بہت شکریہ....''

دونوں کچھ بولے بغیر کچھ دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ولیم کی آنکھوں میں بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ بے رحمی کی لکیریں بھی کھنچنے لگی تھیں۔ جان کے لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ بھی سمٹتی چلی گئی تو اُس نے ولیم کے کندھوں پے رکھے ہوئے ہاتھ اُٹھا لیے۔ جان کو لگا کہ یہ اُس کا اپنی اگلی نسل کے ساتھ لمس کا آخری پڑاؤ تھا۔ اِس سے پہلے کہ اُجڑے پڑاؤ کی بجھتی ہوئی آگ سے اُٹھتا ہوا کڑوا دھواں جان برنٹن کی آنکھوں کو کسیلا کرتا اُس نے سر کو جھکا لیا۔ ولیم پدری تعلق کی مغلوبیت کے اِسی لمحے کے حظ کا منتظر تھا، سو اِسے اپنے مسام مسام سے کشید کرتا ہوا خیمے سے باہر چلا گیا۔ جان برنٹن کو خیمے میں اپنے تنہا ہونے کا احساس ہوا تو اب کے وہاں اُس کا ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ دور کہیں اُسے اپنی رخصتی کا اِذن سُنائی دیا اور پھر خیمے سے باہر پاؤں دھرتے ہی اِنڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے سائٹ آفس سے اُس کا تعلق ماضی کے طاقچے میں رکھ دیا گیا۔

اگرچہ اُسے باہر کسی کے ہونے کا یقین نہیں تھا لیکن خیمے سے باہر آیا تو اُس کا وہ ملازم اُس کے لیے بگھی کا بندوبست کیے منتظر تھا جسے اُس نے کسی طیش کے لمحے میں ایک عرصہ پہلے اپنی خدمت سے علیحدہ کر کے لنگر خانے میں چپاتی بنانے جیسی اذیت ناک ڈیوٹی پر مستقلاً تعینات کر دیا تھا۔ وہ ڈیوَن نام کا ایک مقامی ادھیڑ عمر مسلم تھا۔ جان سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کس طرح اُس کی اِس

طرح موجودگی پر اپنے جذبات کا اظہار کرے جب کہ ڈیوّن کے ہاں اِس اظہار پر کوئی پس و پیش نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر نم آنکھوں سے ایک بار پھر اُس کے روبرو ہونے کا اقرار کر رہا تھا۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر خیمے میں گیا اور وہ سبھی سامان جو پیک کر کے رکھا گیا تھا، اُٹھا کر باہر لایا اور نہایت نفاست سے بگھی میں رکھ دیا۔

''صاحب! آپ جانتے ہو یہ بگھی والا میرا چھوٹا بھائی ہے.... یہ اب آپ کے حکم تک آپ کی ڈیوٹی پر ہے... مجھے اگر چھٹی ہوتی تو میں بھی ساتھ چلتا مگر میرا بھائی آپ کو میری کمی محسوس نہیں ہونے دے گا.... وہ بھی آپ کے مزاج کو جانتا ہے۔'' ڈیوّن نے ایک بار پھر تعظیم کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔ جان برنٹن نے بھرائے ہوئے لہجے میں کچھ کہنا چاہا مگر آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ اُس نے پتلون کی عقبی جیب سے والٹ نکالا اور کچھ روپے اُسے دینے چاہے مگر ڈیوّن نے اب کے ملتجی ہو کر ہاتھ جوڑ لیے... ''نہ صاحب! نہ میں اور نہ میرا بھائی... ہم ریاستی ہیں، رِیتی روایت والے لوگ ہیں... '' جان برنٹن کے گلے میں اُترا ہوا گداز اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔ وہ بھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بگھی میں بیٹھنے لگا تو ڈیوّن نے نہایت ادب سے اُس کے بوٹوں کے تلووں کے نیچے ہاتھ دھر کر اُسے بیٹھنے میں مدد دی اور بگھی آہستہ خرامی سے سائٹ آفس کے مین گیٹ کی جانب روانہ ہوگئی۔ ڈیوّن جس کی ساری جلد ایک عرصے سے لنگر کے تندور پر روٹیاں پکانے کے سبب موٹی اور کھردری ہو چکی تھی، آنکھوں میں ملائم آنسو لیے جان کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ لیکن جان کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں صرف یہ دو آنکھیں ہی نہیں تھیں کچھ اور آنکھیں بھی تھیں جو اُس کی بگھی کے گھومتے ہوئے پہیوں پر ٹکی تھیں لیکن یہ آنکھیں محسوس تو کی جا سکتی تھیں مگر انہیں دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

جان برنٹن کی بگھی مین گیٹ سے باہر نکلی تو ایک اور معاملہ ہو گیا۔ ڈیوڈ اور ایبٹ کے ہاتھوں جنسی جبر کا شکار ہونے والی وہ خانہ بدوش سانولی لڑکی چٹی چمڑے والے بچے کو اُٹھائے مین گیٹ کی آڑ میں نجانے کب سے چھپی ہوئی بیٹھی تھی۔ جوں ہی جان برنٹن کی بگھی گیٹ سے باہر نکلی اُس نے عجیب سے لہجے میں آوازیں نکال نکال کر بگھی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ لڑکی کو

بچے سمیت بگھی کے پیچھے یوں دوڑتے دیکھا تو جان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اُس کے لیے یہ سب کچھ اِس لیے بھی سراسیمگی کا باعث تھا کہ انکوائری میں جن الزامات کا دفاع کرنے میں وہ ناکام رہا تھا اُن میں سے ایک الزام اِس لڑکی سے غیر اخلاقی روابط کا بھی تھا۔اگر چہ یہ الزام جان برٹن کی شخصیت کے پیشِ نظر ظاہری طور بھی جھوٹا اور بے بنیاد لگتا تھا مگر حقیقت تو یہی تھی کہ محکمانہ طور پر ثابت شدہ تھا۔

جان برٹن نے سائیس کو بگھی روکنے کو کہا لیکن نجانے کیوں وہ اِس پر آمادہ نہ تھا جب کہ لڑکی بچے کو اُٹھائے پیچھے بھاگتی بھاگتی بے حال ہو چلی تھی اور کسی وقت بھی نڈھال ہو کر گر سکتی تھی۔ مگر جب جان نے سختی سے بگھی روکنے کو کہا تو مجبوراً اُسے ایسا کرنا ہی پڑا۔ ہانپتی دوڑتی لڑکی جوں ہی بگھی کے نزدیک آئی تو جان برٹن بھی نیچے اُتر آیا۔لیکن لڑکی جس رفتار سے دوڑتی ہوئی بگھی کے قریب آئی تھی اُتنی ہی تیزی سے بچے کو بگھی میں پھینکنے کے سے انداز میں ڈالتے ہوئے ریت کے ٹیلوں کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ جان برٹن لڑکی کی اِس حرکت پر حواس باختہ ہو گیا۔ گلو خلاصی کے واسطے اُس نے سائیس کی طرف دیکھا تو اُس کا چہرہ پہلے نوٹس بورڈ بنا ہوا تھا کہ ''دیکھا میں نہ کہتا تھا بگھی مت روکیں، جانے دیں.... اب بھگتیں۔''

جان برٹن نے پریشانی میں بچے کی طرف دیکھا جس نے ایک دم رونا شروع کر دیا تھا۔ پہلے تو اُس کا جی چاہا تھا کہ بچے کو ساتھ لے اور کسی یتیم خانے کے حوالے کرتا جائے مگر بچے کا رونا، اور چیخنا چلانا کسی طور پر بھی سنبھالا نہیں جانا تھا خاص طور پر جب معاندانہ ماحول میں وہ اپنی آجر کمپنی کے ساتھ معاملاتِ آخر نمٹانے جا رہا تھا۔اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں سائیس سے کہا کہ وہ بچے کو اُٹھائے اور اُس کی ماں کے حوالے کر کے آئے جو بھی یہیں کہیں ہو گی۔سائیس نے پس وپیش کی تو اُسے ایک بار پھر سختی سے کہنا پڑا۔سائیس نے بچہ اُٹھا تو لیا مگر جس انداز میں اُٹھا کر ٹیلوں کی طرف گیا وہ صاف بتا رہا تھا کہ اُس کا حکم بادلِ نخواستہ مانا جا رہا ہے۔اگر چہ جان برٹن سائیس سے شرمندہ تھا کہ وہ اُس کا صائب مشورہ کیوں نہ مان سکا مگر پھر بھی اُسے آواز دے کر مزید تاکید کر دی کہ بچے اُس لڑکی کو دے کر آئے، ریت میں پھینک کر نہ چلا آئے۔

سائیس واپس لوٹا تو پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ جان سمجھ گیا کہ لڑکی ضرور اُسے اپنے پیچھے بھگاتی رہی ہوگی۔ ''بچے کو ماں کو دے کر آئے ہو نا!''.... جان نے اضطراب کے مارے پوچھ تو لیا مگر بگھی والے سائیس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی خاموشی اور چہرے پر پھیلی ہوئی ناگواری واضح طور پر بتا رہی تھی کہ بچہ وہ ماں ہی کے حوالے کر آیا تھا مگر اب اِس معاملے میں مزید کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سائیس نے جان کی طرف سے چلنے کے اشارے کا انتظار کیے بغیر ہی گھوڑے کو چابک کا اشارہ کر دیا۔ گھوڑا ایک دم اُٹھا تو جان برٹن کو بھی اچھا بھلا جھٹکا لگا اور وہ گرتے گرتے بچا مگر سائیس بدستور خاموش اور نگاہیں سیدھی رکھے ہوا تھا۔ جان کی طرف دیکھ کر اب اُسے وہ مزید من مانی کی گنجائش نہیں دینا چاہتا تھا۔ اگرچہ جان دل مسوس کر کے رہ گیا مگر وہ پھر بھی سائیس اور اُس کے بھائی ڈیوِن کا شکر گزار تھا کہ جو اِس قسم کے حالات میں اُس کی مدد کو پہنچے۔ اب اُسے خود بھی احساس ہونے لگا تھا کہ سائیس کے ساتھ اُس کا رویہ درست نہیں رہا تھا۔ اُس نے ایسے میں انتہائی بری حاکمانہ روش کو اپنایا کہ جب اُس کے پاس حکم چلانے کا کوئی اختیار باقی نہیں رہا تھا۔

انڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے بہاول پور دفتر پہنچنے پر اُس نے بگھی کو اکاؤنٹس سیکشن کے سامنے بگھیوں کو ٹھہرائے جانے کی وسیع جگہ پر رکنے کو کہا کہ جہاں گھوڑوں کے پانی پینے کا بندوبست بھی موجود تھا۔ مگر وہاں رکتے ہی سائیس نے جان برٹن کا سامان بھی اُتار کر برآمدے میں رکھنا شروع کر دیا۔ جان نے حیران ہو کر سائیس کی طرف دیکھا مگر وہ بدستور ناگوار تاثرات کے ساتھ اپنے کام میں جڑا ہوا تھا۔

''مگر ڈیوِن نے تو کہا تھا کہ تم اب میرے حکم کے تحت میری ڈیوٹی پر ہو۔''

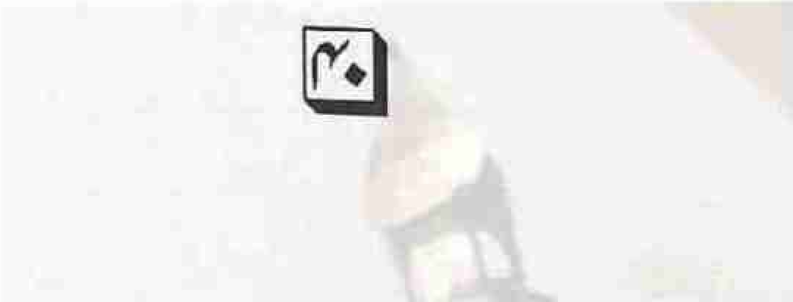
''ڈیوٹی پر تھا مگر اب نہیں''.... اُس کے ذہن میں اُبھرنے والے سوال کا جواب بھی ذہن ہی نے دے دیا۔ ''مگر کیوں؟''

''اِس لیے کہ ڈیوِن نے یہ سب بندوبست ازراہِ مروت یا ازراہِ اخلاق کیا تھا جس میں جان کی جانب سے بداخلاقی کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن بداخلاقی ہوئی اور جان ہی نے کی، اِس لیے

مروت بھی ختم اوراز راہ عاجزی و اخلاق کی گئی پیش کش بھی واپس' .... جان کو یوں لگا کہ اُس کا ذہن اِس ساری صورتحال کواپنی غلطی سمجھ کرقبول کر چکا ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر تشکر کی مسکراہٹ پھیل گئی مگر سائیس نے اِس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جان نے اُسے کچھ بخشیش دینی چاہی مگر وہ بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ سلام کرتا ہوا بگھی کو آگے بڑھا گیا۔ جان برنٹن کو اُس سے اِس قدر کبیدگی کی توقع نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے کہ بگھی والے کے ذہن میں کوئی اور پس منظر بھی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ گورے لوگوں کے حرامی بچے کو اُٹھانا اُسے بہت بُرا لگا ہو۔

اکاؤنٹس اور ایڈمنسٹریشن سیکشن سے فراغت پاتے پاتے دفتری اوقات بھی اپنے آخری لمحات تک آن پہنچے۔ بہاول پور آفس آنے سے پہلے جان بر،ٹن کے ذہن میں یوں ہی ایما سے آخری ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی جو دن بھر دفتری راہ داریوں اور ایما کے کمرے کے سامنے سے کئی بار گزرنے کے بعد اچھی خاصی شدید ہو چلی تھی۔ جان برنٹن کے نزدیک یہ ملاقات اِس لیے بھی ضروری تھی کہ بہت سی رنجشوں اور کدورتوں کے باوجود اُن کے درمیان میاں بیوی کا سماجی بندھن ابھی تک قائم تھا۔ جان برنٹن پر لازم تھا کہ انگلینڈ واپسی سے پہلے اِس قانونی تعلق کو کوئی نہ کوئی رنگ، کوئی نہ کوئی موڑ دے کر ہی جاتا۔ اِس رشتے کے ہوتے ہوئے یوں ملاقات کیے بغیر چلے جانا یقیناً سماجی تہذیب سے روگردانی ہوتی۔ لیکن روابط کی تمام تر تہذیبی پاس داری کے خیال کے باوجود ایما کا اُس کا موقف سُنے بغیر لاتعلقی اختیار کرنا جان کو اب بھی ملاقات سے گریزاں کیے جارہا تھا۔ وہ اُس کے خلاف پراسیکیوٹر بننے سے معذرت بھی کر سکتی تھی مگر اُس نے پراسیکیوٹر بن کر اُن لوگوں کو بھی شبہ کرنے کا موقع دے دیا کہ جو جان برنٹن کے کردار پر انگلی اُٹھانے کے خلاف تھے۔ شاید یہ تناؤ اور گومگو کی کیفیت کچھ دیر اور چلتی یا یہ بھی ہوتا کہ وہ ایما کو ملے بغیر ہی واپس انگلینڈ چلا جاتا، ایما کی جانب سے موصول ہونے والے ایک چھوٹے سے پیغام نے تناؤ کی ساری صورتِ حال کو بدل کر رکھ دیا۔ پیغام صرف اتنا سا تھا کہ ''جاتے ہوئے مجھے مل کر جایئے گا۔''

# ۴۰



منگر کو اُسی دن گرفتار کر کے چوکی پہنچا دیا گیا۔ موجودہ داروغہ اگرچہ حال ہی تعینات ہوا تھا مگر منگر کے خلاف بہت کچھ سُن رکھنے کے سبب پہلے ہی سے اُس کے خلاف کسی مضبوط ثبوت کی تلاش میں تھا۔ اِس لیے جوں ہی سنگری نے اُسے مولوی اللہ رکھے کے قتل کا ذمے دار قرار دیا، منگر کو گرفتار کر کے اُس پر جی بھر لتر پھیرنا مشکل نہ رہا۔ داروغہ کا خیال تھا کہ بستی آدم واہن میں گذشتہ برس سے اب تک ہونے والی فتنہ وفتور کی سبھی بڑی وارداتوں میں منگر کا کسی نہ کسی طور ملوث ہونا یقینی تھا۔ داروغہ کے نزدیک منگر چونکہ انتہائی عیار اور چالاک مجرم تھا اِس لیے اب تک پکڑائی نہیں دے رہا تھا بلکہ کوشش میں رہتا کہ اُس کا شمار نیک اور پاک باز لوگوں میں کیا جائے لیکن منگر کے بارے میں اپنی قائم کردہ رائے کا داروغہ کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔

منگر آج بھی لاکھ چیخا چلایا، منتیں کی، اپنی بے گناہی کا واویلا کیا مگر داروغہ کسی طور نہ مانا اور چوکی لے جا کر چھت سے اُلٹا لٹکا دیا۔ ماں کے گزر جانے کے بعد ولی وارث تو اُس کا کوئی تھا نہیں لہٰذا سنگری کی چشم دید گواہی کے بعد اگر بستی کے کسی خدا ترس نے خدا واسطے کی ہمدردی میں آگے آنا بھی تھا تو وہ وہیں کا وہیں رہ گیا کہ کون بستی کے سب سے بااثر مولوی خاندان کی مخالفت مول لے۔ منگر پر اقبالِ جرم یا اقرارِ جرم کے لیے جتنا تشدد بڑھتا گیا اُس کی طرف بھی مزاحمت اُتنی شدید ہوتی چلی گئی۔ منگر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سنگری اُس کے خلاف اِس قسم کی جھوٹی گواہی

دے سکتی ہے۔ تبھی تو اُس کا بار بار تقاضا ایک ہی تھا کہ سنگری اُس کے روبرو اپنا بیان دہرائے تو بات بنے۔ مگر منگر کے مطالبے کا قبول کیا جانا اِس واسطے بھی ممکنات میں سے نہ تھا کہ بستی کے مولوی خاندان کی زنانی کو کیسے ایک اوباش کے سامنے جھوٹ سچ کے لیے لا کھڑا کیا جائے بھلے سے وہ اُس کا دور پار کا رشتہ دار ہی کیوں نہ رہا ہو۔ منگر کے مسلسل انکار نے داروغہ کو وحشی بنا دیا۔ کون سا تشدد تھا جو اُس پر روا نہ رکھا گیا۔ مارنے والے مار مار کر تھک جاتے مگر منگر کی زبان سے اقرار کا لفظ ادا ہونا اُن کے لیے ایک خواب بن کر رہ گیا۔ چند ہی دنوں میں منگر کا پورا جسم پیپ سے بھرا ہوا ایک پھوڑا بن کر رہ گیا۔ جسم کی کون سی ہڈی سلامت تھی یا ٹوٹ چکی، کون سا عضو باقی یا کچلا جا چکا، اِس کا اندازہ لگانا خود منگر کے واسطے بھی ممکن نہ رہا۔ پاؤں کے تلووں پر اتنا تشدد کیا گیا کہ ایڑیوں کی کھال بھی پھٹ گئی۔ پنڈلیوں اور رانوں کے عضلات پر اِس طرح سے ڈانگ پھیری گئی کہ وہ کھال کے اندر ہی پھٹ پھٹا کر کچومر بن گئے مگر صوبیدار کا دل پھر بھی نہیں بھر رہا تھا۔ وہ کیسے کہہ دیتا کہ مقتول مولوی کی چشم دید بیوی نے جھوٹی گواہی دی ہے؟

اُنہی دنوں ایک اور انہونی یہ ہوئی کہ ملتان کے ریذیڈنٹ مجسٹریٹ نے بستی آدم واہن کی چوکی پر چھاپہ مارا۔ داروغہ کی طرف سے روا رکھی جانے والی دیگر بے ضابطگیوں کے علاوہ وہاں سے منگر کا انتہا کی حد تک تشدد زدہ جسم بھی برآمد ہوا کہ جسے نہ تو زندوں میں شمار کیا جا سکتا تھا اور نہ مرے ہوؤں میں۔ ریذیڈنٹ مجسٹریٹ نے فوری طور پر منگر کو جہاں علاج کے لیے ڈسپنسری بھجوانے کا حکم صادر کیا وہاں داروغہ کے تبادلے، معطلی اور اُس کے خلاف انکوائری کی سفارشات بھی بھجوا دیں جن پر بلا تاخیر عمل درآمد کر دیا گیا۔

کئی دنوں کے علاج کے بعد منگر کا اُٹھ کر بیٹھنا تو سہل ہوا مگر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پھر بھی ممکن نہ ہو سکا۔ ٹانگوں اور بازوؤں کے کچلے ہوئے عضلات کو پھر سے حرکت کے قابل ہونے میں ایک عرصہ درکار تھا۔ پھٹی ہوئی ایڑیوں کی جلد بھی ابھی جڑنی تھی، بے حس ہو چکے اعصاب میں احساس جگانا تھا اور کچلی ہوئی روح نے بھی ابھی زندگی کی طرف کروٹ لینا تھی۔ بہت کچھ ابھی باقی تھا۔ مقامی طبیب کا خیال تھا کہ اُسے بہتر علاج کے واسطے ملتان بھجوا دیا جائے۔ جیسے ہی منگر کو ملتان

بھجوانے کی منظوری آئی تو نئے داروغہ نے ایک اور کام کیا۔ اُس نے سنگری کے موجودہ خاندانی مرتبے کا خیال کیے بغیر اُسے منگر کا سامنا کرانے کے واسطے ڈسپنسری بُلا بھیجا۔ سنگری نے مولوی بخشو کے ذریعے پہلے تو خاصا لیت ولعل کیا مگر جب داروغہ کے سامنے ایک نہ چلی تو طوعاً و کرہاً ڈسپنسری جانا ہی پڑا۔ مولوی بخشو نے چاروں اطراف پردہ لپیٹا ہوا تانگہ منگوا کر اُس میں سنگری، اُس کے بیٹے اور اُس کی ماں ملوکاں کو روانہ کرنا چاہا مگر نجانے پھر کیا سوچ کر خود بھی اِسی چھوٹے سے قافلے کا حصہ بن گیا۔

ڈسپنسری میں صرف سنگری اور مُلا بخشو کو منگر کے روبرو کیا گیا۔ سنگری کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اُس کے بیان کی بنیاد پر منگر کے ساتھ اِس قسم کا سلوک کیا جائے گا۔ ایک کڑیل جوان کی جگہ ٹوٹے پھوٹے اور کچلے رگیدے ہوئے مرونڈے کو دیکھ کر اُس کا دل بھر آیا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگی کہ محض اُس کی وجہ سے ایک ایسا بے قصور شخص بدترین عذاب سے گزر رہا ہے جو برے وقت میں ہمیشہ اُس کے کام آتا رہا ہے۔ سنگری کو اپنے سامنے دیکھ کر منگر کی دونوں آنکھوں کے کناروں سے پانی بہہ نکلا۔ منگر کو یوں آنسو بہاتا دیکھ کر سنگری کا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے مگر کمرے میں موجود داروغہ اور مولوی بخشو کے سامنے وہ کچھ بھی نہ کر پائی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں تو پھانسی کا پھندہ منگر کی بجائے اُس کی گردن میں ڈالا جائے گا۔ گھبراہٹ سے سنگری کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ مولوی بخشو جو کمرے میں آتے ہی منگر کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں شاداں ہو رہا تھا، سنگری کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

داروغہ نے منگر کو مخاطب کر کے پوچھا کہ کیا کمرے میں موجود عورت ہی سنگری ہے جس کی زبانی وہ اپنے اوپر لگایا گیا الزام سُننا چاہتا ہے۔ منگر کی جانب سے اثبات میں گردن ہلائے جانے کے بعد داروغہ نے سنگری کی طرف دیکھا۔ سنگری نے کچھ کہے بغیر گردن جھکا لی۔ داروغہ نے مولوی کی طرف دیکھا۔ ''کیوں مولوی صاحب؟''

مولوی بخشو نے کھنکورا مار کر گلا صاف کرتے ہوئے سنگری کی جانب دیکھا جو خود بھی

اب اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''بتاؤ نا!.... جو بھی سچ ہے داروغہ صاحب کو بتاؤ۔'' سنگری نے ایک بار نظر بھر کر منگر کی طرف دیکھا... لمبی سانس لی اور پھر ایک ہی سانس میں وہی بیان دُہرا ڈالا جو اِس سے پہلے سابقہ داروغہ کو دے چکی تھی۔ اُس کی نگاہ میں منگر ہی مولوی اللہ رکھے کے قتل کا ذمے دار تھا جس کی وہ چشم دید گواہ تھی۔ سنگری کو بیان دیتے ہوئے منگر اگرچہ چُپ چاپ دیکھتا رہا اور زبان سے کچھ نہیں بولا مگر اُس کے چہرے کے بدلتے رنگ وہ سب کچھ بیان کیے جا رہے تھے کہ جو اُسے زبان سے کہنا چاہیے تھا۔ بیان ختم ہونے پر سنگری نے ایک بار پھر گردن جھکا لی لیکن منگر کی نگاہیں اب بھی اُس پر مرکوز تھیں کہ جن کے گوشوں سے اشک تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

داروغہ نے سنگری کے پہلے سے قلم بند شدہ بیان کو دیکھا اور پھر آج کے بیان کو، دونوں میں زیر زبر تک کا فرق نہیں تھا۔ داروغہ نے منگر کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے، انگوٹھا لگانے کے سے انداز میں اپنا بایاں بازو آگے بڑھا دیا۔ صوبیدار نے اُس کے برف کی طرح ٹھنڈے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر سیاہی میں بھگوئی ہوئی کپڑے کی تھگڑی سی ملی اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سرکاری کاغذات پر تین جگہ لگوا لیا۔ چند لمحوں کے بعد پوری بستی میں بات پھیل چکی تھی کہ منگر نے مولوی اللہ رکھے کے قتل کا پولیس کے روبرو اقبال کر لیا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ اتنے دن تک داروغہ کے ہاتھوں اپنی مُنجّ کٹوانے کے بعد بُھرتا ہو چکی شکل میں اقبال جرم ہی کرنا تھا تو پہلے انکار کیوں کرتا رہا۔ لیکن منگر کس کس کو جا کر سمجھاتا کہ چَم، ماس اور ہڈی کے زخم بندے کو اذیت کے اُس مقام پر لے جا کر نہیں مارتے کہ جہاں دِل اور روح کے پُھٹ لے جا کر تیلا تیلا کر دیتے ہیں۔

واپسی کے سفر میں سنگری اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے مسلسل آنسو بہاتی رہی۔ پھر سے اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ چیخے، چلائے اور دھاڑیں مار مار کر روئے مگر مولوی بخشو کی موجودگی میں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ بیٹی کو روتا دیکھ کر ملوکاں کے لیے بھی آنسو روک پانا مشکل ہو رہا تھا لیکن یہ آنسو وہ سنگری کی تقدیر پر بہانا چاہ رہی تھی۔ اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اُس کی بیٹی یوں اُنواسی ہو

کر ٹکے ٹکے کے لوگوں کے ہاتھوں خوار ہوتے ہوئے کسی بے گناہ کی موت کا باعث ہو۔ نجانے کون سا عدم توازن اُن کے ہاں در آیا تھا جس نے اُن کی صورت ہی نہیں بدلی بلکہ رویے، مزاج اور سماجی سچائی کے ساتھ جینے کے قرینے بھی بدل ڈالے۔ مسلسل جھوٹ کے پاتال میں گرتے ہوئے ذلت کی یہ کون سی منزل تھی کہ جہاں سچ بولنا اُن کے لیے ممکنات میں بھی نہ رہا۔

پردے دار تانگہ واپس چھوٹے زنان خانے کے سامنے رُکا تو وہاں پہلے سے موجود سُن گُن کی جستجو کرتے بستی کے لوگ احتراماً اِدھر اُدھر ہو گئے۔ مولوی بخشو تانگے سے یوں اُترا کہ جیسے منگر کو اپنے ہاتھوں پھانسی چڑھا کر آرہا ہو۔ بہت خوش بہت مسرور۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اُس کے راستے کی تمام رُکاوٹیں ایک ایک کر کے دور ہو چکی ہیں۔ اُس کے نزدیک سنگری بھی اِن حالات میں کہ جب تک اُس کے تئیں، اُس کا اور اُس کے بیٹے کا مستقبل غیر محفوظ تھا، کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتی تھی جو مُلا بخشو کی برگشتگی کا باعث ہو۔ زنان خانے میں داخل ہو کر مُلا فاتحانہ انداز میں مسکرایا تو سنگری کے پاس بھی مسکراہٹوں کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ کہیں سے بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ چند لمحے پہلے وہ جذباتی طور پر کن مراحل سے گزر چکی ہے۔

## ۴۱

جان برنٹن کو یوں لگا کہ ایما نے ایک بار پھر اُس کے پندار کا بھرم رکھ کر اُسے درست سمت میں دیکھنے کا موقع دیا ہے۔ وہ بلا وجہ بے اندازہ مسرور ہو رہا تھا اِس قدر کہ کمپنی کی ملازمت سے ڈِسمِس ہو کر فراغت پانے کے دن کا بھاری پن بھی طبیعت کو مکدر نہیں کر پا رہا تھا۔ ''کیا ہوتی ہے یہ عورت ذات! جب نامہربان ہو تو ایک عالم کو بے سمت کر دے اور اگر مائل بہ کرم ہو تو راہرو بھی خود اور منزل بھی آپ۔ مرد کی پوری کیمسٹری اُس کے مزاج اور موڈ کے گرد گھومتی اور طواف کرتی رہتی ہے۔'' جان برنٹن اپنے مسکراتے ہوئے اندر کے ساتھ نجانے کب ایما کے آفس کے دروازے پر جا پہنچا۔ ابھی وہ اپنے وہاں موجود ہونے کے احساس کو مجتمع ہی کر پا رہا تھا کہ کسی نے اندر ہی سے دروازے کے دونوں پٹ آہستگی سے کھول دیے۔ وہ ایما تھی۔ شاید اُس نے کواڑوں کے درمیان میں لگے ہوئے رنگین دھندلے شیشوں سے باہر کسی کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح باوقار لگ رہی تھی مگر چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے ملائم سنجیدگی تھی، پراسیکیوشن کے دنوں والی سختی نہیں تھی۔ لیکن اِدھر جان برنٹن نہ مسکرانے کی تمام تر کوششوں کے باوجود مسلسل مسکرائے چلا جا رہا تھا۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ آئیں گے.....''

''اور میرے لیے تمہیں ملے بغیر جانا بہت مشکل فیصلہ تھا.....'' جان خود ہی ایما کی میز کے سامنے رکھی وزیٹرز کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

''میں پانی پینا چاہوں گا.... '' جان کی بات سُن کر ایما جو ابھی کرسی پر بیٹھنے ہی لگی تھی، وہیں رُک گئی۔

''میرا خیال ہے ہمیں گھر چلنا چاہیے۔'' وہ اب پہلے کی نسبت کچھ زیادہ مطمئن لگ رہی تھی۔ جان بھی کچھ کہے بغیر کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میر کچھ سامان باہر برآمدے میں رکھا ہے....''

''میں اُدھر گھر پر منگوا لیتی ہوں۔'' ایما نے دستی گھنٹی بجا کر پیون کو بلایا اور اُسے سامان کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر کمرے سے باہر آ گئی جہاں جان برنٹن پہلے سے آ کر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دونوں آپس میں مزید کچھ بات کیے بغیر چلتے ہوئے رہائشی علاقے میں داخل ہو گئے جہاں کا پہلا بنگلہ بدستور ایما کے پاس تھا۔ پھاٹک نما چوبی گیٹ سے گزرتے ہی جان نے محسوس کیا کہ گھر کے تعمیر شدہ حصے تک کے اس وسیع قطعے پر کبھی نفاست سے ترشی ہوئی ہریالی اور انواع قسم کے پھولوں کی کیاریاں آج اُجڑی اُجڑی سی لگ رہی تھیں کہ جیسے گھر والوں کی عدم توجہی کا شکار ہوں۔ جان نے چاہا کہ کچھ بات کرے مگر پھر احساس ہوا کہ ایما نسبتاً تیز قدم اُٹھانے کے سبب کافی آگے جا چکی تھی لہٰذا سوائے خاموش رہنے کے اُس کے پاس اور کوئی اظہاریہ نہیں تھا۔ جان برنٹن کے برآمدے میں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ایما گھر کے اندر جانے کی بجائے بڑے دروازے کے بیچوں بیچ اُس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ یہاں سے وہ ایک ساتھ گھر کے اندر داخل ہوئے تو جان کا خیال تھا کہ وہ پھر اُسے اُس خوب صورت لابی میں بٹھائے گی کہ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے درمیان واقع تھی لیکن اب کے اُسے ایما نے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کو کہا اور خود اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں گوون سمیت ایک نیا مردانہ بیڈ روم ڈریس تھا۔ جان برنٹن نے خوش گوار حیرت سے ایما کی طرف دیکھا مگر اُس کے چہرے پر ایک خاموش متانت کے سوا کہیں کچھ بھی نہیں تھا۔ جان ابھی خود کچھ کہنے کو تھا کہ ایما نے اُس کے لیے ڈرائنگ روم ہی میں کھلنے والا ایک دروازہ کھول دیا جو شاید مہمانوں کے بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔

''آپ فریش ہولیں۔'' اب کے ایمانے گیسٹ بیڈ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ جان دل مسوس کر رہ گیا۔ اپنائیت میں اجنبیت کی ملاوٹ اُسے کچھ عجیب سی لگ رہی تھی مگر پھر بھی آنے والے لمحات کو خوش گوار رکھنے کے واسطے مسکرا کر بولا ''پانی نہیں ملے گا کیا؟''

''آپ ایزی ہو جائیں میں پانی لاتی ہوں۔'' ایما کے چہرے کی متانت میں تھوڑی تھوڑی مسکان گھلنا شروع ہو چکی تھی۔ جان کو بھی گماں ہونے لگا تھا کہ ایما پھر سے مائل بہ کرم ہونا شروع ہو چکی ہے۔ وہ اچھے لمحات کی امید میں بیڈروم ڈریس اُٹھا کر باتھ روم میں چلا گیا۔ جان حیران تھا کہ قسمت انسان پر کس طرح نامہربان لمحات میں بھی کسی دوسری شکل میں مہربانیاں سمیٹے چلی آتی ہے۔ آج دوپہر تک وہ ایما سے ملاقات کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ انڈس اسٹیٹ کمپنی کی ملازمت سے یوں ذلت آمیز فراغت نے اگرچہ اُس کے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا مگر ایما کی جانب سے پہلے ملنے کی خواہش اور پھر یوں گھر پر مُلاقات کی دعوت کے بعد اُس کے اندر سب کچھ خود بخود جڑنے لگا تھا۔

صبح سے پہنا ہوا لباس اگرچہ جان برنٹن کا پسندیدہ ترین لباس تھا جو اُس نے ناگوار ترین موقع پر پہننا اِس لیے پسند کیا تھا کیا تھا کہ اپنے آپ کو جذباتی طور پر مجتمع ظاہر کر سکے مگر اِس لمحے اُس لباس کو اتار کر ایما کا دیا ہوا بیڈروم ڈریس پہننے کا احساس اُس سے کہیں زیادہ خوش گوار تھا۔ یوں لگا کی جیسے ایک عرصے سے اُس کے سر پر سوار ہر قسم کی بدقسمتی کا بوجھ بھی اُتر چکا ہے۔ بیڈروم سے وہ ڈرائنگ روم میں آیا تو ایما بھی وہاں پہلے سے آ کر دن ڈھلے کے لوازمات میز پر سجا چکی تھی۔ لیکن میز پر رکھی شیواز کی بوتل، سگار اور روسٹڈ ڈرائی فروٹ پر اُس کی نگاہ ٹکنے کے بجائے ایما پر جا کر رُکی جس نے ڈھلتی سہہ پہر کی مناسبت سے گلابی رنگ کا ہلکا پھلکا سا شیفون کا لباس پہن لیا تھا۔ جان جن نگاہوں سے ایما کی طرف دیکھ رہا تھا ایسے میں اُس کی جانب سے سوال تو بنتا تھا کہ کیا دیکھ رہے ہو؟ مگر اُس نے جان کے یوں دیکھنے کا نوٹس ہی نہ لیا جس میں ستائش، ندیدگی اور محرومی برابر ملے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے شیواز کے پیگ بنانے میں لگی رہی۔ جان خود ہی کوئی سلسلہ کلام نہ پا کر میز کے گرد رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اتنا جلدی؟ تمہیں جلدی ہے کیا!''

''نہیں تو.... میں نے تو پوری شام بلکہ رات آپ کے لیے رکھی ہوئی ہے۔'' ایما نے بات کرتے ہوئے پانی کا ادھ بھرا گلاس اُس کے سامنے سرکا دیا۔

''ایسے میں پانی کون پیے گا!'' جان برنٹن نے چہرے پر چسپاں ہوئی مستقل مسکراہٹ کے ساتھ پانی کا گلاس واپس سرکاتے ہوئے اپنے سامنے رکھا شیواز کا پیگ اُٹھالیا۔ اُس کے انداز میں اگرچہ غیر معمولی بے تابی تھی مگر وہ ایما کے پیگ اُٹھانے کے انتظار میں اپنا گھونٹ نہیں لے پا رہا تھا۔ ایما نے اپنا پیگ اُٹھانے میں قصداً کچھ تاخیر کی لیکن غیر محسوس انداز میں۔ لیکن پہلا گھونٹ حلق میں اُترتے ہی وہ اس قابل ضرور ہو گیا کہ سہ پہر کے بعد سے اب تک ایما کے مجموعی رویے کا تجزیہ کر سکے۔ جان کا خیال تھا کہ خانہ بدوش لڑکی والے معاملے پر ایما نے اب تک اُسے معاف نہیں کیا اور شاید کبھی معاف نہ کرے۔ ''تو پھر آج کے التفات کا سبب؟''

چند گھونٹ اور اندر اُترے تو جان برنٹن کچھ زیادہ ہی تجزیاتی ہو گیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ دل کھول کر ایما سے مکالمہ کرے، اُسے کہے کہ اُس کا خانہ بدوش لڑکی سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو محض کمپنی کے مہم جو سازشیوں کی سازش کا شکار ہوا ہے مگر ایما کی مسلسل خاموشی اُسے کلام نہیں کرنے دے رہی تھی۔ بار بار اُس کے ذہن میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا کہ اگر آج کی شام بھی آپس میں کچھ بات کیے گزار دینی ہے تو پھر اِس التفات کا سبب؟ اِس التفات کا سبب؟ اِس التفات کا سبب؟؟؟

''شاید اُسے میری تنہائی اور دربدری پر ترس آ گیا ہو۔'' جان کا پہلا پیگ ختم ہو چکا تھا۔ ایما اُس کی طرف دھیان نہ رکھتے ہوئے بھی اُس کے دھیان میں تھی لہٰذا گلاس جان کے ہاتھ سے لینا چاہا لیکن جان برنٹن نے گلاس میز پر رکھنے یا ایما کو دینے کی بجائے شیواز کی بوتل اُٹھائی اور خود ہی پیگ بنانے لگا۔ ایما نے جان کو کافی دیر کے بعد پہلی بار طنازنظروں سے دیکھا اور مسکرا دی۔ جان کے ہاتھوں میں پیگ لرز کر رہ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اُسے آج بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایما چاہتی کیا ہے؟ اِس کا حل اُسے شراب کے ایک لمبے گھونٹ میں نظر آیا سو جان نے جرأت پا کر مکالمے کی طرح ڈالنی چاہی۔

''مجھ پر ترس کھا رہی ہو؟''

ایما نے حیرت اور افسوس سے بھری دونوں آنکھیں اُس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آج کی شام کے اِن لمحات میں جان اِس قسم کی گفتگو بھی کر سکتا ہے۔

''اور میں کیا سمجھوں.... ایک تنہا اور بوڑھا شخص جسے اُس کی عمر کے آخری حصے میں ہر طرف سے دھتکار دیا گیا ہو اگر اِس قسم کے التفات کے لائق ٹھہرے تو اور کیا سمجھا جائے؟''

ایما بدستور خاموش رہی۔ جان برنٹن کے برعکس وہ اپنا پیگ اُٹھائے کھڑکی کے قریب کھڑی ہو کر باہر کا منظر دیکھنے لگی جہاں سورج تقریباً غروب ہو چلا تھا۔ جان نے بھی اُس کی پروا کیے بغیر دیکھتے ہی دیکھتے چار پیگ چڑھا ڈالے اور پھر سگار سلگانے کی کوشش میں ماچس باکس ڈھونڈنے لگا۔ ایما نے اُسے ماچس ڈھونڈتے دیکھا تو آہستہ خرامی سے کچن کی طرف گئی اور واپسی پر دیا سلائی جلا کر سگار سلگانے میں جان کی مدد کرنا چاہی مگر اُس نے ماچس اپنے ہاتھ میں لے کر سگار کا کونہ دانتوں میں دبا کر اُسے سلگانے کے لیے ہموار کرنے لگا۔

ایما پھر سے جان کے سامنے کرسی پر بیٹھ چکی تھی اور وہ بھی سگار سلگا چکا تھا۔

''کیا تم اپنے آپ کو ایسا سمجھتے ہو جس پر ترس کھایا جائے یا کھایا جا سکے؟ اپنی اُٹھان دیکھی ہے کبھی؟ ایسے ہوتے ہیں تنہا اور بوڑھے شخص؟'' ایما کی آنکھوں میں طنازی ایک بار پھر کیا رقصاں ہوئی کہ وہ آپ سے تم پر آ گئی۔ اُس نے بھی نیا پیگ بناتے ہوئے اپنے لیے سگار سلگایا اور جان برنٹن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو... لیڈی کلر؟ یہ جو تمہاری شخصیت میں تمکنت ہے نا.... میری جیسی عورتوں کو گھائل کر دیتی ہے... تمہارے عورتوں کی طرف دیکھنے اور اُنہیں برتنے میں اریوگینس اور ٹوٹ کر بھی نہ ٹوٹنے جیسی اداکاری اپوزٹ جینڈر کو توڑ کر رکھ دیتی ہے.... تمہیں بتاؤں یہ جو تمہاری آنکھوں، چہرے اور شخصیت میں اکڑ ہے نا... یہی تمہاری طاقت اور یہی تمہاری کمزوری ہے.... جو بھی عورت جتنا تمہارے قریب آتی ہے اُتنا ہی وہ انسکیور ہوتی چلی جاتی ہے.... ہر دم خدشات، ہر وقت کا خوف کہ کوئی اور تمہیں نہ لے اُڑے یا تم کسی اور کے پیچھے نہ چل پڑو۔ بہت بدقسمت ہو تم جان، بہت ہی بدقسمت.... دنیا کی

کوئی عورت اپنی تمام تر خواہش کے باوجود تمہارے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ بالکل بھی نہیں۔''
آخری لفظوں تک پہنچتے پہنچتے ایما کی عشوہ طراز آنکھوں میں طنازی کی جگہ پانی تیرنے لگا تھا۔

جان برنٹن حیران تھا کہ اِسے کیا سمجھے؟ پہلی بار کسی عورت نے اُس کے صنفِ مخالف سے تعامل کی نوعیت اور اُس سے جڑی ناکامیوں کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیے تھے۔ اُسے شدت سے مَیری یاد آئی۔ اُس کی اولین محبت جسے وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کی بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ وہ جسے ایما ایروگینس اور اکڑ کا نام دے رہی تھی وہ تو ہرگز ویسا نہیں تھا۔ وہ تو اپنے تئیں بہت ہی زیادہ عاجز اور درویش منش شخص تھا تو پھر یہ تضاد کیسا اور کیوں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ عورت اور اُس جڑی ہوئی تمام محبتوں اور لذتوں کو اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے مقابل ثانوی حیثیت دینے کے سبب متکبر سمجھ لیا جاتا ہو۔ اتنا تو بہر حال رہا ہے کہ اُس نے عمر بھر عورت کو محض خانہ پوری یا فِل اِن بلینک قسم کی چیز سمجھا جو وقت اپنی پیشہ ورانہ زندگی سے بچ رہا وہاں اُس نے عورت کو فِل (fill) کرنے کی کوشش کی، کبھی اُس سے محبت نہیں کی۔

''لیکن میں نے تو محبت کی اور بے تحاشا کی مَیری سے، لیکن اُس نے مجھے چھوڑ دیا۔''
پھر خیال آیا کہ ''اُس نے کہاں چھوڑا مجھے.... میرے پاس ہی اُس کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا تھا ... شادی کے بعد کے دنوں میں بھی وہ کئی کئی راتیں اکیلے گزارا کرتی مگر مجھ پر تو جنون طاری رہا زندگی بھر کہ میرا پروفیشن ہی میری پہلی ترجیح رہے۔ پہلے پہل ڈھکے چھپے احتجاج کے بعد اُس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا.... وہ خود کو اِن سیکیور سمجھنے لگی.... اُس کا بھی خیال تھا کہ میں کسی اور عورت کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔''

جان برنٹن نے اپنی سوچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایما کی طرف دیکھا۔ وہ گردن کرسی پر ٹکائے اِس طرح سگار پی رہی تھی کہ آنسو اُس کی گالوں پر بہتے ہوئے کہیں نیچے گر رہے تھے۔ جان کا بے اختیار جی چاہا کہ اُٹھ کر ایما کی آنکھوں اور لبوں کو نمی کے اِس وفور سے محروم کر دے مگر حدت کی شدت کے اِس لمحے میں بھی نجانے کہاں سے اَنا اُتری اور اُس کے ارادوں کے آڑے آ گئی۔ وہسکی کے ایک بڑے سے گھونٹ اور سگار کے طویل کش کی کڑواہٹ نے اُس کے

ارادوں کو مزید ڈھیر کر دیا۔

جان برنٹن کی اب تک کی زندگی میں اُس کا جنسِ مخالف سے تعامل صرف دو عورتوں مَیری اور ایما تک ہی محدود چلا آ رہا تھا۔ اِس دوران نجانے اُس کو کتنے مواقع ملے اور کتنے اُس نے کھو دیے کہ زندگی میں اُس کی پہلی ترجیح اپنا پیشہ ورانہ کیریئر رہا، عورت نہیں۔ لیکن حیرت تھی کہ اِس ترجیح کو جان کی طبع میں مضمر تکبر گردانا گیا۔ آج اُسے احساس ہوا کہ عورت سے محبت نام کی کوئی چیز اُس کے اندر تھی تو وہ صرف مَیری کی حد تک ہی رہی اور اُسی پر ختم ہو گئی جب کہ ایما سے ہونے والی جذباتی وابستگی کہیں سے بھی محبت نہیں کہی جا سکتی تھی۔ جس ربط کو آج ایما نے فِل اِن بلینکس کا نام دیا، ایسا تعلق اگر کہیں تھا تو وہ بھی صرف ایما کی حد تک.... کیونکہ جان کی زندگی میں پیدا ہو چکے بہت سے خلا ایسے تھے کہ جنہیں اچھے سے پُر کرنا اُسی کو زیبا ٹھہر چکا تھا۔ لیکن کیا کیجیے کہ یہ تعلق بھی اب ایک ایسے معاشقے کی بھینٹ چڑھ چکا جس میں جان برنٹن کا ملوث ہونا شاید مفروضہ حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ جان اکثر حیران ہوتا کہ ایما جیسی ذہین اور معاملہ فہم عورت اِس قدر تشکیک پرست کیسے ہو سکتی ہے کہ ایک اَن پڑھ اور میلی کچیلی خانہ بدوش لڑکی کی محض موجودگی کو اتنا بڑا سکینڈل مان کر اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لے؟ جان نے سُن رکھا تھا کہ عورت جب کسی مرد سے تعلق ختم کرنے اور جان چھڑانے کا طے کر لیتی ہے تو اُس پر سب سے پہلا وار بے سبب الزامات کی بوچھاڑ کا کرتی ہے۔ اِس قسم کے طومار باندھنے سے جب وہ اخلاقی اور اعصابی طور پر ادھ موا ہو جاتا ہے تو اُس کی رہی سہی زندگی کو جذباتی کچوکوں سے اِس طرح پٹخنیاں دیتی ہے کہ ترکِ تعلق اور علیحدگی کی ذمے داری بھی اُسی مرد پر آتی ہے عورت پر نہیں۔

''تو کیا ایما مجھ سے ترکِ تعلق طے کر چکی ہے؟ لگتا تو نہیں.... اگر ایسا ہوتا تو پھر آج کی یہ تجدیدِ تعلقات کس زمرے میں؟ فرض کریں کہ اُس نے مجھ سے گلوخلاصی طے کر بھی لی تو کیا یہ بھی میرے خلاف کسی سازش کا حصہ ہے؟ کیا مجھ سے شادی کرنا بھی کوئی سازش تھی؟ ہرگز نہیں!! میرے خلاف سازش تو شادی کیے بغیر بھی کی جا سکتی تھی؟ اِس کا مقصد میرے بیٹے ولیم آرتھر کو مجھ سے بدظن کر کے تنہا کرنا بھی تو ہو سکتا ہے۔ تو کیا ایما بھی میرے دشمن انجینئر ولیم جین سینٹ گالوے

کے گینگ کا حصہ ہے؟''.... جان کی نگاہیں کرسی پر نیم دراز ایما کے مبہوت کر دینے والے جادوئی سراپے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

ایما نے جان کی طرف دیکھے بغیر باقی ماندہ سگار کو ایش ٹرے میں رکھا اور پیگ میں بچی ہوئی وہسکی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ شاید اپنے بیڈروم یا کچن کی جانب جا رہی تھی۔ کچن کا تصور میں آتے ہی جان کو بھوک کا احساس ہوا۔ اُس نے گذشتہ دوپہر کے بعد کوئی باقاعدہ کھانا نہیں کھایا تھا۔ صبح کا ناشتہ بھی جن حالات میں اُس کے سامنے رکھا گیا تھا اُس کا کھانا نہیں بنتا تھا۔ جان نے کچھ دانے روسٹڈ بادام کے اُٹھائے اور انہیں وہسکی کو سِپ کرنے کے وقفوں میں چبانے لگا۔ خیالات کی برہمی اور ماحول کی اکتاہٹ اُسے مسلسل بیزار کیے چلی جا رہی تھی۔ ایما کی جانب سے ملاقات کی خواہش نے اُس کے دل میں ایک دم ہزاروں خواہشوں کو جگا دیا تھا مگر اِس دوران کوشش کے باوجود جان اُس کھنچاؤ کو دور نہ کر سکا جو اُن دونوں کے بیچ کہیں رہ گیا تھا، کہیں رہ رہا تھا۔ اُس کی پسندیدہ وہسکی کی اچھی بھلی مقدار اور سگاروں کی وافر دستیابی بھی طبیعت کی اِس بیزاری پر کاٹھی ڈالنے میں ناکام رہے تھے۔

ایما واپس آئی تو یکسر مختلف اور مہربان روپ میں۔ گہرے سیاہی مائل نیلے رنگ کی باریک شیفون کی نائٹی میں اُس کے جسمانی خدوخال کچھ اِس قسم کی عشوہ طرازی سے جلوہ گر ہوئے کہ جان کے خیالات میں برپا برہمی پل بھر میں التفاتیہ مسکراہٹ میں بدل گئی۔ اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی جان کو مسکرا کر دیکھا اور کونے میں رکھے ایک کھلونا نما آلے کو چابی دینے کے بعد پھر سے اِس طرح گھومنے کے لیے آزاد کیا کہ اُس کے ایک سرے پر کھنچے ہوئے دھاتی تاروں کو برابر برابر وقفوں سے ایک چھوٹا سا دھاتی ٹکڑا بار بار چھیڑنے لگا اور کمرے میں جذبات کو مہمیز کرتی ہوئی مدھم مگر دِل آویز دُھن ہلکورے لینے لگی۔ ایما شاید کھانے کو بھی کچھ لائی تھی مگر جان کی سماعت میں موسیقی اُتری تو بھوک کا احساس بھی جاتا رہا۔ اُس نے رگوں میں دم توڑتے سرور کو اطراف میں پھیلتی ہوئی موسیقی کے سُروں کے ساتھ رقصاں رکھنے کے لیے وہسکی کا ڈبل پیگ بنایا اور اُٹھ کر مکمل سرنڈر کرنے کے سے انداز میں ایما کے سامنے کر دیا۔ جان کے ہاتھوں سے پیگ

لینے کا عمل شاید سیکنڈوں میں بھی ماپنا مشکل رہا ہو مگر یہ لمحہ اور یہ انداز اپنی وسعت پذیری اور اثر انگیزی میں زندگیوں کی طوالت کو کہیں پیچھے چھوڑ گیا۔

جان سے وہسکی کا پیگ وصولنے کے لمحے میں اُن دونوں کے ہاتھوں نے شاید ایک دوسرے کو مَس نہ کیا ہو لیکن دونوں کی نگاہیں آپسی اتصال کے بعد اِس طرح ملاپ کے ساگر میں اُتریں کہ تمام تر کھنچاؤ، تناؤ اور گریز خود بخود التفات، لگاؤ اور آسودگی میں منقلب ہوتے چلے گئے۔ مغلوبیت کا یہ لمحہ محبت کے زیرِ اثر تھا یا کسی کے ہاں کوئی خالی جگہ پُر کیے جانے کا وقتی مظاہر مگر جو بھی تھا وہ زندگی کے سبھی رچاؤ، ہیجان اور تقاضوں سے کہیں برتر کہیں فراواں تھا۔ ایما کی آنکھوں میں وہی جذبات روشن ہوتے چلے گئے جو پہلے پہل جان کو اپنے خیمے میں شکستگی کے عالم میں دیکھ کر جل اُٹھے تھے اور جان کی آنکھوں میں بھی وہی عاجزی، وہی شکستگی اور وہی بے بسی اِس مجسم حسن کے روبرو ہاتھ جوڑے کھڑی تھی جیسے اُسی پہلے روز، اُسی خیمے میں۔

ایما نے پیگ ہاتھ میں تو لے لیا تھا مگر اُسے سِپ کرنا یاد نہ رہا۔ جان نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور پیگ کو اُس کے لبوں سے اتنا قریب کیا کہ وہ وہسکی میں ڈوب گئے۔ ایما کی آنکھیں ایک عالمِ سرشاری میں ابھی تک جان ہی پر مرکوز تھیں۔ یہ لمحہ شاید کچھ اور طویل ہوتا مگر ایما کے شراب میں بھیگے ہوئے ہونٹ اپنے اتنے قریب پا کر جان نے اپنے دونوں ہونٹ اُن پر اِس طرح رکھے کہ شیواز کے ذائقے کے ساتھ ساتھ ایما کے شیریں ہونٹوں کی مٹھاس بھی اُس کے منہ میں نہیں بلکہ رگ و پے میں اُترتی چلی گئی۔

شاید اُن دونوں کو یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کب ایما کے بیڈروم میں پہنچے، کتنی مسافت طے کی اور کتنا پاگل پَن جنون کے لبادے میں ہر ایک کے حصے میں آیا۔ ایک عرصے کی بیگانگی اِس طرح قربت میں ہویدا ہوئی کہ دونوں کے جسموں کی الگ الگ پہچان بھی کارِ گریزاں ہو کر رہ گئی۔ اُن دونوں کو شاید یہ خبر بھی نہ رہی کہ بے چینی، انبساط میں اور ہیجان، آسودگی میں کب کی اپنی اپنی پناہ ڈھونڈ چکے ہیں۔ ٹھہراؤ کی یہ کیفیت غنودگی میں ڈھلی تو رات کا پہلا پہر گزرنے کا احساس تک نہ رہا۔ کھلی آنکھوں سے جاگنے کا احساس پہلے پہل ایما میں جاگا تو وہ ایک لمحے کے لیے سُن ہو کر رہ گئی کہ

جیسے اُس لمحے کا منظر نامہ اُس کی مرضی خلاف کے خلاف لکھا گیا ہو۔لیکن یہ تاثر لمحاتی تھا جو لمحوں بھر میں ہی زائل ہوتا چلا گیا۔ جو باقی رہا وہ شائستہ لطافتوں کا پرتو تھا، انگ انگ میں رعنایاں جگانے کی نسبت کا امین۔ ایما کو مدہوش جان پر بہت پیار آرہا تھا۔ وہ حیران تھی اُس کے اعصاب کی مضبوطی پر کہ اتنے مشکل حالات سے گزرنے کے باوجود جان نہ صرف اپنے آپ میں قائم رہا بلکہ نہ کہیں سے ٹوٹا اور نہ کہیں سے بکھرا۔ وہ جان کے سینے پر سَر رکھ کر لیٹ گئی اور اپنا بائیاں بازو اُس کے سینے پر پھیلا کر آنکھیں موند لیں۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت ہو چلی تھی۔ جان برنٹن کو جب اُس کے پیار اور دِل جوئی کی ضرورت تھی وہ اُس کے خلاف پراسیکیوٹر بن گئی اور یوں اُس کے زخموں پر نمک پاشی ہی نہیں کی بلکہ کئی نئے زخم، نئے چرکے لگائے۔ کیا گزری ہوگی اُس کے دل پر جس کے کیریئر کی بدترین گھڑی میں بیٹا مخالف گواہ اور بیوی مخالف وکیل بن کر اُسے دنیا کے سامنے نشان عبرت بنا دیں؟ ایما کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے جان کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی ہو۔ اُس نے بے اختیار ہو کر اُس کے سینے پر بوسہ دیا اور دوبارہ سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ جان کے دل کی دھڑکن پھر سے نارمل ہو چلی تھی۔ ایما مسکرا دی۔ اُس کے ذہن میں اُٹھنے والے خیال کہیں دل کے راستے جان تک پہنچ پا رہے تھے۔ جسمانی اتصال میں ذہن وقلب کی رسائی کا تصور ہی ایما کو شاداں کیے جا رہا تھا۔ بدن میں سرور کی لہریں مہمیز ہوئیں تو اُس نے بے خود ہو کر نیند میں مدہوش جان کو اپنی بازوؤں کی جکڑن میں لے لیا۔ اِس قدر لطیف دباؤ نہایت شیفتگی سے جان کے وجود میں اُترا تو اُس کی آنکھیں کھل گئیں مگر نیند سے بیداری کی طرف آتے ہوئے جو مدارج طے کیے جانے تھے وہ بھی ایما کی جسمانی فضیلت کے سبب ہوشربائی کی نذر ہو رہے تھے۔ جان کو یہ یقین کرنے کا موقع بھی نہیں مل پا رہا تھا کہ ایما کے قرب میں مچلتی ہوئی وارفتگی واقعی اُس کی ماہیت میں بھی ہے یا محض ایک وقتی جنون جو بدن میں برپا لذتوں کے زوال کے ساتھ ہی سرد مہری کے پاتال میں اُتر جائے گا۔

جان برنٹن نے اپنا آپ کسی ایسے ہرن کی مانند ایما کے حوالے کر رکھا تھا جس کی گردن فاقوں کی ستائی ہوئی شیرنی کے جبڑوں میں پھنس کر اُسے تڑپنے کے موقع سے بھی، محروم کیے ہوئے ہوتی ہے۔ اِن لمحات میں وہ پھر سے ایسی پراسیکیوٹر بن چکی تھی جو ملزمان کے کٹہرے میں بے بس

کھڑے جان برنٹن کو اپنی جرح سے اُدھیڑے، کچلے اور رگیدے چلی جا رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں جو کچھ بھی تھا اُس میں آزار نہیں پیار تھا، کلفت نہیں راحت تھی، بیزاری نہیں سرشاری تھی۔ ایما کی طرف سے لذت آفرینی میں روا رکھی گئی جارحیت نے اُسے اِس قدر رفزوں کار کیا کہ جان کو اپنے اپنے جسم کے ریشے ریشے سے اِنزال ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دل کی دھڑکنوں کے درمیانی عرصے میں زندگی کے سمٹ سمٹ کر بہے جانے کا احساس، حظ کی اُن حشر سامانیوں سے سوا تھا جو ایما کی جنون آفرینی نے جان برنٹن کے وجود کی سبھی وسعتوں میں برپا کر رکھی تھیں۔ ایک بھرپور عورت کی طرف سے خود سپردگی کے بجائے جسمانی جارحیت کی فتنہ طراز اثر انگیزی نے جان برنٹن کو ہر اعتبار سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایما کے بدن سے جاگنے والی مُد بوی نے جان کے اعصاب سے عمر بھر کی تکان نچوڑ کر اگرچہ بظاہر اُسے ہواؤں سے بھی لطیف کر دیا تھا مگر یہ بھی اُس کے جسم سے اُٹھنے والی اسی خوشبو کا اثر تھا کہ جان کی رگوں میں دوڑتی وہسکی اپنا سرور کھو کر بھی مدھرتا کو جانے نہیں دے رہی تھی۔ کچھ تو تھا آج جو جان برنٹن کے لیے نیا تھا۔ کیا یہ محض ایما کا رویہ تھا، خالی جگہ کو پُر کرنا تھا یا پھر محبت تھی؟ جان کو گماں ہوا کہ یہی محبت تھی، وہ بھی شادی کے شروع کے دنوں میں اِسی طرح مَیری کے ساتھ خلوت کے معاملات میں جارح ہوا کرتا تھا۔ تو کیا دو لوگوں کے درمیان جنسی تعامل میں جارحیت ہی محبت ہے؟ جان کو اپنے سوال کا جواب نہ ملا تو اُس نے ایما کی جانب دیکھا مگر وہ تو اُس کی بانہوں ہی میں سو چکی تھی تکان سے چور ہو کر۔

اگلی صبح جان برنٹن نیند سے بیدار ہوا تو وہ اکیلا تھا۔ کمرے کی روشنی بتا رہی تھی کہ دن کافی چڑھ چکا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود اُس نے بستر سے اُٹھنے میں کافی دیر لگائی کہ اُس سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔ ایک عجیب سی سرخوشی اور اُس سے رِستی ہوئی مسلسل تکان نے آلس کا ایک جہان جان برنٹن کے اطراف میں پھیلا رکھا تھا۔ مگر اِس کے باوجود وہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ بھوک کی چمک جسم و جاں کو چندھیانے لگی تھی۔ اپنے برہنہ جسم کے گرد چادر لپیٹ کر اُس نے کمرے سے باہر جھانکا تو ایما بھی اپنے گرد تولیہ نما گاؤن پہنے ہوئے ڈرائنگ روم کے ساتھ جڑی ہوئی لابی نما کمرے میں ناشتہ لگانے کا اہتمام کیے جا رہی تھی۔ دونوں کے درمیان صرف مسکراہٹ اور گڈ مارننگ کا تبادلہ ہوا

اور جان برنٹن واپس بیڈ روم سے ہوتا ہوا واش روم میں چلا گیا۔

جان ناشتے کی میز پر آیا تو ایما ناشتہ کر چکنے کے بعد چائے پی رہی تھی۔ جان بھی تیزی سے ناشتے کی طرف لپکا جب کہ ایما نے اُس کے لیے چائے بنا کر پیالی قریب رکھ دی۔ جان برنٹن کی آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ پورے وجود میں ایک تشکر آمیز سرشاری تھی۔ غسل لیتے ہوئے اُس نے سوچا کہ انگلینڈ واپس جانے کے بجائے باقی ماندہ زندگی یہیں انڈیا میں ایما کے ساتھ رہ کر بتانے کی کوئی راہ نکلے تو شاید بات بن ہی جائے۔ جان کے لہجے میں اب سوائے ممونیت کے اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ نہ تو غصہ اور نہ کوئی بے یقینی۔ جب کہ ایما کے چہرے کے ساتھ ساتھ اُس کی پوری باڈی لینگویج میں بھی سکون ہی سکون تھا۔ نہ تو کوئی شکایت اور نہ ہی عدم تحفظ کا کوئی گلہ۔ ناشتے کے بعد جان نے چائے کے بجائے کافی کی فرمائش کی تو ایما چند لمحوں ہی میں کافی کے دو کپ بنا لائی، ایک جان کے لیے اور ایک اپنے لیے۔ کافی کے پہلے سِپ نے ہی بدن میں توانائی اور چستی کو ایک ساتھ، اکٹھا ہی دوڑا دیا۔ جان کی آنکھیں کھلیں تو اُس نے ایما کو اپنے آئندہ کے ارادوں کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے کھنکار کر ابھی گلا صاف ہی کیا تھا کہ ایما نے مسکراتے ہوئے کچھ ٹائپ شدہ کاغذات اُس کے سامنے رکھتے ہوئے قلم ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''یہ کیا ہے؟''... جان نے کافی کا کپ ایک طرف رکھ کر کاغذات ہاتھ میں اُٹھا لیے۔

''کچھ خاص نہیں.... بس طلاق نامہ ہے.... نہ میں نے آپ کا کچھ دینا اور نہ آپ نے میرا کچھ دینا... بس آج سے ہم میاں بیوی نہیں رہے۔'' یہ سب کچھ کہتے ہوئے بھی ایما کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا لیکن جان کا چہرہ متغیر ہو چکا تھا۔ وہ کچھ بولا نہیں بس ایک نگاہ بھر کر ایما کے چہرے کی طرف دیکھا، چند لمحے اُس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں اور پھر گردن جھکا لی طلاق کے کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے۔ اُسے اپنا پورا وجود فالج زدہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ایما سے اِس ذہنی تشدد کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ وہ اُس سے خالی جگہ کو پر کرنے اور محبت، دونوں کا فرق جاننا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اُس نے گذشتہ کل اور آج کی اِس صبح کے بیچ وہ ایک رات کیوں رکھ چھوڑی تھی؟؟ کیا کرے گا وہ اس رات کا؟ کہاں لے کر جائے گا اِس رات کو؟

جان برنٹن کی آنکھوں کے کناروں سے کچھ آنسو نکلے اور گالوں پر بہنے کے بجائے میز پر آن گرے۔ اُس نے اپنے سوالوں کا جواب پانے کے لیے ایما کی طرف دیکھا مگر اُس کی کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ شاید اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ کچھ دیر کے بعد جان برنٹن بھی تیار ہو کر گیسٹ بیڈ سے باہر نکلا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ اُسے ایما کی تلاش تھی مگر اب ایما کو پانے کے لیے نہیں، اپنے جواب پانے کے لیے۔ کافی دیر گزرنے کے بعد بھی کہیں سے ایما کی موجودگی کا احساس تک نہ ہو سکا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنا سامان سمیٹ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اُس کے سامنے بیرونی چوبی پھاٹک کے ساتھ وہ خانہ بدوش لڑکی اپنا بچہ اُٹھائے کھڑی تھی۔ پسینے میں بری طرح شرابور۔ لگتا تھا کہ وہ صبح سویرے ہی سے یہیں موجود ہے۔ جان کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر اطمینان بخش مسکراہٹ جاگ اُٹھی مگر بچہ بری طرح چیخنے چلانے لگا۔ ایک کالی لڑکی کی گود میں گورا بچہ۔ جان کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے تاج برطانیہ چیخ رہا ہے، چلا رہا ہے۔ اُس نے سامان کو ایک طرف رکھا اور آگے بڑھ کر میلے کچیلے بچے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بچہ جان کے حوالے کرتے ہوئے خانہ بدوش لڑکی تیزی سے ایک جانب بھاگ کھڑی ہوئی جیسے کسی عذاب، کسی برے خواب سے پیچھا چھڑا کر بھاگی ہو۔ جان کا جسم کپکپا کر بے جان سا ہونے لگا مگر اس کے باوجود اُس نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔

کچھ دیر کے بعد کپکپاہٹ میں ٹھہراؤ پیدا ہوا تو جان برنٹن نے اپنا سامان سمیٹا اور بچے کو اُٹھائے، سامان گھسیٹتا ہوا چوبی پھاٹک سے باہر لے جانے لگا۔ ایک دم اُسے احساس ہوا کہ اُس کی عقبی سمت کوئی اُسے دیکھ رہا ہے۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے شیشوں کے پیچھے کسی کی پرچھائیں سی محسوس ہوئی جو اُسے واپس پلٹ کر دیکھتے ہی شاید ایک طرف ہٹ گئی تھی۔ جان پھر بھی کچھ دیر تک اُنہی قدموں پر ساکت کھڑا رہا مگر اب وہاں کھڑکی کے شیشوں کے عقب میں لٹکے ہوئے پردوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

# ۴۲

1875ء کا وسط آنے سے قبل ولیم سینٹ جان گالوے انڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی کا انجینئر انچارج مقرر ہو کر سائٹ آفس کا چارج سنبھال چکا تھا۔ اُس کی ذمہ داریوں میں دریائے ستلج پر ریلوے پُل کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اِس پر بچھائی جانے والی ریل کی پٹڑی کو اُس ٹریک سے جوڑنا تھا جو سابقہ چیف انجینئر جان برنٹن نے آدم واہن ریلوے اسٹیشن سے لے کر دریائے ستلج کے شمالی کنارے تک بچھا رکھی تھی اور دوسری جانب جنوبی کنارے پر اِسے اُس ریلوے ٹریک سے جوڑنا تھا کہ جو بہاول پور ریلوے اسٹیشن سے لے کر یہاں تک پہنچی ہوئی تھی۔ انجینئر ولیم گالوے ایک معاملہ فہم اور حیلہ جو شاطر تھا۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اُس کے ہاں طویل اور قلیل مدتی دونوں قسم کی حکمت عملیاں ہر وقت جیب میں رکھی رہتیں۔ اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے اُس کا پہلا حربہ اپنے شکار کو بے توقیر کرتے ہوئے اُس کم عقل اور چغد ثابت کرنا ہوتا تھا۔ جوں ہی اُس کا شکار اپنے سینئرز کی نگاہوں میں ڈس کریڈٹ ہوتا وہ فوری طور پر اُس پر جھپٹتا اور پھر ہر لحاظ سے لہولہان کرنے کے بعد نکال باہر پھینکتا نشانِ عبرت بنا کر ماتھے پر داغتے ہوئے جس پر اُس کا تحریف شدہ نامہ اعمال درج ہوتا۔

ولیم گالوے 1872ء اسٹیٹ ریلوے ڈیپارٹمنٹ میں محض ایکسین تھا۔ مگر انہی دنوں ایک میٹنگ میں جان برنٹن کے ہاتھوں شدید سبکی کا سامنا کرنے کے بعد اُس نے طے کر لیا کہ

اُسے انڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی کا چیف انجینئر نہیں رہنے دینا۔ اگر چہ اُنہی دنوں اُسے یہاں سے تبدیل کر کے پنجاب ناردرن اسٹیٹ ریلوے کے چناب اور جہلم کے درمیانی حصے میں تعینات کر دیا گیا مگر وہ بدستور جان برنٹن کے خلاف نت نئے فتنے کھڑے کرنے میں اِس لیے مسلسل کامیاب ہوتا رہا کہ جان کا بیٹا ولیم آرتھر اور سائٹ آفس کا سیکورٹی انچارج جم اُس کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ 1873ء میں دریائے جہلم پر پُل تعمیر کرنے کی ذمے داری اُسے سونپ دی گئی تو اُس کے لیے آسان ہو گیا کہ اعلیٰ سطحی اجلاسوں میں وہ جان برنٹن کی قابلیت پر شکوک پیدا کر سکے۔ جان برنٹن دریائے ستلج پر چھوٹے گیج کی پٹڑی بچھا رہا تھا تا کہ پُل کم خرچ میں بن سکے کیونکہ ویسے بھی ابھی کئی برسوں تک براڈ گیج یا ساڑھے پانچ فٹ چوڑائی کے ٹریک کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ولیم گالوے نے کمپنی کی اعلیٰ قیادت کو قائل کر لیا کہ ابھی سے براڈ گیج ٹریک کا بچھایا جانا ہی سود مند رہے گا۔ اُس نے مختلف حربوں سے جان برنٹن کو بددیانت، کم عقل اور ریلوے کے جدید تقاضوں سے نابلد ثابت کرنے میں کوئی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہی سبب تھا کہ جب ایک اور سازش کے نتیجے میں جان برنٹن کو کمپنی کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تو اسٹیٹ ریلوے ڈیپارٹمنٹ کی نگہ انتخاب بار بار ولیم گالوے پر پڑی جس نے ستلج ریلوے برج میں چھ بنیادیں مزید تعمیر کرنے کے بعد اِس ٹریک کو ساڑھے پانچ فٹ تک چوڑا کرنے کا خواب دیکھ رکھا تھا۔

ولیم سینٹ جان گالوے نے ستلج ریلوے پُل کا انجینئر انچارج مقرر ہونے کے بعد مختلف مسائل میں مبتلا اور سُست روی کے شکار اِس پُل کو برق آشنا کر دیا۔ ولیم گالوے کارکردگی سے زیادہ ''کارکردگی کی نمائش'' پر یقین رکھتا تھا۔ اُس نے سائٹ آفس میں آتے ہی ہر شعبے میں ایک تھرتھلی سی مچا دی۔ ولیم آرتھر اور جم جنہوں نے گالوے کی حکمرانی کی خواہش میں جان برنٹن کو دیوار سے لگائے رکھا تھا، ولیم گالوے کے آتے ہی دیوار کے ساتھ لگائے ہی نہیں گئے بلکہ عملاً دیوار میں چنوا دیے گئے کیونکہ اِس پراجیکٹ پر آنے سے پہلے ہی ولیم گالوے نے جہلم پُل پراجیکٹ پر موجود اپنے نائب ہیوج لیوون مانک کو ستلج ریلوے پُل کے پراجیکٹ میں کلیدی عہدے پر تعینات کروا لیا جس نے گالوے کے آتے آتے تمام سرکشیدہ معاملات ہموار کر کے

حالات اپنے قابو میں کر لیے۔ پُل کی بنیادوں پر کام کی رفتار بڑھانے کے لیے اُسے پہلے سے تین گنا زیادہ لیبر چاہیے تھی جو بستی آدم واہن میں وافر مقدار میں دستیاب تھی۔ لیکن اِس قدر سستی اور سائٹ سے قریب ترین علاقے میں موجود انسانی لیبر کا حصول ماضی قریب میں ہونے والے خونی واقعات کے سبب تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ بستی کے لوگوں میں نہ صرف یہاں کے افسروں بلکہ ہر اُس شخص سے شدید ترین نفرت تھی جو اُن کے بارے میں کوئی نرم بات کرنے کی کوشش کرتا۔ اُن کے نزدیک دریائے ستلج پر لوہے کا پُل بنا کر اُس کے اوپر سے لوہے کا شیطانی جن گزارنا یہاں کی دھرتی اور ستلج ندی کو اُنواسی کرنا تھا جس کا نتیجہ سوائے بربادی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

یہاں آنے سے پہلے انجینئر ولیم سینٹ جان گالوے کا خیال تھا کہ وہ پراجیکٹ پر ریلوے کمپنی کے اخراجات میں کمی لانے کے لیے مقامی لوگوں پر ڈھیروں فوج داری مقدمات کرانے کے بعد اُنہیں جیل سے جبریہ مشقت پر لیا کرے گا مگر یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ سستی لیبر کا حصول تو وہ نہایت آسانی سے لوگوں کو جیل میں ڈالے بغیر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مسئلہ صرف اُس مِتھ کو توڑنے کا تھا جس میں یہاں کے لوگ جکڑے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد گالوے نے نہایت احترام سے مولوی بخشو کو داروغہ کے ذریعے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ مُلا بخشو اچھی خاصی رد وقدح کے بعد اِس شرط پر تیار ہوا کہ کھانا مسلمان باورچی تیار کرے گا جس کی نگرانی اُس کا خاص ملازم پیرانڈتہ کرے گا۔ ولیم گالوے کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ دعوت سے ایک دن قبل پیرانڈتے کو کمپنی کے سائٹ آفس پہنچا دیا گیا۔ پیرانڈتے کی آؤ بھگت اِس قدر شان سے ہوئی کہ کہ جب مولوی ڈِتن وہاں پہنچا تو اُس کی باچھیں بند ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اُدھر انجینئر ولیم گالوے نے خوش خلقی اور احترام کا ایک قدم اور اُٹھایا اور مولوی ڈِتن کے آنے پر خود اُس کے استقبال کے لیے گیا۔ ابتدائی خاطر مدارت کے بعد مولوی صاحب کو دریا کے اُس حصے میں لے جایا گیا کہ جہاں پُل بنانے کے لیے بنیادیں بھری جا رہی تھیں۔ اُسے دکھایا گیا کہ اِن بنیادوں میں کچھ بھی حرام نہیں بھرا جا رہا اور نہ ہی اِن پر تعمیر ہونے والے ستونوں میں کچھ ایسا حرام مسالہ لگایا جائے گا بلکہ جب یہ ستون بننا شروع ہوں گے یا اِن پر

لوہے کے گارڈر رکھ کر پُل بنایا جائے گا تو مولوی صاحب کو بطور خاص بُلا کر اُن سے دعا کرائی جائے گی۔اب کے مولوی بخشو کے خوش ہونے کی باری تھی۔

انواع قسم کے کھانے جس قدر ادب احترام سے پیش کیے گئے اُس نے مولوی بخشو کو انجینئر ولیم گالوے کا گرویدہ بنادیا۔باہر سے چھولداری دکھائی دینے والے کیمپ اندر سے کسی پرتعیش محل کے کمرے سے کم نہیں تھے۔ اِن کی بناوٹ بھی مولوی ڈِتن کے لیے ایک رنگین خواب کی صورت تھی۔کھانے سے فارغ ہونے پر مولوی صاحب کو تحائف سے لاد دیا گیا۔اِس کے بعد کے آخری پچ نے تو اُسے بے حال کر دیا کہ جب ولیم گالوے نے داروغہ کو بُلا کر کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ بستی میں اب پتا بھی ہلے تو مولوی صاحب کی منشا کے بِنا نہیں۔ ہر رپورٹ اور ہر حکم اب اُنہی کا چلے گا۔داروغہ کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔اُس نے دونوں ایڑیاں جوڑ کر اتنی مستعدی سے مولوی صاحب کو سیلوٹ کیا کہاوہ خودسر سے ایڑیوں تک مستی میں ڈوب گیا۔اُس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔وہاں سے رخصت ہوتے بس اُس کے کانوں میں اتنی سی مؤدبانہ گذارش پڑی کہ بستی کے لوگوں کو اجازت دیجیے کہ وہ پُل بنانے کی مزدوری میں شامل ہو جائیں، ہم اُن کو بھی اچھا معاوضہ دیں گے اور آپ کے لیے نذرانہ آپ کی توقع سے بڑھ کر ہوگا۔اِس کے بعد مولوی بخشو کی سماعت جواب دے گئی۔

اگلے پانچ سات دنوں تک انڈس اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے سائٹ آفس کے باہر بستی کے نوجوانوں کا ہجوم مزدوری کے لیے پہنچا ہوا تھا۔انجینئر ولیم گالوے نے اپنے خیمے سے نکل کر دیکھا تو اُس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا اُس کا نائب ہیوج لیوڈن مانک حیرت سے اُس ہجوم کو دیکھ رہا تھا جس کا ہر فرد سب سے پہلے مزدوری رجسٹر میں اپنی حاضری لگوانا چاہ رہا تھا۔ولیم گالوے اندر ہی اندر مسکراتا ہوا آہستہ قدموں سے اُس کے عقب میں پہنچا اور داد وصول کرنے کے سے انداز میں اُس کا کندھا تھپتھپا کر بولا۔''مونک!ایک کام اور کرو.....''

مونک نے استفہامیہ انداز میں سر اُٹھا کر اپنے باس کی طرف دیکھا۔

''کیشئر سے کہو کہ اِن سب کو حاضری کے ساتھ ہی روز کی مزدوری روز پیشگی دے دیا

کرے۔'' مونک نے اب کے حیران ہوکر گالوے کی طرف دیکھا۔ جواب میں گالوے نے مسکرا کر اُسے ایسا ہی کرنے کو کہا۔ گالوے کی مسکراہٹ نے مونک کو بہت کچھ سمجھا دیا لہٰذا وہ بھی مسکرا کر کیشئر کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے روز اِس سے بھی زیادہ تعداد میں بستی کے لوگ مزدوری کرنے پہنچے ہوئے تھے۔ پہلے پہلے کچھ دن یہ بھی ہوا کہ مزدوری کا ایڈوانس لے کر کچھ مزدور کام کیے بغیر غائب ہوئے اور پھر نہیں آئے یا دن بھر کی مزدوری کے بعد شام کو اگر کسی مزدور کو سر درد بھی ہو گیا تو وہ اسے پُل کی نحوست اور ستلج دریا میں بہا دیے گئے شہیدوں کی بد دعا کا شاخسانہ سمجھا اور اگلے روز مزدوری پر واپس نہ آیا۔ اُس کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگوں نے بھی خوف کے مارے لوہے کے کام کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا تو ایسے میں انجینئر ولیم گالوے کے کام چوکی کا داروغہ نہیں آیا بلکہ مولوی بخشو آیا جس کا حکم ٹالنا بستی کے کسی شخص کے بس میں نہیں تھا۔

ستلج کے ایمپریس برج کا کام پہلے سے کئی گنا تیزی سے شروع ہوا تو دو مہینے بعد دورہ کرنے والی انسپکشن ٹیم کو انجینئر گالوے نے دو مہینے پہلے ہی بلا لیا۔ اُسے یقین تھا کہ ٹیم اُس کی کارکردگی کی تحسین کیے بنا نہیں جا سکے گی اور اِسی طرح ہوا۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ ٹیم کے دورے سے قبل ہی ولیم گالوے نے ناقص کارکردگی کو بنیاد بنا کر ولیم آرتھر اور جم دونوں کو ہیڈ آفس رپورٹ کرنے کو بھجوا دیا۔ وہ جانتا تھا جس شخص نے اچھے موقع کی جستجو میں اپنے باپ کو نہیں بخشا وہ پھر سے اچھے دنوں کی آس میں اُسے کیوں کر معاف کر پائے گا؟

## ۳۴

منگر کو پھانسی کی سزا کیا ہوئی بستی پر ایک عجیب سی نحوست چھا گئی جو اپنے مکین ہوتے ہوئے بھی مکینوں سے خالی دِکھنے لگی تھی۔ دریائے ستلج پر تعمیر ہونے والے ایمپرس برج کے انگریزی کے حروفِ تہجی پر مبنی ''اے تا آر'' ستون اپنی اپنی بنیادوں سے خاصے اوپر نکل چکے تھے۔ نوجوانوں کے پُل کے پراجیکٹ پر مزدوری کرنے کے سبب بستی کے گھروں میں اگر روپے پیسے کی ریل پیل نہیں تو کسی حد تک معاشی آسودگی ضرور آ چکی تھی لیکن اِس کے باوجود ایک ویرانی سی ویرانی تھی جو دن رات یہاں ڈیرہ ڈالے ہوئی تھی۔ بستی کے مردوں کی اکثریت مزدوری پر چلی جاتی تو بستی دن کو بھی سُنجی سُنجی سی لگتی اور جب وہ شام کو گھر لوٹتے تو اکیلے نہ ہوتے بلکہ دن بھر کی تھکن اُنہیں کسی آسیب کی طرح چمٹی ہوئی ہوتی جو اُنہیں کھانا بھی بمشکل نصیب ہونے دیتی اور بے ہوشی جیسی نیند کے حوالے کر کے یہ جا وہ جا۔ سارا سارا دن اپنے مردوں کی راہ تکنے والی دوشیزائیں آنے والی رات کے خوب سجا کر اُن کی دل جوئی کے لیے نت نئے مرغوب کھانے بناتیں، اپنے آپ کو سجاتی سنوارتیں اور اپنے بدن کی وہ خوشبوئیں بھی جگاتیں جو صرف اُس وقت جاگتی ہیں کہ جب جسم پر آخیر بنی ہو مگر اِس کے باوجود تکان سے چور ہڈیاں اور مشقت سے کچلے ہوئے عضلات اُن کے ہاتھوں پر کمائی کی رقم تو دھر سکتے تھے لیکن اُن کے پھیلے ہوئے بازوؤں اور تنے ہوئے سینوں کو اپنی جکڑن میں لے

کر اُن کی خواہشات کی اکڑن نہیں نکال سکتے تھے۔ اِس رویے نے بستی کے ہر گھر کی زنانی اور مردانی مخلوق کے بیچ نفرت اور لاتعلقی کی ایسی دیوار کھڑی کر دی جو بجھائی تو دیتی تھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

دیوار کچھ اور بلند ہوئی تو بلا خیز جوانیوں میں وحشت اور جنون نے اپنے اپنے رخنے بنانے شروع کر دیے۔ ایسے میں اُن آلسی اور نکھٹو لونڈے لپاڑوں کے ساتھ ساتھ مُلا بخشو جیسے لوگوں کی بھی لاٹری نکل آئی جو سارا دن بستی میں پڑے اینٹھتے رہتے۔ لہٰذا جو رقم مزدوری کرنے والے لوگ دن بھر کی مشقت کے بعد گھروں کو لاتے تھے اُس نے اپنا نکاس اِس طرح اُن لوگوں کے لیے ڈھونڈ لیا جو تن آسانی میں بھی کماؤ بنے ہوئے تھے۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ انہیں کمائی کے لیے دریا کے پُل کے ستون تعمیر نہیں کرنے تھے بلکہ کمائی خود چل کر اُن کے گھر تک آنے لگی تھی۔ سماجی ساخت کے معیار بدلے تو اُنواسیوں نے گھر گھر زمام کار اپنے ہاتھ میں لے کر گھر داری کے معاملات میں مردانہ گرفت کو کمزور تر کر دیا۔

منگر کو سزائے موت ہونے پر سنگری نے چند دن تو آنسو بہائے مگر جب معلوم ہوا کہ یہ ابھی کچی سزا ہے، پکی بڑی عدالت سے ٹھپہ لگنے کے بعد ہوگی تو اُسے یاد بھی نہ رہا کہ منگر نام کا کوئی مرد اُس کی زندگی کے معاملات میں کبھی دخیل رہا بھی تھا۔ بستی کی عورتیں بیک زبان اُس کے خلاف زہر اُگلتی رہتی تھیں کہ اُس نے نجانے کہاں سے اپنا کنوار پن کھویا مگر گبھن ہوتے ہی خاندان کے خاندان برباد کرتی چلی گئی حتیٰ کہ اُس شخص کو بھی پھٹے تک پہنچا دیا جو ہمیشہ اس کی مصیبتوں کو اپنے سَر لیتا رہا۔ جب کہ مردوں کی اکثریت سنگری کی حامی ہو چلی تھی کہ کیسے کیسے اُس نے اُن مردوں کے ظلم سہے جو اُس کے لائق ہی نہ تھے۔ لیکن سنگری کو اِن میں سے نہ تو کسی کی حمایت کی ضرورت تھی اور نہ ہی مخالفت کی۔ اُس نے تو زندگی اپنے ڈھب سے گزارنی تھی جس کا ایک ہی مقصد تھا کہ جیسے تیسے اپنے بچے کی زندگی کا تحفظ۔ اُس نے اپنا باکرہ پن کھویا اور حاملہ بھی ہوئی لیکن اُس نے اِس سماجی کلنک کو اپنی شرمندگی نہیں بنایا۔ اپنی نگاہ میں وہ اُنواسی ہو کر بھی لاکھوں کنواریوں سے برتر تھی۔ اِس راہ میں اُسے کسی کی پروا نہیں رہی تھی حتیٰ کہ اپنی ماں کی بھی نہیں۔

جب سماج اور سماجی بندشیں اُس نے اپنے پاؤں کی ٹھوکر تلے رکھ چھوڑی ہوں تو کسی کی بھی پروا کرنا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اَنواسی خواہشا نہیں بلکہ جبراً ہوئی تھی لہٰذا اُسے اِس کی اَخیر تک پہنچنے کے لیے مکر، فریب، حیلہ سب کچھ رَوا تھا۔ اب نہ تو اُسے رِیتی رواج کی فکر رہی تھی اور نہ ہی مذہب اور سماج کی۔ زندگی کا چلن اور جینے کا ڈھب جو اُس نے کئی کٹھنائیوں سے گزر کر ترتیب دیا وہ خالصتاً اُس کا اپنا تھا جس میں کسی کو دخیل ہونے کی اجازت نہیں رہی تھی۔ خود اُس کے اپنے آپ کو بھی۔

منگر کی گرفتاری کے بعد کچھ عرصے تک تو سنگری پر مُلا بخشو کا التفات بھی رہا اور اشتیاق بھی جس کا وہ حسبِ موقع وحسبِ حجم دفاع کرتی رہی لیکن جوں جوں بستی کے مردوں کا روزگار بہتر ہوتا گیا توں توں دعا دارو کے لیے مُلا کے گرد بستی کی عورتوں کا جھمگھٹا بڑھتا گیا نتیجتاً وسائل اور مواقع وافر ہو جانے کے سبب اُس کی سنگری کی ذات میں دلچسپی کم ہوتی چلی گئی۔ دن میں کئی کئی بار چکر لگا کر اُس کی جان اجیرن کیے رکھنے والا بخشو اب کئی کئی دن چھوٹے زنان خانے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ پہلے پہلے تو سنگری نے سُکھ کا سانس لیا کہ عذابِ مسلسل سے گلوخلاصی ہوئی مگر انسانی فطرت ہے جہاں کہیں خلا پیدا ہوتا ہے وہ اپنی کمی محسوس کرائے بغیر نہیں رہتا چاہے وہ ناپسندیدہ ترین ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہاں تو معاملہ کچھ ہٹ کر تھا کہ اُس نے دوسری عورتوں کی فراوانی کے سبب اُسے بھلا دیا تھا۔ کتنی کثافت در آئی تھی سنگری کی سوچ میں جس ممنوعہ تعلق کو وہ کسی طور اخلاقیات کے دائرے میں لانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی، اَب اُسی تعلق کی جانب پیش رفت کے امکانات کا معدوم ہونا اُسے کھل رہا تھا۔ کیسے کیسے تضاد ہیں کہ اگر ہم پر کچھ مسلط کیا جا رہا ہو تو اُس کی مزاحمت بھی بنام اَنا کرتے ہیں اور اگر وہ مسلط ہوتا ہوا ایک دم پیچھے کو ہٹ جائے تو اُس کے پیچھے ہٹنے کے خلاف مزاحمت بھی اَنا ہی کے نام پر کی جاتی ہے۔ مولوی ڈِتن کے چھوٹے زنان خانے میں نہ آنے کا وقفہ جب کچھ دن سے کئی دن کا ہونے لگا تو سنگری نے اُسے بُلا بھیجنے کے پیغامات شروع کر دیے اور جب وہ بلاووں پر بھی نہ آنے کو ترجیح دینے لگا تو نوبت یہاں تک

پہنچی کہ سنگری اُسے بلانے کے واسطے جتن کرنے لگی۔

''کیوں ذلیل کر رہی ہو اپنے آپ کو اس قدر!'' ملوکاں آخر ایک دن پھٹ ہی پڑی۔ ''خرچ اخراجات کے لیے اُس کے ترلے کرنے سے بہتر ہوگا کہ ہم بھی جا کر پُل پر مزدوری کرنا شروع کر دیں۔ خود ہی دے گا یہ مولوی بخشو جب اِس کی ناک کٹے گی۔''

''مجھے میری مرضی کرنے دو.... جانتی ہوں کہ اِن لوگوں کی ناک نہیں کٹنے والی۔''

''میں تو کہتی کہ چھوڑ یہ مولوی کا گھر اور ہم چلتے ہیں اپنے گھر کو... اتنا پورہیا تو کر ہی لیں گے کہ اِس بچے کو اچھے سے پال سکیں۔''

''میں کیوں کروں پورہیا کہ جب اِس بچے کا باپ اتنی جائیداد چھوڑ کر مرا ہو؟''

بیٹی کو ضد پر بضد دیکھتی تو ہر بار ملوکاں ہی چپ کر جاتی۔ کبھی کبھی کچھ کھا کر مرنے کی دھمکی بھی دیتی مگر سنگری جانتی تھی کہ اُس کی ماں کو زندگی سے بہت پیار ہے اور زندگی سے اتنا پیار کرنے والی عورتیں مرنے کے لیے نہیں کھاتیں صرف جینے کے لیے کھاتی ہیں۔ دوسری طرف ملوکاں بھی جانتی تھی کہ اُس کی بیٹی صرف اِس لیے اپنے آپ کو جان بوجھ کر ذلیل کیے جا رہی ہے کہ مُلا بخشو کو پھر سے اپنی طرف متوجہ کر کے اُسے پہلے سے بھی زیادہ ذہنی اذیت دے سکے۔ لیکن ماں تھی، ڈرتی تھی کہ بیٹی مردوں کو نیچا دکھانے کے چکر میں کہیں خود پاتال میں نہ جا گرے۔ ماں کے اِن تمام خدشات اور تمام ممکنہ خطرات کے باوجود سنگری کا خمیر کسی اور مٹی سے اُٹھا ہوا لگتا تھا۔ خدشات کی طرف وہ مڑ کر نہیں دیکھتی تھی اور خطرات اُس سے منہ چھپانے ہی میں عافیت جانتے تھے۔ وہ ایک مرد کے مرد بیٹے کو مردوں کی دست برد سے بچانے کے لیے مردوں کا کا شکار کیے چلی جا رہی تھی۔ ایک مرد کا شکار ہو کر اُسے سبھی مردوں کا شکار کرنے کی اُنگل ہاتھ میں آ گئی تھی۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ مُلا بخشو اُس کے چلتروں کا گرفتہ ہوتے ہوئے بھی کسی اور راستے پر بچ نکلا تھا۔ عجیب عورت تھی یہ سنگری کہ اِس ہونی کو اپنے لیے نعمت سمجھنے کے بجائے ہزیمت جان کر اُسی رویے کو اپنا بیٹھی جو ہر بار پیچھے دھکیلے جانے کے بعد بخشو اپنائے رکھتا تھا۔

یہ صورتِ حال شاید کسی المیے پر منتج ہوتی اگر اچانک ایک دن یہ خبر نہ اُڑتی کہ اپیل کے فیصلے کے نتیجے میں منگر مُلا اللہ رکھے کے قتل کے مقدمے سے بری کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر سنگری اور مُلا بخشو دونوں کے واسطے خیریت کی خبر نہیں کہی جا سکتی تھی اس لیے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ کئی ایک واہموں اور امکانات میں گھر کر رہ گئے۔ سنگری کو جہاں اُس سے ذاتی طور پر عدم تحفظ کے خدشات درپیش تھے وہاں یہ خوف بھی تھا کہ اگر اُس کا گلا سڑا بدبودار عشق پھر سے جاگ گیا تو کئی فتنے خوامخواہ جاگ جائیں گے۔ سنگری کو اپنی ماں کے اندیشوں سے قطع نظر کامل گماں تھا کہ منگر اُس سے جھوٹی گواہی کا انتقام لینے کے بجائے ایک بار پھر اپنے عشق کا کاسہ لے کر اُس کے دروازے پر دستک دے گا۔ اِس خیال نے سنگری کے باطن میں نہاں خُبث کے گال کو عجیب سی کمینگی سے تھپتھپایا۔ ''کوئی تو ہے جس سے رقابت کا ہوّا مُلا بخشو کے مقابل لایا جا سکتا تھا... دونوں ایک بار پھر آمنے سامنے ہوں تو میدان صرف سنگری کا کہ اُسے جس طرف چاہے، پلٹا دے اور ہو سکے تو دونوں پر پلٹا دے۔''

سنگری کو جس طرح بخشو کی بدخصلتی سے نفرت تھی اُسی طرح منگر کے اظہارِ عشق سے چڑ تھی۔ بخشو اگر رشتوں کی حرمت کو خاطر میں بھی نہیں لاتا تھا تو منگر کسی عورت کو سَر اُٹھا کر پوری طرح دیکھتا بھی نہیں تھا۔ منگر سرے سے جسم کو چھونے سے گریزاں اور بخشو اُسے پامال کیے بِنا رہتا ہی نہیں تھا۔ منگر اگر لجلجا سا کیچوا تھا تو بخشو سبز گھاس میں رہنے والا سبز سانپ جو ڈِکھے بغیر زہر اُنڈیل کر یہ جا وہ جا۔ جب کہ سنگری کو تو شوکتے ہوئے مُشکی ناگ پسند تھے جو سامنے آنے سے پہلے ہی اپنی موجودگی کی خبر دیں اور پھر ڈسنے سے پہلے پورا پھن پھیلا کر اپنے شکار کو اپنی طاقت، ہیبت اور وجاہت سے اِس طرح مسحور کیے رکھیں کہ شکار خود ڈسوانے کے لیے تڑپ تڑپ جائے۔ سنگری کی اِس ذہنی روش کے پیچھے اُس کے تسلیم نہ کرنے کے باوجود کہیں سیدا پوری گھن گرج کے ساتھ موجود تھا۔ شاید یہی وہ ذہنی ساخت تھی جس کے ہاتھوں اُسے اُن دونوں سے شدید نفرت ہو چلی تھی مگر مجبوری یہ تھی پیش آمدہ حالات میں اُس کی بقا اور تحفظ کا راستہ اِن دونوں کی طرف جا کر نکلتا تھا۔ سنگری کے لیے اِن دونوں کی خواہشات سے کھیلتے ہوئے اپنے لیے محفوظ راستہ اپنائے

رہنا ہی مقدر ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر چہ ایسے ہی ایک بگڑ چکے کھیل میں مُنگر کے دائرے سے باہر ہو جانے کے بعد وہاں صرف ایک کھلاڑی باقی رہ کر اپنی من مانی کرنے لگا تھا مگر قسمت پھر دوسرے کھلاڑی کو بھی دائرے کے اندر لے ہی آئی۔ سنگری کے ساتھ ساتھ یہ خبر مُلا بخشو کے لیے بھی شطرنج کی بازی دوبارہ جوڑنے کی منادی تھی کہ نہ صرف اُسے بھولی ہوئی سنگری یاد آ گئی تھی بلکہ اُس سے جُڑی ہزیموں کی وہ ساری روداد بھی یادداشتوں سے نکل کر حاضر منظرنامے کا حصہ بن گئی تھی۔ یہ مُنگر کی رہائی تھی جس نے رقابت کو پھر سے ہوا دے کر غیر اہم ہو چکی سنگری کو اگر اہم ترین نہیں بھی تو بخشو کے لیے اچھا خاصا اہم ضرور بنا دیا تھا۔

لیکن مُنگر اپنی رہائی کے باوجود بستی واپس نہ آیا۔ بس کبھی کہیں سے کوئی خبر آ جاتی اور کبھی کہیں اور سے اُس کے برعکس کوئی اطلاع پہلی خبر کو جھٹلا دیتی۔ پہلے پہل تو اُس کی رہائی کافی دنوں تک شکوک و شبہات کی نذر رہی مگر جب داروغہ نے مُلا بخشو کے ہاں خود آ کر اِس واقعہ کی تصدیق کر دی تو اِسے سچ مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ جوں ہی یہ خبر افواہ سے حقیقت بنی، مُلا بخشو بھی ایک عرصے کے بعد چھوٹے زنان خانے کی طرف چلا آیا وگرنہ سنگری کی عدت کے دوران اُس نے اِس طرف جھانکنے سے بھی گریز کیے رکھا۔ مگر اِس کی حقیقت صرف سنگری جانتی تھی کہ اُس کے نہ آنے کا سبب اُس کی عدت تھی یا وہ شدت جواب بوجوہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اب کے آتے ہوئے مُلا اپنے ساتھ کھانے پینے کی اچھی خاصی اشیا کے علاوہ وہ کچھ زنانے کپڑے بھی لے لایا۔ اُس کا رویہ بھی پہلے کی نسبت اچھا خاصا ہوش مندی کے دائرے میں تھا۔ بلکہ یوں کہیں کہ خاصا خاموش اور محتاط جیسے کسی مخاطب کو اُس کی اوقات کے ساتھ ساتھ تعلقات میں در آ چکی لاتعلقی کی جانب توجہ دلانا چاہ رہا ہو۔ پہلی بار اُس نے اپنے والد کی آخری متنازع اولاد منتو کو اُٹھا کر پیار بھی کیا اور پھر اُسے سنگری کے حوالے کرتے ہوئے آنکھوں میں کسی قسم کی حریصانہ چمک لائے بغیر سر جھکائے رکھا۔ سنگری کے لیے یہ سب کچھ حیران کن ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے اضطراب کا باعث تھا۔ یہ اُسے زیرِ نگیں رکھنے کی کوئی نئی چال تھی یا واقعی وہ مایوس ہو کر اپنا راستہ بدل چکا ہے۔ لیکن اتنا خدشہ تو پھر بھی تھا کہ مُلا بخشو سے خیر کی توقع رکھنا کھجور کے درخت سے چھاؤں مانگنے کے مترادف

تھا مگر پھر بھی نجانے کیوں اب کے پہلی بار اُسے مُلا بخشو اچھا لگا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اُس کی پلکیں پانی سے بوجھل ہو گئیں۔ اُس نے جلدی سے مہمان کے لیے شکر کا شربت بنانا چاہا مگر ماضی ہو چکے معمول کے برعکس وہ اُتاولا سا آیا اور اُسی طرح کچھ کھائے پیے بغیر واپس چلا گیا۔ سنگری کی پلکوں پر ٹِکا ہوا پانی زیادہ بوجھل ہوا تو چھلک پڑا۔ آنسو اُس نے گالوں سے پونچھے نہیں بلکہ اُسی جولانی ہی میں بہنے دیے۔ اب کون اُس کے دل میں جھانکے بغیر جان پاتا کہ یہ توقیر کے آنسو تھے یا بے توقیری کے۔





## ۴۴

اُسی رات ایک اور خبر پھیلی کہ دریا کے پاٹ میں جہاں جہاں ستونوں کی تعمیر کا کام زور شور سے جاری تھا، ایک دم سمیٹ لینے کا حکم جاری کر دیا گیا کہ کل کسی وقت بھی دریا میں ایک بہت بڑا سیلابی ریلا گزرنے والا ہے۔ سیلاب کی اِن دنوں اچانک آمد انتہائی غیر متوقع اور اُن غیر معمولی بارشوں کا نتیجہ تھی جو کئی دنوں سے دونوں دریاؤں ستلج اور بیاس کے منبع جات کے علاقوں میں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ تبت کی برفیلی چوٹیوں سے ایک چشمے کی صورت اپنا سفر آغاز کرنے والا ستلج اور ہمالیہ کے پہاڑوں سے نکلنے والا بیاس، دونوں شمالی ہندوستان کی ریاست کپورتھلہ کی جنوب مغربی حدود میں یک جان ہو کر اُس سے آگے کے بہاؤ میں ایک ہی نام ستلج سے جانے جاتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوا کہ اِن دریاؤں نے سیلاب بن کر بہاول پور یا آدم واہن کو ڈبوتے ہوئے اگلے پڑاؤ میں چناب سے ملنے کے لیے پنجند کی طرف مراجعت کی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ بستی کی موجودہ نسل نے سیلاب کا نام ہی سُن رکھا تھا، ابھی تک سیلاب دیکھا نہیں تھا۔

سیلاب کی خبر اُڑتے ہی کچھ لوگوں نے راتوں رات اِردگرد کے ریت کے بلند ٹیلوں پر نہ صرف ضرورت کا گھریلو سامان منتقل کر لیا بلکہ گھر والوں کو بھی لے کر جتنی اونچائی پر مسکن بنا سکتے تھے، بنا کر بیٹھ گئے۔ مُلا خاندان میں سراسیمگی پھیلی تو بخشو نے داروغہ سے رابطہ کیا۔ داروغہ نے تسلی دی کہ آج رات سیلاب کا کوئی خطرہ نہیں، امکان کل دوپہر تک ہے۔ داروغہ نے رازدارانہ

لہجے میں یہ بھی بتا دیا کہ ہوسکتا ہے کہ دریا پر پُل کے واسطے ہو چکے کام کو بچانے کے واسطے سیلاب کو کہیں پہلے ہی چولستان کی جانب پھیلا دیا جائے ورنہ کمپنی کا دیوالیہ نکل سکتا ہے۔ داروغہ نے ساری معلومات اتنے تیقن سے مُلا تک پہنچائیں کہ رات بھر کے لیے زنان خانوں میں بھی سکون ہو گیا۔ مولوی کی دیکھا دیکھی اُس کے قرب و جوار میں بسنے والے لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کے ہو رہے۔

لیکن داروغہ کے ذریعے مُلا بخشو تک پہنچنے والی خیریت کی خبر اُس وقت خام ثابت ہوئی کہ جب رات کے آخری پہر سیلاب کے پانی کی پہلی چھل بستی کے نسبتاً کم آباد نشیبی علاقے سے گزرتی ہوئی دوبارہ سے دریا کو پتن کے مقام پر جا ملی۔ لوگ ہڑبڑا کر اُٹھے تو جس کے سینگ جدھر سمائے وہ اُدھر کا ہی ہولیا۔ عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ بھاگم دوڑ کے ساتھ چیخ و پکار نے پل بھر میں پوری بستی کو میدانِ جنگ کا منظر بنا کر رکھ دیا۔ مولوی بخشو کو بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بڑی چھل کے آنے سے پہلے بڑے اور چھوٹے زنان خانے سمیت اپنے پردادا کے نام سے منسوب مولوی عبدالقادر کی حویلی کے پچاس سے زائد مردوں، عورتوں اور بچوں کو کہاں لے کر جائے۔ شام کو داروغہ کے ساتھ یہ تو طے پایا تھا سیلاب کی صورت میں اُنھیں ملتان بھجوا دیا جائے گا لیکن اِس وقت ملتان تو کیا، چوکی تک بھی پہنچنا محال دکھائی دے رہا تھا۔ مُلا بخشو حیران ہو رہا تھا کہ بستی کے سارے کمیوں اور چھوٹی ذات کے لوگوں نے اُن کی پروا کیے بغیر بستی سے قریب کے سبھی اونچے ٹیلوں پر قبضہ کر لیا تھا اور اب آنکھوں کے ڈیلے سفید کیے اُنھیں خوار ہوتے دیکھ رہے تھے۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ سیلاب میں ریت کے ٹیلوں پر پناہ لینا اکثر خودکشی ثابت ہوتا ہے کیونکہ ٹیلے کی نچلی سطح اِس طرح پانی میں کُھرتی ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کب ٹیلے کا ٹیلہ کٹ کر پانی میں بہہ گیا۔ مگر اِس کے باوجود ٹیلوں پر قبضہ جمانے کی غرض سے کی جانے والی دوڑا دوڑی اور بھاگم بھاگ میں اگر کوئی کیہل، گُھانا، کمہار یا چمار مولویوں کی حویلی کے پاس سے گزرتا اور باہر موجود مُلا خاندان کے کسی فرد کے روکنے پر بھی نہ رکتا تو وہ سب حیرت سے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھتے کہ جیسے قیامت کا دن رات میں اُتر آیا ہو۔

اتنے میں ایک بار پھر دریا کی جانب شیر کے دھاڑنے یا ہاتھیوں کے غول کے ایک ساتھ چنگھاڑنے جیسی آوازیں سُنائی دی۔ بستی کے قریب واقع ریت کے اونچے ٹیلوں پر پناہ لیے ہوئے لوگوں کا شور اُٹھا کہ سیلابی پانی کی ایک بہت اونچی لہر تیزی سے بستی کی جانب بڑھی چلی آ رہی تھی۔ مُلا بخشو نے حویلی کے سبھی لوگوں کو دوڑ کر اپنی جان بچانے کا کہا اور خود بھی اپنے اُن بچوں کے ساتھ قریب کے ٹیلے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا جن کے ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے۔ اُس کے بعد کسی کو کچھ خبر نہیں رہی تھی کہ کون کہاں کہاں ہے؟ وہ مرد و زن جو ایسے میں بھاگتے ہوئے قریبی ٹیلوں پر چڑھنے کی کوشش میں تھے اُنہیں اُن ٹیلوں پر موجود لوگ اُن کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا قیمتی سامان چھین جھپٹ کر مسلسل نیچے دھکیلنے کی کوشش میں تھے۔ قریب کے ٹیلوں پر مزید لوگوں کے پناہ لینے کی گنجائش ختم ہو چلی تھی اور دور کے ٹیلوں تک پہنچنے کی مہلت نہیں رہی تھی۔ مُلا بخشو تو کسی نہ کسی طور اپنے چار بچوں سمیت ایک اونچے ٹیلے پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا مگر باقی خاندان کی کچھ خبر نہ رہی کہ اُس کی مائیں کہاں ہیں، بھائی بہن کہاں اور اپنی بیوی اور باقی بچے کدھر رہ گئے۔ سنگری تو شاید اُس کی یاداشت ہی سے محو ہو چکی تھی۔

اتنے میں ایک بہت ہی بلند لہر اُس کے سامنے ہی اِس طرح بستی میں داخل ہوئی کہ پانی مکانوں کے اوپر سے گزر گیا۔ بستی کا نشان تک نہیں رہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا اب پانی کے اندر رہ گیا تھا۔ پانی کی یہ لہر جب ٹیلوں سے ٹکرائی تو اُن لوگوں کو اپنے ساتھ بہاتی ہوئی لے گئی جو چار پانچ فٹ کی بلندی تک پناہ لیے ہوئے تھے۔ جو اِس سے اوپر تھے وہ بچ تو گئے مگر مسلسل اسی خوف میں کہ کب پانی میں گرے سو گرے یا کب کوئی اور اِس سے بھی اونچی چھل آئے اور اُنہیں بھی بہا کر لے جائے۔ ایک مسلسل چیخنے چلانے اور رونے، دھائی دینے کا سلسلہ تھا جو یہاں سے وہاں سبھی ٹیلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اندھیرا ہو جانے کے باعث ابھی تک اِس المیے کی شدت اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی اِس امر کو کھوجنا کہ کس کی پندار کہاں غرق ہوئی یا کون کس کی کس جگہ میں پناہ لیے ہوئے ہے؟

صبحِ کاذب کی ملگجی روشنی پھیلی تو ہر سو بربادی کے مناظر نے جہاں مردوں کو دھاڑیں مار کر رونے پر مجبور کر دیا وہاں عورتوں کے بین بھی بلند تر ہوتے چلے گئے۔ ٹیلوں کے اطراف میں انسانوں اور جانوروں کی تیرتی ہوئی لاشوں اور گھریلو سامان نے صبح قیامت برپا کر رکھی تھی۔ لوگ ٹیلوں کی اونچائی پر اپنے پیاروں کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے اِس بات کی پروا کیے بغیر اُن کے اِس طرح بے محابا بھاگم دوڑ سے ٹیلے کی ریت تیزی سے اطراف میں موجود پانی میں گھرنا شروع ہو سکتی ہے اور وہ سب کے سب ریت کے ساتھ ہی پانی میں دفن ہو سکتے ہیں۔ اپنے پیاروں کو ڈھونڈنے والوں مولوی بخشو بھی شامل تھا۔ وہ ہر ایک سے اپنے گھر والوں کا پوچھتا پھر رہا تھا مگر جواب میں اُسے بھی اُسی سوال کا سامنا تھا کہ اُن کے گھر والوں کو تو کہیں نہیں دیکھا؟ وہ اِس بات پر حیران تھا کہ سب لوگ اُسے جانتے ہوئے بھی پہچان نہیں رہے تھے اور اگر پہچانتے بھی تھے تو مُس کے اظہار سے گریزاں تھے۔ وہ شاید خود بھی اِسی پہچان کی تلاش میں سرگرداں ریوڑ کا حصہ ہو چکا تھا جو جان پر بنے تو جڑ کر رہنے کا تعلق ڈھونڈتا ہے مگر جب جاں سے گزرنے کی حد آن پہنچے تو تعلقات کو بوجھ گردان کر ان سے ماورا ہو جاتا ہے۔

اطراف میں تیرتی لاشیں اور ابھی کل تک عفت مآب رہ چکے اجسام، سماجی توقیر کے تقاضوں سے نیچے گر چکی حالت میں مُلا بخشو کے حواس کو سُن کیے جا رہے تھے۔ ہر تیرتی لاش اُسے اپنے گھر والوں کی اور بال بکھیرے ہر بے پردہ عورت اُسے اپنی بیٹی، بیوی، بہن یا ماں دکھائی دے رہی تھی۔ سماجی توقیر کے اعلیٰ سنگھاسن پر بیٹھی وہ عورتیں جن کا پردہ مرنے کے بعد قبر تک نہیں کھلتا تھا اپنی بے نور دکھائی دینے والی آنکھوں کے ساتھ اُن لوگوں کے ساتھ جڑی بیٹھی تھیں کہ جنہیں سماجی مرتبے کے لحاظ سے کم ذات کہا جاتا تھا۔

کون کہتا ہے کہ سماج اقدار کے اعتبار سے ترتیب پاتا ہے، سماج تو مرنے کے خوف کے خلاف وسائل کی دستیابی کے درجات سے تشکیل پاتا ہے اور اُس وقت تک اپنی بُنت قائم رکھتا ہے کہ جب تک موت کا خوف، موت کے یقین میں نہ بدل جائے۔ بستی آدم واہن میں آنے والے سیلاب نے محض گذشتہ رات کے آخری پہر سے آج کی صبح کاذب تک کے عرصے میں یہاں

کے مکینوں کے دلوں میں پیدا ہوئے موت کے خوف کو موت کے یقین میں بدل کر صدیوں سے قائم سماجی ڈھانچے اور اُس کی بُنت کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ بستی کی اشرافیہ اپنی اقدار اور پندار سمیت آن کی آن میں رذائل کی طرح دِکھنے لگی۔ نہ تو کوئی امتیاز اور نہ ہی کسی امتیاز کا کوئی تقاضا۔

جوں جوں دن چڑھتا گیا انسانوں سے جُڑی حاجات بھی بڑھتی گئیں۔ اعلیٰ و ادنیٰ ایک ہوئے تو معلوم ہوا کہ اُن کی جسمانی ضروریات بھی ایک جیسی ہیں۔ کھانا، پینا، ہانگنا پہلے اور گرمی سردی کا احساس بعد میں۔ ٹیلوں پر پناہ لے کر بیٹھے انسانوں کے اطراف کا اپنے جیسے انسانوں کی لاشوں بھرا منظر کئی گھنٹوں سے ساکت ہو رہا تو اُن کی موت سے جُڑا دکھ کا احساس بھی معدوم ہوتا چلا گیا۔ آنسو خشک ہوئے تو آہ وزاری بھی رُندھتی چلی گئی۔ ریت کے اونچے ٹیلوں پر بیٹھے اِن سانس لیتے جسموں میں سب سے پہلی حاجت ہاگنے کی جاگی جس نے اُنہیں اپنے پیاروں کے غم سے بیگانہ کرتے کچھ ایسا چاہا جو اُنہیں فوراً اِس فطری جبر سے آزادی دلا سکے۔ اِس مصیبت کو ٹالنے کے لیے خواتین نے مل کر ایسا بندوبست کیا کہ وہ کسی ایک کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو جاتیں اور اُس کی فراغت کے بعد دوسری فارغ ہونے کے لیے بیٹھ جاتی۔ جب کہ مردوں سے کوئی ایسا بندبست نہ ہو پایا تو وہ جہاں کھڑے ہوتے تھے وہیں تھوڑی سی ریت کھود کر سب کے سامنے بیٹھ جاتے اور پھر گڑھے کو برابر کر کے اُٹھ آتے۔

عورتوں نے کچھ دیر تک تو گھیرا ڈال کر پردے کا بندوبست کیا مگر فراغت کی خواہش مندوں ایک لمبی قطار کو دیکھ کر وہ بھی ایک طرف ہو گئیں اور یوں فراغت کے لیے بیٹھی عورت جب سب کے سامنے آ ہی گئی تو پھر کھل کر فارغ ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اُس کی دیکھا دیکھی منتظر عورتیں بھی ایک قطار کی صورت بیٹھ گئیں اِس احساس سے قطعی لاتعلق کہ کون دیکھتا ہے اور کون نہیں دیکھتا۔ وہاں کچھ ایسے نوجوان بھی تھے کہ جن کی زندگی کا ''عشق بُتاں'' کا دور نصف النہار پر تھا۔ اُنہوں نے ایک سے بڑھ ایک حسین عورت کو اِس طرح سرِ عام حاجت سے فراغت پاتے دیکھا تو اُبکائیاں کرتے کرتے منہ پیٹ کر رہ گئے۔ اِن میں مُلا بخشو بھی شامل تھا۔ اُس نے عورت کو اِس طرح دیکھنے کا تصور تک نہیں کیا تھا مگر یہ بات اور کہ کچھ دیر بعد وہاں حملہ

آور ہو چکی مکھیوں کی شدید بھنبھناہٹ کے باوجود قطار میں بیٹھ کر فراغت پانے والے مردوں میں وہ بھی شامل تھا۔

پیٹ ہلکا ہوا تو بھوک کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ لیکن وہاں بھوک مٹانے کے واسطے کسی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اتنے میں آسمان پر کالی گھٹا اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی چبھتی ہوئی دھوپ کی جگہ ملہار ہوا اور تیز بارش نے لے لی۔ تیز بارش کے سبب جہاں ریت کی اوپری سطح کے اندر ڈھکا ہوا پاخانہ باہر نکل کر بدبو مچانے لگا وہاں یہ خدشہ بھی پیدا ہو گیا کہ بارش اگر کچھ دیر اور نہ تھمی تو ریت کا ٹیلہ کُھر کر پانی میں بہہ جائے گا۔ اِس کا نتیجہ یقینی موت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ ابھی بارش تھمنے کے کچھ آثار ہی نہیں تھے کہ طوفانی بارش کے ساتھ شدید ژالہ باری شروع ہو گئی۔ لوگوں نے بے اختیار دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا لیے۔ بارش اور ژالہ باری موت کا یقین کر چکے لوگوں میں ایک بار پھر موت کا خوف پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ عجب کھیل تھا کہ موت یہاں اُن کے اجسام میں زندگی جگانے کا فریضہ انجام دینے پر مامور ہوئی پھر رہی تھی۔

دم توڑتی بارش کے درمیان وقفے وقفے سے ہونے والی ژالہ باری نے انسانوں کو اپنی بے حیثیتی اور بے وقعتی کا ایک اور نظارہ دکھا دیا۔ کبھی فالسے اور کبھی بیر کے سائز کے اولے بدن میں چھید اور سر کی ہڈیوں کو توڑنے کو لپکتے تو وہاں موجود مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے نیچے چھپنے کی کوشش کرتے اِس بات کی پروا کیے بغیر کہ پناہ کون ہے اور پناہ خواہ کون ہے۔ نفسا نفسی کا یہ عالم کہ جنہیں ڈھال بنایا جا رہا ہوتا وہ پل بھر میں اپنے نیچے پناہ لیے ہوئے جسموں کو نیچے سے نکال کر اپنے اوپر تان لیتے یہ سوچے سمجھے بنا جس جسم کو وہ اپنے نیچے سے نکال کر اپنے اوپر تان رہے ہیں وہ کسی مرد کا ہے، عورت کا ہے یا کسی بچے اور بوڑھے کا۔ جسموں سے منسوب سبھی حسیات آسمان سے برسنے والی برف کے ساتھ ہی منجمد ہو چکی تھیں۔ اپنی اپنی جان بچانے کے اِس عمل میں عورت کا جسم نسوانی کشش سے محروم اور مرد ذات کی مردانہ فعالیت کیچوا صفت ہو چکی تھی۔ آسمانی مصیبت کی یلغار کے سامنے ہونے والی آپا دھاپی میں بھی طاقتور اور کمزور

کا اصول لاگو ہونے لگا تھا۔ جہدِ بقا کی اِس چھینا جھپٹی میں جوں ہی کوئی لاغر بدن کسی کے ہاتھ لگتا، وہ اُس کی چیخ و پکار کی پروا کیے بغیر اِس طور اپنے اوپر تان لیا جاتا کہ بچ رہنے کی ہمت اگر رکھتے ہو تو بچ رہو، ورنہ یوں ہی تنے رہو۔

بارش اور ژالہ باری تھمی تو لوگوں کے لہو میں ناچتی ہوئی حیوانیت بھی تھم سی گئی۔ وہ واقعتاً ایک دوسرے کے اندر سے باہر نکلنے لگے۔ جن لوگوں نے اپنے اوپر کسی مریل سے جسم کو تان رکھا تھا اُسے ایک طرف پھینکا اور ادھ موئے انداز میں نیچے سے اُٹھ کر سانس بحال کرنے لگے۔ اُنہیں اِس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ جسے ڈھال بنا کر اُنہوں نے خود کو ژالہ باری سے بچایا ہے، وہ بھی سلامت ہے یا مر گیا؟ کچھ لوگ ایسی عورتوں کو بھی ڈھال بنا کر اُن کے نیچے چھپے رہے جو کسی وجہ سے پہلے ہی نہ مرے ہوؤں میں تھیں اور نہ زندوں میں۔ ایک سے زیادہ لوگوں کے سروں کی پناہ گاہ بنی یہ عورتیں جب اپنے اوپر سے اُتار کر ایک طرف پھینکیں گئیں تو اتنا بھی نہ کیا گیا کہ انہیں انسان گردانتے ہوئے اُن کا جینا مرنا ہی معلوم کر لیا جاتا۔

ایسی ہی ایک لاش نما عورت کے کندھے کے نیچے اپنی گردن دبکائے مُلا بخشو باہر نکلا تو اُسے اپنے بچوں کی فکر ہوئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھنا دوڑنا شروع کیا تو سب سے پہلے اپنے گیارہ بارہ برس کے بیٹے کو بے سُدھ پڑا ہوا پایا جس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اُس کی طرف لپکا۔ اُس کی حالت بتا رہی تھی کہ اُسے چند لمحے پہلے کی ژالہ باری میں بطور انسانی ڈھال استعمال کیا گیا ہے۔ مُلا نے جلدی سے اُس کی نبض دیکھی تو سکون ہوا کہ بچہ ابھی زندہ تھا۔ وہ اُسے ہوش میں لانے کے لیے اُس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور پاؤں کے تلوے ملنے لگا۔ کچھ نہ بنا تو اُسے راستے سے اُٹھا کر ایک طرف لے گیا مگر ٹیلے پر تو ہر جگہ ہی راستہ بنی ہوئی تھی۔ وہ اُسے مزید کچلے جانے سے بچانا چاہتا تھا مگر دور نزدیک کوئی جگہ بھی ایسی نہ تھی کہ جہاں وہ اُسے اُٹھا کر لے جاتا۔ جگہ جگہ انسانی فضلہ اور جگہ جگہ بیٹھے، لیٹے اور پھر سے آہیں بھرتے اور کُرلاتے لوگ جن میں اکثریت اُن کی تھی جو بطور انسانی ڈھال استعمال ہوئے اور اب ہولے ہولے ہوش میں آ رہے تھے۔ ایسے میں کچھ دور دور واقع ٹیلوں سے جان بچائے جانے کی فریادیں آنے لگیں کہ اُن کے

نیچے کی ریت بہت تیزی سے کُھرنے لگی تھی۔

آس پاس کے ٹیلوں پر مُلا کی نگاہ گئی، اُس نے ہر ایک ٹیلے پر لوگوں کے ہجوم دیکھے تو بے اختیار اُس کی آنکھوں کے سامنے گھر کے باقی لوگوں کے چہرے گھوم گئے۔ اُسے لگا کہ یہ وہی ہیں جو دور دور کے ٹیلوں سے آوازیں دے کر اُسے بُلا رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کے ٹیلے کے نیچے کی ریت پانی میں کُھرتی چلی جا رہی تھی۔ دفعتاً اِن چہروں کے عقب میں سے سَنگری کا چہرہ ظاہر ہوا۔ وہ اپنے چہرے کے تاثرات ہی سے اُسے پھٹکارے جا رہی تھی کہ ''بس یہی تھا وہ سب کچھ! پانی کی ایک چھل کی مار؟ اُس کے بعد تو کون اور میں کون؟ کیا خبر بھی لی کہ میں کون سے ٹیلے پر ہوں؟ کچھ پتا بھی ہے کہ میرا امُنّو کہاں گیا؟ میرے ٹیلے کے نیچے کی ریت بھی کُھرتی چلی جا رہی ہے۔'' اِس کے ساتھ ہی مُلا بخشو کے کانوں میں بچاؤ بچاؤ کی آوازوں کا شور سیلاب کہ لہروں کی مانند بلند ہوتا چلا گیا۔ دیگر ماؤں کے چہروں کے ساتھ چپکا ہوا اُس کی ماں کا چہرہ، بہنوں کے چہرے، بھائیوں کے چہرے، انہیں پیچھے دھکیلتے ہوئے بیوی اور بچوں کے چہرے اور اِن سب کے عقب میں اُچھل اُچھل کر اُبھرتا ہوا سنگری کا چہرہ، آپس میں گڈمڈ ہوتے چہرے، ایک دوسرے کے اوپر مکھوٹوں کی مانند لگتے اُترتے چہرے، پریشان چہرے، حیران چہرے، روتے چہرے، چیختے چلاتے اور آہیں بھرتے چہرے، چھوٹے چہرے، بڑے چہرے، کبھی ظاہر اور کبھی معدوم ہوتے چہرے مُلا کی آنکھوں میں دھرتال ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔ مُلا کو لگا کہ اُس کے اپنے ٹیلے کے نیچے سے ریت کُھرتی جا رہی ہے۔ وہ اپنے باقی بچوں کو ڈھونڈنے کے لیے لپکا اور چلایا کہ اِس ٹیلے کی ریت بھی پانی میں کُھرتی چلی جا رہی ہے۔

ٹیلے پر پھر سے آپا دھاپی شروع ہو چکی تھی۔ مرد و زن گردنیں جھکا جھکا کر نیچے ٹیلے کی ریت کو دیکھنے لگے تھے۔ ٹیلے کے اطراف پھیلا ہوا پانی آٹھ سے دس فٹ تک تو گہرا رہا ہوگا۔ اِس میں تیرتا ہوا گھریلو سامان، مال مویشیوں اور انسانوں کی لاشیں دور دور تک پھیل چکی تھیں۔ صبح کاذب کے وقت دکھائی دینے والی انسانی لاشوں پر اب جانوروں کی لاشوں کا گماں ہونے لگا تھا۔ اوپر سے نیچے جھانکنے والوں کو چکر آنے لگے تو کسی کو نیچے کی ریت کُھرتی اور کسی کو پانی اُترتا ہوا

محسوس ہونے لگا۔ اتنے میں کسی نے آواز دی کہ ٹیلے کے نیچے بھی ریت ہی ہے۔ ابھی ایک آدھ پہر میں یہ ریت ساری کی ساری چھل کو چوس لے گی اور پانی اُتر جائے گا۔ مُلا بخشو کو یاد آیا کہ صوبیدار سمیت سیلاب کے پانی کی سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کا بھی یہی خیال رہا تھا کہ سیلاب آنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ریت کے ٹیلوں کے نیچے بھی ریت ہے اور آس پاس چار چھیر کی زمین میں بھی تہہ در تہہ ریت ہی ہے لہٰذا پانی کی ایک آدھ چھل چاہے جتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو چند گھنٹوں میں ریت کی تہوں میں جذب ہو جائے گی۔ لیکن حقیقت حال مختلف ہو چکی تھی۔ اُن سیانوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ضروری نہیں کہ ریت کے ٹیلوں کی درمیانی زمین بھی تہہ در تہہ ریت رہی ہو یا ایک کے بعد کوئی دوسری چھل نہیں آئے گی۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ پانی کی دو اونچی لہروں کے بعد پیچھے سے پانی کا دباؤ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا جس کے سبب زیرِ آب آ چکے علاقوں میں اُس کی سطح بھی بلند سے بلند تر ہوئی جا رہی تھی۔

یکا یک مُلا بخشو کو خیال آیا کہ یہ لوگ تو دریا کے مُن کے لوگ ہیں۔ صدیوں سے اِسی بستی کے رہنے والے جو دریا کنارے آباد چلی آ رہی ہے، اِن میں سے ہر ایک تارا ہے، کوئی کم اور کوئی زیادہ مگر تیرنا جاننا ضرور ہے۔ تو پھر آج اِن کو کیا ہو گیا؟ کیا تیرنا بھول گئے یا اِن کے دماغ شَل ہو گئے اور یہ حوصلہ چھوڑ بیٹھے۔ پھر خیال آیا کہ یہ لوگ تیرنا نہیں بھولے بس داروغہ کی یقین دہانی پر مارے گئے ہیں کہ چھل آج نہیں آنے والی۔ ویسے بھی گھروں میں سوئے ہوئے لوگوں پر اچانک پندرہ بیس فٹ اونچا پانی پھر جائے تو کسے تیرنا یاد رہتا ہے؟ اُس کے بعد رہی سہی کسر بارش اور ژالہ باری نے پوری کر دی کہ اُن کے اعصاب شَل کر کے انہیں انسان سے حیوان بنا ڈالا۔ تیرنا تو مولوی بخشو کو بھی آتا تھا لیکن وہ اکیلا اپنے بچوں کو چھوڑ کر تیر کر جائے بھی تو کہاں جائے کہ گھر سبھی پانی میں ڈوبے ہوئے اور محفوظ پناہ گاہ سمجھی جانے والی ملتان کو جانے والی سڑک بھی اچھی بھلی دور کہ وہاں تک محض تیر کر نہیں جایا جا سکتا تھا۔ غالباً یہی سوچ اگر آئی ہو گی تو وہاں موجود ہر اُس شخص کے ذہن میں آئی ہو گی جس کے سوچنے کا عمل بحال ہو چکا تھا۔

بارش تھمنے کے باوجود بادلوں نے ابھی تک آسمان کو خالی نہیں کیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا

تھا کہ بارش پھر سے آئی اور ابھی آئی۔ اِس دوران اُس کے کھو جانے والے باقی تینوں بچے بھی مل چکے تھے مگر کوئی اولوں سے زخمی تو کوئی لوگوں کے پاؤں تلے کچلا ہوا۔ ایسے میں مرہم پٹی کا یارا کسے ہوتا کہ جب دن کا دوسرا پہر چڑھ جانے کے سبب ہر کوئی بھوک سے بے حال۔ بچوں کو صبر کا یارا نہ رہا تو رونا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ مُلا بخشو نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی، حدِ نگاہ تک پانی ہی پانی تھا اور اِس بیچ پندرہ بیس کھمبیوں کی طرح اُگے ہوئے ٹیلے کی جن کی چوٹیوں پر بستی کی درماندہ مخلوق پناہ لیے ہوئے تھی۔

بھوک بڑھی تو لوگوں کی آنکھوں میں دید کے ساتھ ایک دوسرے کی پہچان بھی اُترنے لگی کہ بھوک ہجوم میں ہو تو اِس کا مٹانا انفرادی فعل نہیں رہتا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بھوک ہی وہ احساس ہے جو جان دار کو زندہ ہونے اور زندہ رہنے کی خواہش سے آشنا کیے رہتا ہے جب کہ اِس کے برعکس جنسی عمل کی رغبت اور اُسے کر گزرنے کی تمنا اُسے اُس فطری فریضے سے جوڑے رہتی ہے جو نسلوں کے تسلسل کے لیے ودیعت ہوا ہے۔ یہ رغبت اگر ہجوم میں ہو تو مقصد نسلی تسلسل نہیں بلکہ جبلت کی تشفی رہ جاتا ہے۔ جنس بطور فطری فریضہ فرد سے فرد تک محدود۔

مُلا بخشو بھی اپنی اور اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کے واسطے اُتنا ہی بے بس تھا کہ جتنا ٹیلے پر موجود کوئی دوسرا شخص ہو سکتا تھا۔ بھوک کی اِس بے رحمانہ طلب نے مُلا بخشو کے دل سے دُکھ اور عمیق اذیت کے وہ سارے احساسات کھرچ ڈالے تھے جو چند لمحے پہلے اپنے دیگر پیاروں کی گم شدگی کے سبب آنسو بن کر اُس کی آنکھوں ہی کو نہیں بلکہ روح تک کو گھائل کر رہے تھے۔ بس اب وہی کچھ تھا جو آنکھوں کے سامنے تھا، جو نگاہوں سے اوجھل تھا وہ نہیں تھا۔ اتنے میں ایک بوڑھے شخص نے آواز لگائی۔ ''سب اندھے ہو گئے ہو کیا؟ یہ دریا کی من پر رہنے والوں کی بستی ہے ... تارے ہو سب! کیا تیرنا بھول گئے؟'' ۔ ایک اور آواز کہیں سے آئی۔ ''نہ ہی تیرنا بھولے ہیں اور نہ ہی اندھے ہیں.... اگر اِس پانی میں کود بھی گئے تو جائیں گے کہاں؟ کتنا تیر لیں گے.... جہاں تک نگاہ جاتی ہے پانی ہی پانی ہے! کہیں کوئی خشکی دکھائی دے تو پانی میں کود یں، اُن بچوں کو بھی مروا دیں جو بچ گئے ہیں؟'' آخری الفاظ تک آتے آتے اُس کی آواز بھرا گئی اور گلا رُندھ گیا۔

پہلا بوڑھا پھر چیخ کر بولا۔ ''حرام زادو! میں نے اندھے ہونے کی بات کی ہے... تم تو واقعی اندھے ہو.... ٹھیک ہے تم پہ اور تمہارے تارے ہونے پر بھی... میں نے اِس سے بھی بڑی چھل دیکھی ہوئی ہے جب میں ایک چولے میں ہوا کرتا تھا۔ اُس وقت کے جوانوں نے تو ایک بندہ کیا ایک ڈھانڈا نہیں مرنے دیا تھا اور تم یہاں ٹیلے پر بیٹھے مرنے کا انتظار کر رہے ہو کہ کب ریت گُھرے اور سارے کے سارے مر جائیں؟''

''تو پھر کیا کریں؟'' اب کے کوئی قریب سے مگر غصے سے بھری ہوئی آواز میں دھاڑا۔

''تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ نیچے پانی میں کتنے لکڑی کے پھٹے تیرتے پھر رہے ہیں؟ ہر ٹیلے سے دو دو جوان بھی پانی میں اتریں اور اِن پھٹوں پر تیر کر پتن پر بندھی ہوئی کشتیاں کھول لائیں تو پھر ملتان والی سڑک یہاں سے کتنی دور ہے۔ یہ سڑک دریا کے بند پر بنی ہوئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ پانی وہاں نہیں چڑھا ہوگا۔'' اونچا بولتے بولتے بوڑھے کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

''اور اگر سڑک پر بھی پانی ہوا تو پھر؟'' کسی اور نے لقمہ دیا۔

''اڑے کوئی جگہ تو ہوگی جہاں پانی نہیں ہوگا... کشتی میں ہو تو بندہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاتا ہے۔'' اب کی بار بوڑھے کے گلے سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔

''مگر پتن تک پہنچیں گے کیسے؟ راستہ کیسے ملے گا؟'' ایک اور شخص منمنایا۔

''کتنی بڑی بستی ہے یہ؟ کتنے ٹیلے اور کتنے پتن ہیں یہاں؟ اڑے حرام زادو! یہاں سے نکلو گے تو راستہ ملے گا نا.... یہاں بیٹھے بیٹھے چوت چالاکیاں کرتے رہے تو سارے مرو گے۔ اب تو پھر بھی ہڈ بازو میں دَم ہوگا، ہاتھ پیر چلا لو گے.... شام تک یہ بھی نہ رہا تو کیا گانڈ سے چپو چلاؤ گے؟'' بوڑھا نوجوانوں کے رویے سے اتنا مایوس ہوا کہ کھانستا کھانستا دوہرا ہو کر ریت پر گر گیا۔ اتنے میں نیچے گہرائی سے یکے بعد دیگرے چھپاک چھپاک کی تین آوازیں آئیں۔ سب نے جلدی جلدی نیچے جھانکا کہ کون پانی میں گرا جس کی سطح پہلے سے بھی ایک ہاتھ بلند ہو چلی تھی۔ مگر چھپاک چھپاک کی یہ آوازیں ٹیلے پر پناہ گزیں مرد وزن کے لیے نئی زندگی کا پیغام تھیں۔ تین اچھے خاصے تگڑے نوجوان سیلاب کے مسلسل بلند ہوتے پانی میں چھلانگ لگا کر مہارت سے

تیرتے ہوئے لکڑی کے اُن تختوں کی طرف بڑھ رہے تھے جو سیلابی ریلے کے ساتھ نجانے کہاں سے بہے چلے آ رہے تھے۔

کھانسی سے دوہرے ہو چکے بوڑھے کے کانوں میں داد و تحسین کی آوازیں آئیں تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر ناقابلِ بیان خوشی کے تاثرات تھے کہ جیسے زندگی لوٹ ہی نہ رہی ہو بلکہ لوٹ چکی ہو۔ اُس نے پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں قریب کے ٹیلے کے لوگوں کو آوازیں دینا شروع کر دیں کہ وہ بھی ہمت کریں اور پتن سے جتنی ہو سکیں، کشتیاں لے آئیں۔

# ۴۵

تین دنوں میں ٹیلوں پر پناہ لیے ہوئے بستی کے مکین آٹھ کشتیوں کے مسلسل پھیروں کے بعد بمشکل ملتان روڈ تک پہنچائے جا سکے جو سیلاب کے پانی سے جانبِ بستی تین فٹ نیچے تک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی مگر اس کی مخالف سمت پانی کی سطح زمین کی سطح سے کوئی تین چار فٹ بلند رہی ہوگی۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو ٹیلوں سے یہاں تک لانا جتنا سہل سمجھا جا رہا تھا وہ اُتنا بھی سہل ثابت نہ ہوا۔ اِن تین دنوں میں بھی پانی کی مسلسل بلند ہوتی ہوئی سطح اور ٹیلوں کے نیچے سے کُھرتی ہوئی ریت نے کشتیوں کو وہاں تک لے جانا اور اِدھر سڑک تک لے آنا مشکل بنا دیا تھا۔ اِس پر سوا کئی بار ہو چکی بارش، خوفناک ہو چکی بھوک اور پھیلتی ہوئی بیماریوں نے انسانی زندگیوں کا باقی رہنا ایک چیلنج بنا دیا تھا۔ کشتیوں سے لوگوں کو ملتان روڈ کی طرف لاتے ہوئے دو بار کشتیاں اُلٹ بھی گئیں جس کے نتیجے میں دو مرد، پانچ عورتیں اور تین بچے زندگی کی طرف آتے آتے موت کے راہی ہو رہے۔ اِن میں وہ بوڑھا بھی شامل تھا جس کے ہمت بڑھانے پر ٹیلوں پر پناہ لیے ہوئے لوگوں کا سیلاب کے گھیراؤ سے نکلنا ممکن ہو سکا تھا۔ سڑک پر پہنچ رہے لوگوں میں زندگی کے یقین کے بعد شدید ترین احساس اگر کوئی تھا تو وہ بھوک کا تھا۔ اُنہوں نے اپنے کھوئے ہوئے پیاروں کی تلاش میں بھی نگاہ پانی کی ایک بوند یا روٹی کے ایک نوالے پر رکھی ہوئی تھی کہ سنا تھا قریب کی کچھ محفوظ بستیوں کے لوگ پانی اور خوراک لے کر وہاں پہنچنے والے ہیں۔ جوں جوں اِس جستجو میں

کسی کو اپنے بچھڑے ہوئے ملتے جاتے توں توں وہاں گلے مل کر روتے ہوؤں کو دیکھنے والوں کا ایک ہجوم سا اکٹھا ہو جاتا۔ جن کے پیارے اپنے پاس تھے یا مل چکے تھے اُن کے لیے اِس قسم کے منظروں میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

مُلا خاندان سے ابھی تک کوئی بھی بخشو کو نہیں مل پایا تھا۔ یہ اتفاق تھا یا کشتی والوں کا اغماض کہ اُسے سب سے آخری پھیرے میں ٹیلے سے نکالا گیا کہ جب آدھے سے زیادہ ٹیلہ ایک جانب سے پانی میں گھر چکا تھا۔ اُس کے ملتان روڈ پر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ بستی کی خلقت اپنے اپنے جھگے بنا کر دو تین کوس تک سڑک پر پھیل چکی تھی۔ خالی کشتی والے ٹیلوں سے لوگوں کو نکالنے کے لیے آتے ہوئے دو تین بار اپنے ساتھ پکے ہوئے سیلے چاولوں کا تھیلا بھی ساتھ لاتے رہے تھے جو آس پاس کے لوگ انسانی ہمدردی میں وہاں تقسیم کرنا شروع کر چکے تھے۔ ہر بار تین چار نوالے مُلا اور اُس کے بچوں کو بھی ملتے رہے جس کے سبب وہاں سے نکلنے تک گزران چلتی رہی۔ اب بھی یہی حال تھا جس طرف سے کچھ خوراک آنے کا امکان ہوتا، تگڑے اور تنومند مرد اور عورتیں اُسی طرف مورچہ لگا کر بیٹھ جاتے اور جوں ہی کسی دیگ یا دال روٹی کے پتیلوں کا کھڑکا رسُنائی دیتا تو آن ہی آن میں جھپٹ لیتے۔ یوں آگے کی طرف کھانا پہنچ پانے کا امکان ہی ختم ہو جاتا۔

مُلا بخشو بھی اپنے گھر والوں کی تلاش میں ایسے ہی کئی مورچوں سے گزرتا ہوا خاصا دور تک جا چکا تھا مگر بستی کے بکھرے ہوئے لوگوں کا سلسلہ ابھی ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔ لوگوں کے کپڑے پانچ دن کی میل اور پسینے سے متعفن ہو چکے تھے۔ ایک دوسرے کے جسموں سے اُٹھنے والی بدبو اُس تعفن سے سوا تھی جو سیلابی پانی میں تیرتی ہوئی انسانی اور جانوروں کی لاشوں سے اُٹھ رہا تھا۔ اِس پر قیامت رات کو مچھروں کی یلغار اور دن میں مکھیوں کی بھرمار۔ بستی کے شرفا کے ایسے خاندان کی خواتین بھی سڑک کی گرد میں خوار ہو رہی تھیں کہ جنہیں کبھی کسی نے بے پردہ نہیں دیکھا تھا۔ ایسا ہی ایک خاندان مُلا بخشو کا تھا کہ کہیں آخر میں جا کر جب اُسے اپنے زنان خانے کی عورتیں نہ صرف بے پردہ بلکہ بدحالی میں دکھائی دیں تو اُسے کچھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ اُنہیں دیکھ کر پہچانے، گلے ملے، دھاڑیں مار مار کر روئے یا یہیں سے کہیں بھاگ جائے یہ گماں کر کے کہ

وہ سب کے سب مر چکے ہیں۔ اپنی خواتین کو پھٹے ہوئے لباس میں نیم برہنہ ایک دوسرے میں منہ چھپائے دیکھ کر اُس میں ہمت نہ رہی کہ آگے بڑھ کر اُن سے مل پاتا۔ مگر اُس کے ساتھ زندہ بچ جانے والے چاروں بچوں نے اپنی ماں اور باقی گھر والوں کو پہچانتے ہی اُن کی جانب دوڑ لگا دی اور گلے مل کر رونے لگے۔ مُلا خاندان کے لوگ جب زندگی کے اِن پانچ دنوں کے مصائب کا احوال کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ اُن کی حویلی میں واقع گھروں میں سے کسی گھر کا کوئی چھوٹا بچہ سلامت نہیں رہا سوائے اِن چار بچوں کے جو ڈِتن کے ساتھ سیلابی ریلے سے بچ نکلے تھے۔ مُلا ڈِتن اور اُس کے خاندان پر ملاپ کی یہ رات بہت بھاری ہو کر گزر رہی تھی۔ دونوں جانب کے بچھڑے ہوؤں نے اپنے پیاروں کے بارے میں جو جو امیدیں باندھ رکھی تھیں، وہ ٹوٹ چکی تھیں۔ پہلی رات کی چھل کے زخم یوں تازہ ہوئے کہ کسی کل چین نہ رہا۔ اِسی اضطراب میں مُلا ڈِتن کو سنگری اور اُس کے بیٹے مَنّو کا خیال آیا تو جیسے دل کو کسی نے مُٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ وہ تو اِن پانچ دنوں میں اُسے کہیں دکھائی نہیں دیے تھے۔

اگلے روز صبح ملتان سے محکمہ مال کے افسروں کا ایک قافلہ وہاں پہنچا جن کے ساتھ کچھ طبیب، وافر مقدار میں سلے ہوئے کپڑے، خیمے، مچھر دانیاں، پکے ہوئے کھانے کی دیگیں اور کچا راشن بھی تھا۔ افسر صاحبان کا کیمپ آفس ترتیب دیے جانے کے بعد محکمہ مال کا ایک ہرکارا اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے اونچی آواز میں مولوی اللہ بخش کا نام پکارنے لگا۔ مُلا جو لوگوں کے ہجوم میں کھڑا اِن لوگوں کو حیرت اور اُمید سے ندیدوں کی طرح دیکھ رہا تھا، پریشان ہو کر آگے ہونے کی کوشش کرنے لگا مگر آگے کھڑے ہوئے لوگ اُسے راستہ نہیں دے رہے تھے۔ مُلا کا نام کئی بار پکارے جانے کے بعد بھی جب وہ آگے نہ جا سکا تو ہرکارا سر جھکا کر ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذوں میں کچھ اور نام پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مُلا بخشو نے ہجوم کے عقب سے ہاتھ ہلا ہلا کر ہرکارے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی اور آخر دیکھ لیا گیا۔ اہلکار آگے بڑھا اور اُس کا ہاتھ کھینچ کر اُسے سامنے لے تو آیا مگر اُس کی ظاہری وضع دیکھ کر یقین نہ کرنے والے لہجے میں بولا۔ ''آپ ہو بستی کی سب سے معزز شخصیت مولوی اللہ بخش؟'' مولوی نے اُس اہلکار کی آنکھوں میں اپنے لیے بے

اعتباری دیکھی تو سَر جھکا لیا۔ ہجوم کے لوگوں نے مُلا بخشو کو غور سے دیکھا تو پہچانتے ہوئے بولے ''ہاں یہی ہے مولوی اللہ بخش۔ مگر اب تک تھا کہاں؟ ہم تو اِسے نہیں پہچان پائے تھے!''

اہلکار نے ہجوم کی بات سُنی مُلا بخشو کو لے کر دور ایک خیمے میں بیٹھے ہوئے افسر کے پاس لے گیا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے بعد واپسی ہوئی تو مولوی نہ صرف خود صاف سُتھرے لباس میں تھا بلکہ محکمہ مال کے واجب الارض کے مطابق اُسے بستی کا سب سے معزز اور نیک نام فرد ہونے کے ناتے متاثرین سیلاب کی بحالی کے تمام انتظامات کا سربراہ بنا دیا گیا تھا۔ اُس کی مدد کرنے کو محکمہ مال کا عملہ، طبی سہولت کے واسطے طبیب، دھوبی، باورچی اور کئی مددگار موجود تھے۔ مُلا نے محکمہ مال کے ایک بڑے اہلکار کے ذریعے بستی کے کچھ دانا اور اشراف لوگوں پر مشتمل کمیٹیاں بنا کر اُنہیں مختلف کام سونپ دیے۔ سب سے پہلے کھانا پکوانے اور اُسے تقسیم کرنے والی کمیٹیوں کو متحرک کیا گیا تا کہ بروقت کھانا بہم پہنچایا جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ عورتوں، مردوں اور بچوں کی گنتی اور اُن کی فہرستیں بنانے کے علاوہ اُنہیں کپڑوں کی فراہمی کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ خاندان شماری کے نتیجے میں خیموں اور مچھر دانیوں کی فراہمی یقینی ہو چکی تو طبیبوں نے ایک ایک خیمے میں جا کر بیمار افراد کو ادویات پہنچانے کے علاوہ اُن کا ریکارڈ مع بیماریوں کی نوعیت کے مرتب کرنا ممکن بنا دیا۔ متاثرین کے پرانے کپڑے جو زیادہ تر خارش کا باعث بن رہے تھے انہیں صفائی کرنے والے عملے کے ذریعے اچھا خاصا دور لے جا کر جلایا جانے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شام سے پہلے بے ہنگم ہجوم کی جگہ ملتان روڈ پر خیموں کا شہر آباد ہو چکا تھا۔ پانچ دنوں کی پریشانی اور ذلالت اور آج دن بھر کے کاموں کی نگرانی کی خجالت نے مُلا بخشو کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ لیکن پھر بھی بدن چور چور کر دینے والی تھکاوٹ اس لیے ایذا رساں نہیں تھی کہ بستی میں اُس کی نمبر ایک کی حیثیت اپنی تمام تر پہچان سمیت بحال ہو چکی تھی۔ مُلا بخشو حیران ضرور تھا کہ یہ ناموری اور پہچان کا معاملہ ہے کیا؟ وہ کون سے عوامل تھے کہ جنہوں نے اُس کے خاندان کی صدیوں کی رفاقت کے باوجود پل بھر میں اُسے بستی بھر کے لیے اجنبی اور پھر اُسی طرح پَل بھر میں عزیز تر بنا دیا تھا۔ اُس کی بے وقعت کر دی گئی شخصیت اچانک ہی باوقعت ہو گئی اور اُس کی یاوہ گوئی

پر محمول ہو چکی گفتگو پلک جھپکتے ہی پُر مغز اور حکم کا درجہ اختیار کر گئی۔

اگلی صبح مُلا قدرے بشاش طبیعت کے ساتھ بیدار ہوا تو اپنے چچازاد کو اُٹھا کر کہا کہ جتنی بلند ہو سکے، اذان کہے۔ کئی دنوں کے بعد اذان کی آواز سنائی دی تو لوگ خود بخود بیدار ہوتے چلے گئے۔ عجیب سی کیفیت تھی کہ ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ کسی کی آنکھوں میں واپس زندگی کی طرف لوٹنے کے شکرانے کے آنسو تو کسی کی آنکھوں میں اُن پیاروں کی یاد کے آنسو جنہیں اس قدرتی آفت نے اس طرح اُن سے جدا کیا کہ ابھی تک اُن کی تدفین کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔ نہیں معلوم تھا کہ کس کی لاش کہاں پانی میں تیر رہی ہے یا پھر کہیں کسی جھاڑی میں اَٹکی ہوئی یا منہدم ہو چکے کچے مکانوں کے ملبے تلے دبی ہوئی ہے۔ سڑک کنارے باجماعت نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند ہوئے تو روتے روتے لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ عورتیں الگ اپنے اپنے خیموں میں آہ و بکا کیے جا رہی تھیں۔ اب تک کی تیار شدہ فہرست کے مطابق سو سے زائد لوگ جن میں اکثریت بچوں کی تھی، لاپتہ پائے گئے تھے۔ دعا کراتے ہوئے مُلا بخشو بھی آبدیدہ تھا کہ صرف اُس کے خاندان کے نو بچے لاپتہ تھے۔ دعا ہو چکی تو اُسے سنگری اور مَنّو یاد آئے کہ جن کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اُس نے بے اختیار ہو کر دوبارہ ہاتھ دعا کے لیے اُٹھا لیے۔ اب کے وہ زیرِ لب اُن کی سلامتی اور عافیت کے واسطے دعا گو تھا۔

نماز کے بعد مُلا بخشو نے طے شدہ پروگرام کے مطابق کھڑے ہوئے سیلابی پانی سے لاشیں نکلوا کر اُن کی تدفین کا بندوبست کرنا تھا۔ اِس کام کے لیے دس کے قریب تارے جوان تیار کیے گئے اور پندرہ سے زائد جوانوں کو قبروں کی کھدائی کا کام سونپا گیا۔ حیرت انگیز طور پر بستی کا نیا بنایا گیا قبرستان، باقی بستی کی زمین سے بہت اونچا اور لگ بھگ سڑک کے برابر تھا اِس لیے سیلابی ریلا یہاں تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ کچھ لوگوں کے فریضے میں نکالی گئی لاشوں کا غسل اور تجہیز و تکفین شامل تھے۔ اِن کاموں سے فراغت کے بعد وہ خود بھی بستی کے متاثرین کا احوال جاننے کے واسطے محکمہ مال کے عملے کو ساتھ لے کر پھر سے بستی کی جانب چل دیا۔ لیکن دل میں کہیں نمایاں ترین خواہش سنگری کو ڈھونڈ نکالنے کی تھی۔

مُلا بخشو کو ایک ایک خیمہ پھرتے ہوئے سیلاب جیسی آفت کے نازل ہونے کے بارے میں لوگوں کی عجیب وغریب توجیہات سننے کا موقع ملا۔کوئی کہہ رہا تھا کہ سیلاب کی اچانک آمد کے پیچھے انگریزوں کی سازش کارفرما ہے جونہیں چاہتے تھے کہ یہ بستی اور یہاں کے لوگ اُن کے عزائم میں مزاحم ہوں۔ کچھ کا خیال تھا کہ اِس مقصد کے لیے بستی کے لوگوں کو داروغہ کے ذریعے اگلے دن کا جھانسا دے کر پانی کی رفتار کو چھپایا گیا جو اُسی شب بستی کو اپنی لپیٹ میں لینے والا تھا۔ضرور اِس پُل کی آڑ میں کوئی ایسا کام کیا جارہا ہے جس کے واسطے گوروں کو یہ بستی اِس مقام پر نہیں چاہیے تھی۔کئی لوگ اِس آفت کو سات شہیدوں کی قبروں کی بے حرمتی سے جوڑ رہے تھے۔انہیں یقین تھا جس جگہ سے شہیدوں کی مقدس لاشوں کو غائب کیا گیا ہے وہاں اب کوئی بستی قائم نہیں رہ سکتی۔کچھ کا تبصرہ تھا جس روز پیر زندہ کرامت کے عرس کو روکا گیا تھا اور بستی میں مختلف حیلوں بہانوں سے ناحق خون خرابہ ہوا تو یقین ہوگیا تھا کہ دریا اِس بستی کو کھا جائے گا،سوکھا لیا۔

مُلا بخشو کے سامنے موت کا منظر ذرا سا دھندلایا تو دنیاوی معاملات پھر سے نمایاں ہو کر روبرو ہونے لگے۔وہ پریشان تھا کہ اُس کے خطابات کے وہ سارے موضوعات جو اُس نے سیلاب کا پانی اُترنے کے سال دوسال بعد تک بستی والوں کو سُنا سُنا کر اُنہیں ذہنی طور پر مصروف کیے رکھنا تھا وہ ابھی سے بحث مباحثوں میں کیوں آگئے اور وہ بھی سب سے نچلی عوامی سطح پر۔ذرا سوچیں کہ جب اچانک سیلاب کے پیچھے انگریز سرکار کی سازش والی کہانی پر یقین کرتے ہوئے بستی والے آتش فشاں بن کر ستلج پُل کی تعمیر رکوادیں گے تو وہاں دوبارہ کام شروع کرانے کے لیے انگریز دربار میں اُس کے درجات کیسے نہ بلند ہوں گے۔اور وہ جو دوسری کہانیاں تھیں بستی پر عذاب والی،وہ تو سونے کی کان تھیں کہ جب دیکھا خلق خدا کو اپنی من پسند لائن پر لگانے اور انہیں اپنے مطلوبہ مقاصد کے لیے ڈھالنے کے واسطے کچھ بھی کارگر نہیں ہو پارہا تو خدا کے عذاب کا موضوع اپنا کرشمہ دکھا کر رہتا ہے۔ایسے میں اپنے آنے والے دنوں کی لٹیا ابھی سے ڈوبتی دیکھ کر مُلا موجودہ ماحول میں نہ کرنے والا غصہ بھی کر بیٹھا کہ یہ کوئی وقت ہے اِن باتوں پر بحث مباحثے کا

ہے، یہ وقت تو اللہ اللہ کرنے اور ایک دوسرے سے ہمدردی اور دل جوئی کا ہے۔ بہت وقت پڑا ہے اِن باتوں کا کھوج لگانے اور ان پر سر کھپانے۔

اتنے میں شور ہوا کہ غوطہ خوروں کو پانی میں ڈوبی ہوئی پولیس چوکی سے داروغہ اور ایک سپاہی کی لاش ملی ہے۔ دونوں لاشیں چوکی کے دروازے کے اندر پھنسی ہوئی تھیں۔ دونوں پھولی ہوئی متعفن لاشیں باہر نکلیں تو لوگ خوف کے مارے پیچھے ہٹ گئے۔ مُلا بخشو بھی وہیں سہم کر رہ گیا۔ اُسے وہ آخری ملاقات والا داروغہ یاد آ رہا تھا جو اُس رات سیلاب نہ آنے کی تسلی دینے آیا تھا مگر خود اُسی سیلاب کی نذر ہو گیا۔ کانوں کو ہاتھ لگاتے لوگوں میں پھر سے کھسر پھسر شروع ہو چکی تھی کہ اگر انگریز سرکار اِس سیلاب میں ملوث ہوتی تو داروغہ کیوں بے خبری میں مارا جاتا۔ مُلا کو یوں لگا کہ داروغہ کی موت نے انگریز دربار میں اُس کے درجات کی متوقع بلندی کے سارے امکان ملیا میٹ کر دیے ہیں۔

یکا یک پھر غوغا ہوا کہ دو بچوں کی لاشیں ملی ہیں۔ لیکن پانی میں کافی دن رہنے کی وجہ سے بری طرح مسخ شدہ۔ اچانک مُلا بخشو کو خیال آیا کہ اُس کے خاندان کے بھی تو نو بچے لاپتہ ہیں۔ اُس نے آگے بڑھ کر دیکھا مگر اُس سے دیکھا نہ گیا۔ پانی کی کسی مخلوق نے اُن کے چہرے نوچ رکھے تھے۔ شناخت نہ ہو سکی تو انہیں ایک طرف رکھ دیا گیا۔ عجیب دل دہلا دینے والا منظر ہو گیا تھا وہاں جوں ہی کوئی لاش برآمد ہوتی تو منتظر اعزا اُس کی جانب لپکتے، شناخت ہو جانے پر آہ وزاری بہ صورت دیگر عدم شناخت کی قطار میں رکھ دیا جاتا۔ پانی سے نکلنے والی ہر لاش شدید تعفن کا منبع ثابت ہو رہی تھی لہٰذا شناخت کی صورت میں یہی کوشش کی جا رہی تھی کہ جلدی سے جلدی آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد تدفین کر دی جائے۔

وہاں موجود لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کے کپڑے ابھی تک میلے اور داڑھی اس طرح بے ترتیب بڑھی ہوئی تھی جیسے ہفتوں سے تراشی نہ گئی ہو۔ اُس نے بازوؤں میں ایک چھوٹا سا بچہ اُٹھا رکھا تھا مگر طبیعت میں اُتاول ضرورت سے زیادہ تھی۔ وہ بار بار ہر نکالی گئی لاش کی طرف لپکتا مگر ایک نظر ڈالنے کے بعد مایوس ہو کر سر کو جھکا لیتا۔ اپنی حرکات سے یوں لگتا تھا کہ جیسے

اُسے کسی کی تلاش رہی ہومگر وہ دکھائی نہ دے رہا ہو۔ مُلا بخشو کو وہ شخص شناسا سا لگا۔ ابھی وہ اُسے پہچاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اُس کی نگاہ مُلا کی نگاہ سے ٹکرائی اور وہ قصداً ہجوم میں کہیں آگے پیچھے ہو گیا۔ مُلا کو تو پہلے ہی تجسس تھا لہٰذا وہ بھی اُس کی تلاش میں ہجوم میں جا گھسا اور بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ وہ شخص مَنگر اور اُس کے بازوؤں میں موجود بچہ مُنّو یعنی امانت تھا۔

''سنگری کہاں ہے؟'' مُلا بخشو اچانک سامنے آنے والی صورتِ حال میں بوکھلا گیا تھا۔

مَنگر نے سیلابی پانی کی طرف اشارہ کر دیا جو چھ دنوں کے بعد بتدریج گھٹنا شروع ہو چکا تھا۔

''کیا بکواس کرتے ہو؟'' غصے کی انتہا کے سبب مُلا کی آنکھوں کے دیدے، ڈیلوں سے باہر نکل آئے تھے۔

''میں بکواس نہیں کرتا۔'' مَنگر کا لہجہ سرد ہونے کے ساتھ ساتھ لاتعلقی اور اُکتاہٹ لیے ہوئے تھا۔

''میں پوچھتا ہوں سنگری کدھر ہے اور یہ بچہ تمہارے پاس کیسے آیا؟.... سنگری تو اِسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے آپ سے جدا نہیں کرتی!'' .... بخشو ابھی تک اُسی طرح کھولاؤ کی حالت میں تھا۔

''سنگری مر چکی ہے۔''

''سنگری مر چکی ہے؟؟'' .... مُلا ڈِتن کی آواز اور لہجہ دونوں یک دم بیٹھ چکے تھے۔ ''مگر کیسے؟''

''چھل میں ڈوب کر اور کیسے؟'' مَنگر کا رویہ بدستور اُلجھا اُلجھا تھا۔

''مگر تم کہاں تھے؟ تمہیں کہاں ملی وہ؟''

''میں کہاں تھا؟'' .... مَنگر نے کھوئے کھوئے ہوئے لہجے میں اپنے آپ سے پوچھا۔ ''میں نجانے کہاں تھا کہ جب وہ مجھے مِلی۔'' مَنگر کے چہرے کے تاثرات بے جان

ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ''سنگری پر زنان خانے کا دروازہ گرا ہوا تھا کمر تک... بہت بڑا دروازہ... اور چھل کا پانی گوڈے گوڈے.. میں نے اُسے ملبے سے نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں نکال سکا.... وہ مجھے بار بار منتو کو بچانے کا کہہ رہی تھی جو کیچڑ میں لت پت ملبے کے ڈھیر پر پڑا تھا... پھر چھل یک دم گردن گردن ہوگئی اور میں صرف منتو کو بچا سکا۔'' منگر اِس طرح بولے جا رہا تھا کہ جیسے خواب میں کوئی خواب سنا رہا ہو۔ صاف لگ رہا تھا کہ اُس کے حواس سُو چکے ہیں مگر آنکھیں کھلی تھیں۔

مُلا بخشو دوڑا اور انتہائی آگے جا کر پانی سے لاشیں نکالنے والی کمیٹی کے ذمے داران کو چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ غوطہ خوروں کو چھوٹے زنان خانے والی جگہ سے لاشیں تلاش کرنے کی تاکید کی جائے۔ اگرچہ غوطہ خوروں کو ہدایت تو دے دی گئی مگر مُلا صاحب کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ بستی کے رہائشی علاقے میں مکانات زمیں بوس ہونے کے سبب پانی اُترنے تک لاشیں تلاش کرنا یا نکالنا ممکن نہیں۔ مُلا بخشو چکرا کر رہ گیا۔ اُس نے بیٹھنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کچھ دکھائی نہ دیا تو ساتھ کھڑے ہوئے آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سہارا لینے کی کوشش کی۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے وہ سارے منظر گھوم گئے کہ جن میں کہیں نہ کہیں سنگری کا کوئی وجود رہا تھا۔

طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا تو بخشو اُٹھا اور اپنے گھر والوں کے خیموں کی جانب چل دیا۔ واپس جاتے ہوئے اُسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے منتو واقعی اُس کے باپ کے نطفے سے ہوا ہو تو کیوں نہ اُسے منگر سے لے لیا جائے، وہاں تو وہ رُل جائے گا، ہوسکتا ہے کہ بڑا ہو کر کوئی بدمعاش بن جائے! کیا کہے گی دنیا کہ اتنے بڑے مولوی صاحب کا خون کیا سے کیا ہو گیا؟ لیکن اگر وہ چھ ماہیا مولوی صاحب کا نطفہ نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ چلتے چلتے مُلا کو چکر سا آ گیا۔ ''وہ اَنو اسی تو دنیا سے گئی لیکن کیسا امتحان چھوڑ گئی ہے ہمارے خاندان کے لیے۔''

ابھی وہ خیموں کے پاس پہنچا ہی تھا کہ مُلا بخشو کو احساس ہوا کہ کوئی اُس کے تعاقب میں ہے۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو منگر اُسی طرح بچے کو سینے سے لپٹائے اُس کے

پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ مُلا ڈِتن ٹھٹھک کر وہیں رُک گیا اور حیرت کے ساتھ ساتھ سوالیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ منگر مگر کچھ نہیں بولا بلکہ آہستگی سے چلتے ہوئے اُس کے قریب آیا اور امانت کو اپنے سینے سے علیحدہ کر کے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے مُلا بخشو کی طرف بڑھا دیا۔ اُس کی آنکھوں میں التجا تھی کہ اپنے خاندان کی امانت کو واپس قبول کر لیا جائے۔ مُلا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُسی انداز میں اپنے دونوں بازو آگے بڑھا دیے۔ امانت اُس کے ہاتھوں میں کیا آیا منگر کا چہرہ اُجڑ کر رہ گیا جب کہ بخشو غیر اِرادی طور پر مَنتو کے چھوٹے سے وجود میں اپنے باپ کے نقوش تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا جو اتنے دنوں کی میل سے اَٹا ہوا، عجیب سی بو پھیلائے جا رہا تھا۔

منگر سر جھکائے واپس جانے کے لیے مڑا تو مُلا بخشو بھی بچے کو لے کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ منگر ابھی چند قدم ہی چلا ہو گا کہ ایک دم ٹھہر گیا۔ اُس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ یہ نقاہت تھی یا منزل پر پہنچ پانے کے بعد کی کیفیت کہ اُس کے لیے قدم اُٹھانے دوبھر ہو رہے تھے۔ اتنے میں مُلا بخشو کی خواتین کے خیموں میں ایک شور سا بلند ہوا جس میں بہت سی عورتوں اور مردوں کے درمیان گفتگو کی بجائے تو تکرار کا ہذیانی انداز نمایاں تھا۔ منگر سمجھ گیا کہ اُس کے قدم کس نے اور کیوں روکے۔ وہ قریب پڑے ہوئے لکڑی کے مُنڈھ پر بیٹھ گیا کہ اب کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔

اتنے میں اُترے ہوئے چہرے اور گھبرائے ہوئے انداز میں مَنتو کو اُٹھائے مُلا بخشو خیمے سے باہر نکلا تو اُس کا پیچھا کرتی ہوئی آوازوں میں نسوانی چیخ و پکار کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی لعنت اور پھٹکار بھی شامل تھی۔ خیمے سے ننگے پاؤں باہر نکلنے کے کچھ لمحات کے بعد بخشو کے حواس بحال ہوئے تو پھر سے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ انداز یہی تھا کہ کون کون اُسے اِس حالت میں دیکھ رہا ہے اور کون نہیں دیکھ رہا۔ لیکن جوں ہی اُس کی نگاہ سڑک کے کنارے پڑی ہوئی مُنڈھی پر بیٹھے منگر پر پڑی اُس کی جان میں جان تو آ گئی مگر حیرت نہیں جا رہی تھی۔

''تم ابھی تک نہیں گئے؟''..... مُلا کا استعجاب اب پریشان کن نہیں بلکہ تشفی آمیز ہو چکا

تھا۔

''اُس نے روک لیا تھا۔''منگر کے چہرے پر بھی سکون بکھر چکا تھا۔

''کس نے روک لیا تھا؟''...مُلا نے پھر گھبرا کر اپنی اطراف میں دیکھا۔

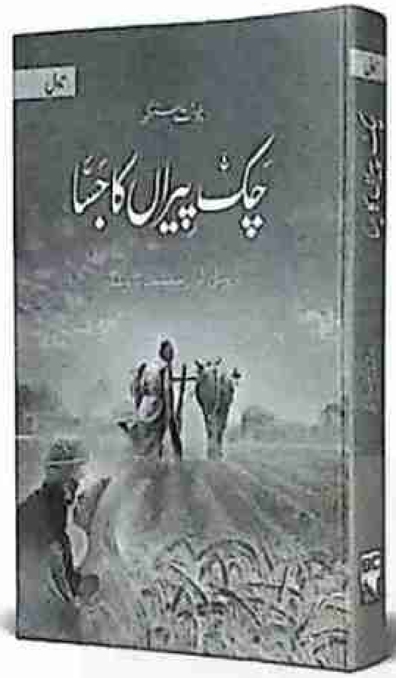
''اِس کی ماں نے۔''.... منگر نے منتو کی طرف اشارہ کیا۔مُلا نے پریشان ہو کر پہلے اِدھر اُدھر اور پھر اپنے ہاتھوں میں موجود منتو کی طرف دیکھا۔''مگر کیسے؟''

''یہ تم نہیں سمجھو گے۔ لاؤ مجھے دو!.....مان گیا یہ واقعی تمہارے خاندان کا خون نہیں ہے۔اگر تھا بھی.... تو اب نہیں رہا۔''... منگر نے امانت کو واپس لینے کے لیے اپنے دونوں بازو آگے بڑھا دیے۔

عسکری ٹاور وَن۔ڈیفنس فیز ٹو

اسلام آباد

21 مئی 2019ء بوقت مغرب




# चक पीराँ का जस्सा

# چکّ پیراں کا جسّا

## بلونت سنگھ

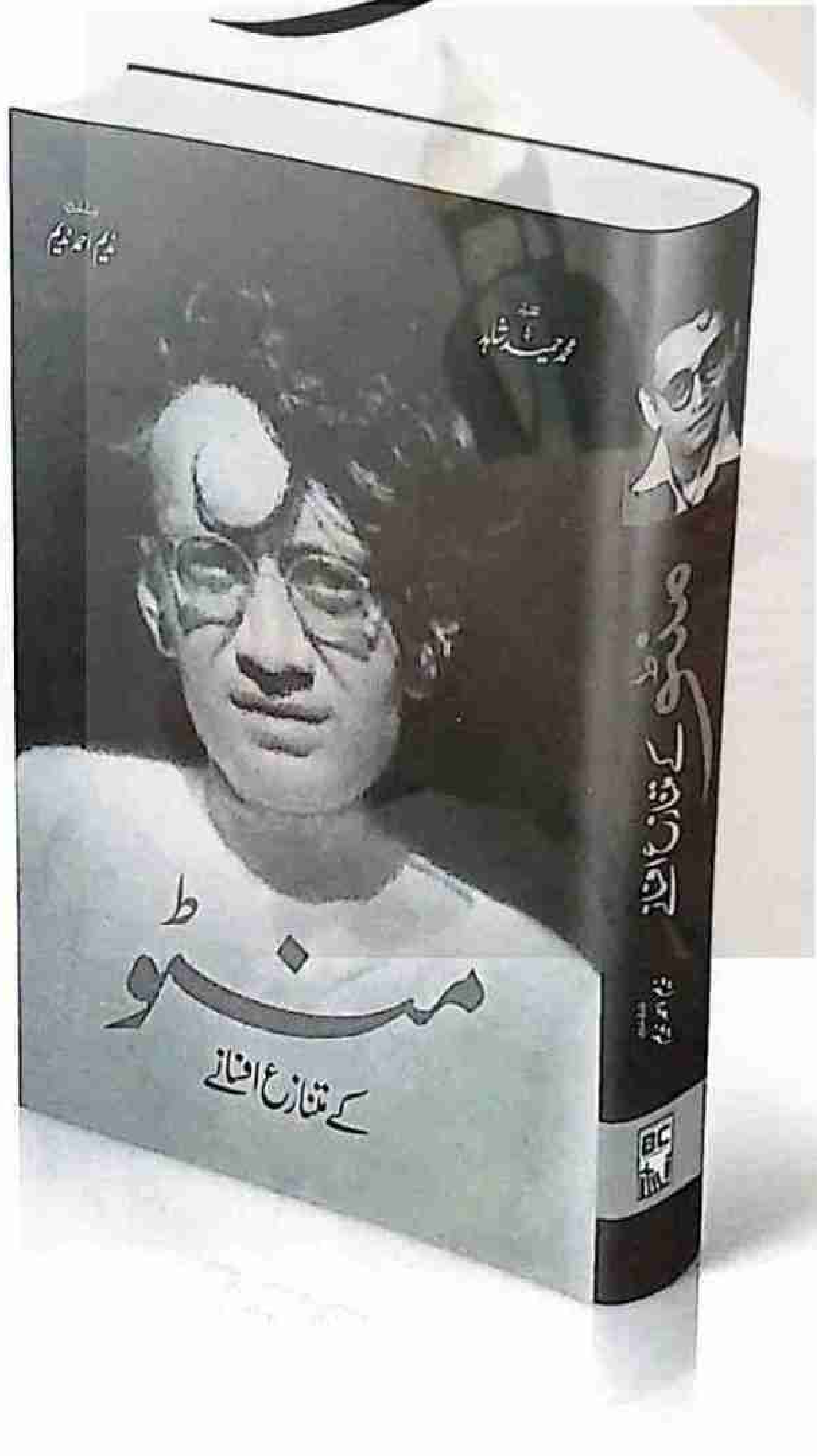
**چک پیراں کا جسّا** پنجاب دھرتی کی مٹی سے ابھرتا ہوا گبھرو ناول ہے۔ دیہات کے ماحول کی عکاسی رام لعل، غلام الثقلین نقوی اور ابوالفضل صدیقی کے ہاں بھرپور ملتی ہے اور متاخرین میں طاہرہ اقبال کو ہرگز نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بلونت سنگھ کا اندازِ نگارش اپنا ہے اور منفرد ہے۔ وہ پنجاب کی مٹی میں وہاں کے کلچر کو گوندھ کر چاک پر چڑھاتے ہیں۔ سکھ جاتی تہذیب، رسم ورواج، بول چال محاورہ، گالی، میلے ٹھیلوں کے ساتھ وہ سکھوں کے رہن سہن اندازِ زندگی روزمرہ کی بول چال کو خاص سکھ انداز میں پینٹ کرتے ہیں۔ بلونت سنگھ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ سکھوں کی معاشرتی زندگی، گھریلو جھگڑے اور محبتیں اپنے قلم سے امر کردیتے ہیں۔ آپ ناول کا مطالعہ کیجئے، اس کے کردار سینہ ٹھوک کر آپ سے زندہ انسان کی طرح اپنی زبان میں بات کریں گے۔ جملوں اور مکالموں میں بناوٹ کی بجائے اصل زبان اور لہجے کی کاٹ سے جو زبان رائج تھی بلونت سنگھ کے کردار اسی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ناول کا مطالعہ کرتے جایئے اور کرداروں کے ساتھ منظروں کا لطف لیجئے۔ یہ اس زمانے کا ناول ہے جب ابھی کہانی کو موت نہیں آئی تھی۔ طویل ناول ''چک پیراں کا جسّا'' اپنے اندر اتنی روانی اور کہانی کے بہاؤ سے لبریز ہے کہ مطالعہ شروع کرنے کے بعد قاری اس وقت اس سے الگ نہیں ہوتا جب تک وہ اسے مکمل پڑھ نہ لے۔ جیب سے رقم نکالنا ایک مشکل امر ہے ..... اور محنت کی کمائی سے ہوتا بھی یہی ہے لیکن آپ یہ شاہکار خرید لیجئے، میں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں آپ کی رقم اور مطالعہ دونوں رائیگاں نہیں جائیں گے۔

محمد حامد سراج

اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔۔۔۔ میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اُتاروں گا جو ہے ہی ننگی!! میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں، درزیوں کا ہے۔’’

منٹو

# منٹو کے متنازعہ افسانے




نایاب
تصاویر
کے ساتھ




محمد حامد سراج

# نقش گر

## پچیس منتخب افسانے

افسانے کی دنیا بہت عجیب و غریب ہے۔ یہ انسان کا پورا وجود مانگتی ہے۔ اگر اس کے خلوص میں کوئی کمی آ جائے تو [illegible] پیدا کرے اور تخلیق کار جو لکھنا چاہتا ہے وہ معاشرے کے خوف سے نہ لکھے تو تحریریں راستہ بھول جاتی ہیں۔ میں نے بے خوف ہو کر لکھا۔ جس کو پڑھتے ہوئے [illegible] معاشرہ [illegible]۔ خاندان میں [illegible] باتیں جنھیں پڑھ کر آپ کی [illegible] روشن ہوگا۔ تخلیق کار خوف کی چھتری کے پیچھے [illegible] کر لکھے تو تخلیق مر جاتی ہے۔ [illegible] اس سے نہ جھجکے، کراہت کا احساس نہ ہو۔ اس کی روشن مثال منٹو کا افسانہ "کھول دو" ہے۔ "نقش گر" اور "آخری دستک کی کہانی" اپنے انداز کے منفرد افسانے ہیں۔ [illegible] افسانے ہوتے ہیں [illegible] والا [illegible] جیسے سید محمد اشرف کا "نمبردار کا نیلا"۔ آپ [illegible] افسانوں کے ساتھ نشست [illegible] آپ کی روح کی [illegible]۔ تخلیق کار [illegible] کے پیچھے جانے والے [illegible] جاتے ہیں۔ مجھے میرے قاری نے کمال عزت دی ہے۔ [illegible] آپ کو ایک بڑا مختلف [illegible] شوروم" پر [illegible] کے ساتھ "[illegible] رنگ افسانے" کا [illegible] تکمیل کے مراحل میں تھی۔ [illegible] "نقش گر" کی نقش گری کا ہم نے فیصلہ کیا۔ [illegible] نائب نشتر کا ہے۔ [illegible] پرنٹنگ، بائنڈنگ، سرورق کے ساتھ موتی پروئے ہیں۔ آپ "نقش گر" پڑھیے، آپ کی [illegible] رائیگاں نہیں ہوگا۔

محمد حامد سراج

بک کارنر

شوروم: بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان



"مرد تو وہ کسی کام کا ہوتا ہے جو عورت کے ترلے نہ کرے، نیچے لگا کے رکھے مگر پیار سے۔ تھپڑ مارے مگر جوتا نہیں۔ خود بے شک مار مار کر نیلو نیل کر دے، چمڑی اُدھیڑ دے مگر کسی اور کو اُنگلی نہ کھڑی کرنے دے۔ بستی کا وڈکا بھلے سے نہ ہو مگر وڈکوں جیسا ہو، وہ گالیاں بھی دے تو کانوں میں ماکھی ٹپکے، ظلم کرے تو اُس پر پیار آئے۔ وہ قدم بھرے تو بھوئیں کو کانبا ہو۔ چاند نکلے تو وہ مُشکی سانپ کی طرح کالا لگے اور رات کالی ہو تو چاند بن جائے۔ پوہ میں ٹھنڈی لُوری چلے یا ہاڑ میں تتی لُو تو پورا پنڈا اُس کی تانگھ میں ہُوں ہُوں کرنے لگے۔ بدل گرجے تو وہ یاد آئے اور دریا چڑھے تو اُس کا سینہ سامنے ہو۔"

WWW.
BOOK
CORNER
.COM.PK
Pakistan's Biggest Bookstore

ANWASI - A NOVEL

ISBN: 978-969-662-221-5

Rs.900.00

BOOK CORNER
Jhelum (Pakistan)
bookcornerjhelum
bookcornershowroom
info@bookcorner.com.pk